بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ. لا الٰہ الا ھو. علیہ توکلت والیہ انیب

تجدید الاسلام

(مصنفہ)

دین محمد افغانی

قائم جمعیت تجدید الاسلام

۱۹۵۷ء مطابق ۱۳۷۶-۷۷ھ

قیمت ۱/۸/- بار اول ۱۰۰۰

(بلوچستان پریس، کوئٹہ)

فہرست مضامین

نورِ حق پھر ظلمتِ باطل پہ غالب آ گیا
پھر ہوئی قائم بنائے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدْ

درہم و برہم ہوئی پھر سلطنت شیطان کی
پھر ہوا جاری جہاں میں حکم اَللّٰهُ الصَّمَدْ

لَمْ یَلِدْ سے ہو گیا باطل یہودیت کا رنگ
اور لَمْ یُوْلَدْ سے نصرانی عقیدے پر لگد

لَمْ یَکُنْ سے مشرکوں پر آئیگا وقت تنگ
جسکے بارے میں خدا کہتا ہے حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدْ

کفر کی پھونکیں بجھا سکتی نہیں حق کا چراغ

شمع دیں روشن رہیگی عمر بھر بے رد و کد

ایک دن ہوتا ہے آخر پرچمِ حق سر بلند

فطرت اللہ التی سے ہے یہ دعویٰ مستند

بطنِ شب سے ہے ظہورِ آفتاب اے بوترابؔ[1]

ہے یہی قانونِ حق جاری ازل سے تا ابد

---

[1] بوتراب مصنف کی کنیت ہے۔ ۱۹۵۲ء میں ابوالبشیر محمود الحسن کوکب صاحب سے لیتا وہیں مصنف نے اپنے خیالات کو اشعار میں قلمبند کر لیا تھا۔

تعارف

یہ کتاب جو آپ کے سامنے پیش کی جا رہی ہے اس میں دراصل اسلام کو فطری اصولوں کے مطابق مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ اسی لئے اس کا نام تجدیدا لاسلام رکھ لیا گیا ہے تاکہ اسلام کو قرن اول کے ابتدائی دور سے مطالعہ کیا جا سکے۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کتاب میں مسلمانان عالم کے ان اختلاف فیہ مسائل (جن کے باعث وہ نسلی، لسانی، علاقائی اور مذہبی تعصبات میں پھنس کر گروہ بندی، فرقہ پرستی اور علیحدہ علیحدہ جماعت سازی میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے سے جدا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں) پر نہ صرف مبسوط مضامین لکھ کر ان کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بلکہ ان مسائل پر قرآن و سنت اور تاریخی شواہد کی روشنی میں زمانۂ حال کے تقاضوں کے مطابق ایک بہت بڑا اجتہاد بھی کیا گیا ہے۔

یعنی یہ کتاب دراصل تعارف ہے ایک ایسی بین الاقوامی تحریک کا جو کلی و ہمہ گیر طور پر اپنی فطری اصولوں کے مطابق اصلاحی انقلاب برپا کرنے اور مکمل طور پر تجدیدا سلام کرنے کے لئے کھڑی کی جا رہی ہے جس کا نصب العین "اتحاد و ترقی عالم" اور انسانیت کی فلاح و بہبود ہے اور جس کے اغراض و مقاصد یہ ہیں کہ عہد بنو امیہ سے لیکر آج تک مسلمان جن جن مقامات پر "قرآنی صراط المستقیم" سے پھسل کر جو

طور طریقوں پر گامزن ہوگئے ہیں وہ انہیں صاف صاف بتلا دئے جائیں اور پھر ان کے سامنے وہ لائحہ عمل بھی رکھ دیا جائے جس پر چل کر قرنِ اول (عہدِ رسالت مآبؐ) کے صحیح اسلام پر گامزن ہو سکیں ۔

اس کتاب کے ابتدائی حصے میں اُن ضروری مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ جو اس وقت قابلِ غور ہیں۔ اور جن پر یا تو بالکل عمل نہیں ہو رہا ہے اور یا اگر کبھی ایک مسئلے پر عمل ہو بھی رہا ہے تو جزوی طور پر۔ لہٰذا پھر انہی مسائل کو بعض اہم تقاضوں کی صورت میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ اور ان پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک باعمل صالح جماعت کی ضرورت کا احساس بھی دلایا گیا ہے۔

اس کے بعد ان موجودہ جماعتوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعویدار ہیں اور ان پر ایک مختصر سی تنقید کی گئی ہے۔ اس کے بعد "جمعیت تجدید الاسلام" کے نام سے تحریک کے اجراء سے متعلق بحث کی گئی ہے۔

(قائم افغانی)

حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيرُ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مقدمہ

أَعُوذُ بِكَ يَا مَلِكَ الْحَسِيبِ الْمَجِيدِ مِنَ الشَّيْطٰنِ
الْخَبِيثِ الْمَرِيدِ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ جَبَّارٍ وَفَاسِقٍ وَفَاجِرٍ
وَعَنِيدٍ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ جُنُودِ الشَّيَاطِيْنِ وَمِنْ شَرِّ
وَسَاوِسِ الشَّيْطٰنِ وَأَجِرْنِي مِنْهُ يَا رَحْمٰنُ حَتّٰى لَا يَكُونَ
لَهُ عَلَيَّ سُلْطَانٌ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقْتَ مِنَ
الْبِدْعِ وَالضَّلَالِ وَمِنْ شَرِّ نَفْسِي وَالْاَهْوِيَةِ
الْمُتَسَلِّطَةِ لِلزَّانِ ـ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ
نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝
صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ
الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ اٰمِيْن

وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَحْمَۃٍ لِّلْعٰلَمِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ اَجْمَعِیْنَ
وَعَلٰی جَمِیْعِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ، وَعَلٰی کُلِّ مَلٰئِکَتِہٖ
وَالْمُقَرَّبِیْنَ وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ وَاَھْلِ طَاعَتِہٖ
اَجْمَعِیْنَ

اَمَّا بَعْدُ :۔ یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ!
وَاشْھَدُوْا بِاَنِّیْ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ
لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ
لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ وَلَا رَسُوْلَ بَعْدَہٗ اَرْسَلَہٗ بِالْحَقِّ
شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ
وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝ وَاَرْسَلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ
لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا ۝ وَعَلٰی
ھٰذِہِ الشَّھَادَۃِ نَحْیٰی وَعَلَیْھَا نَمُوْتُ وَعَلَیْھَا نُبْعَثُ
اِنْ شَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی ۝ اَللّٰھُمَّ نَسْئَلُکَ غِطَاءَ قُلُوْبِنَا
وَاَعْیُنِنَا وَاٰذَانِنَا الْمَشُوْعِ الْحَقَّ حَقًّا ۝ وَلِیَرَی الْحَقَّ
حَقًّا ۝ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا
الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ اَللّٰھُمَّ
رَبَّنَا فَاجْعَلْنَا بِیَنْبُتُ وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا عَلٰی دِیْنِکَ
دِیْنِ الْاِسْلَامِ ۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ
وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ

رَضِيتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا وَّبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا
وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْ إِلَّا
بِاللّٰهِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ
وَأُفَوِّضُ أَمْرِيْ إِلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ -

وہ فریب خوردہ شاہین کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

خداوند کریم نے ہر انسانی روح میں کوئی نہ کوئی مقصد
چھپا رکھا ہے۔ اور ہر کسی کو اپنی زندگی میں ایک دو ایک
ایسا موقع دیتا ہے۔ جبکہ اُس کے دل میں ایک عظیم
بھلائی اور کارِ خیر کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اُسکے
دل میں یہ خواہش کروٹیں لیتی ہے کہ میں دنیا میں ایک
بہترین کام کر جاؤں۔ یہ بات تعجب کی ہے کہ وہ اپنے
آپ کو چند مجبوریوں کے باعث اس قابل نہ سمجھے کہ وہ
بھی ایک عظیم بھلائی کا کام کر سکیگا۔ لیکن میرا ایمان ہے
کہ اگر وہ اُس امنگ کو جو اُس کے دل میں کسی بھلائی کے کام
کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ مضبوطی سے پکڑے اور اسکی
طرف پیہم و نمایاں ذکر اُسے عملی جامہ پہنانے کی سعی کرے۔
تو یقیناً اُسکے سامنے ایک اعلیٰ ترین "مقصدِ حیات" افشا
ہوگا۔ اور وہ ضرور ایک عظیم بھلائی کا موجب بن سکیگا۔
"وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا" (القرآن)
(ارشادِ خداوندی ہے کہ جو لوگ مجھ میں کوشش کرتے ہیں

یعنی میری تلاش و جستجو کرتے ہیں میں ضرور اُن کے لئے اپنے راستے کھول دیتا ہوں)

میں سمجھتا ہوں کہ جب کسی کے دل میں بھلائی کے کسی کام کو کرنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے تو یہ اُس کے پروردگار کی طرف سے اُس پر خاص رحمت اور فضل ہے جس نے اس کی روح کو اتنی قابلیت بخشی کہ وہ نیکی کی طرف راغب ہوا۔ اور یہ داعیہ جو اس کے اندر سے اُسے کسی کارِ خیر کیلئے پکارتا ہے۔ اُس کے رب کی طرف سے اُس کے جذبۂ عمل کا امتحان ہے۔ گویا معبود اپنے عبد کو آزماتا ہے۔ آقا اپنے غلام کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ یا محبوب اپنے عاشق کو پرکھ رہا ہے۔ مگر اس داعیہ کے ذریعے اُس کی آزمائش کچھ ایسے غیر محسوس طریقے پر ہوتی ہے۔ اور اُس کی قربانی کا اندازہ کچھ ایسے عجیب طریقے پر کیا جاتا ہے۔ کہ اُسے خود بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ آیا یہ واقعی قدرت کی طرف سے میرا امتحان ہے۔ یا یہ میرے ضمیر کی پکار ہے۔ مگر اتنا اُسے ضرور اندازہ ہوتا ہے (یعنی اُس کے دل میں القا کر دیا جاتا ہے) کہ اگر تو اس کارِ خیر کو کر جائے تو شاید تیرا اللہ تجھ سے راضی ہو جائے۔ اور اس کا قرب تجھے نصیب ہو۔ اور اگر وہ اس کارِ خیر میں "رضائے الٰہی" کو اپنا نصب العین (مقصدِ حیات) بنا لے

تو پھر قدرت دیکھتی ہے۔ کہ ایک عبد اپنے معبود کی رضا کی خاطر کس قدر قربانی دینے کو تیار ہے۔ پس یہی وہ امتحان اور ابتلا ہے جس کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسی جلیل القدر ہستی سے بھی اپنے والدین خویش و اقارب ملک و وطن اور بیوی بچے بلکہ جان تک کی قربانی طلب کی گئی تھی۔

در اصل فطرت کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ کسی مقصد کے حصول کے لئے صرف زبانی جمع خرچ پر انسان کو نہیں رہنے دیتی بلکہ وہ یہ دیکھا کرتی ہے۔ کہ خود انسان اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کس قدر سعی کرتا ہے۔ قرآن نے "لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" (انسان کے لئے اپنی کوشش کے سوا کچھ نہیں) فرما کر سب کچھ کو انسان کی اپنی سعی و کوشش پر ہی ڈال دیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے آہنی عزم اور صبر و استقلال کے ساتھ جد و جہد جاری رکھیگا۔ اور یکسوئی کے ساتھ اُس کے حصول کے لئے متفکر رہے گا تو وہ ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکیگا۔ "مَنْ جَدَّ وَجَدَ" (جو اپنے مقصد کے لئے جد و جہد کریگا تحقیق وہ اُسے پا کر رہیگا) لیکن اگر وہ اپنے مقصد کی تحصیل میں غفلت برتیگا، یا اپنے آپ کو اس مقصد کے حصول کے لئے نا قابل سمجھکر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھیگا۔ اور پھر یہ توقع رکھیگا، کہ میرا مقصد کبھی نہ کبھی مجھے ازخود مل جائے گا۔ تو میرے نزدیک

وہ بڑی غلطی میں پڑا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ جب اپنے مقصد کے سامنے رکاوٹیں اور مشکلات دیکھتے ہیں۔ تو احساسِ کمتری کے باعث اپنے آپ کو کمزور اور بے بس سمجھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ مگر سعی و عمل کی طرف کبھی توجہ نہیں دیتے۔

بسا اوقات تو یوں بھی ہوتا ہے۔ کہ بعض لوگ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کچھ ہاتھ پیر بھی مار لیتے ہیں۔ لیکن جب انہیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تو وہ جی توڑ جاتے ہیں اور پھر یاس و ناامیدی میں مبتلا ہو کر کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ پھر بعض ناعاقبت اندیش لوگ تو دوسروں کو اپنی زہرافشانی کا نشانہ بناتے ہیں۔ بڑوں تک کو گالیاں دیتے ہیں۔ اور بعض قومی۔ صوبائی اور لسانی تعصبات میں مبتلا ہو کر دین اور روحانیات سے بیزار ہو جاتے ہیں اور ایک ایسی زندگی اختیار کر لیتے ہیں جو انہیں "اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ" کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ کئی لوگ غم غلط کرنے کے لئے نشئی اشیاء کا استعمال شروع کر دیتے ہیں اور بعض لوگ گانا سننے اور سینما دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں گو شروع شروع میں کچھ پہلے تو وہ وقت گذارنے کی خاطر شروع کر دیتے ہیں لیکن بعد میں جب ان کی عادت پختہ ہو جاتی ہے۔ تو یہ چیزیں نہ صرف ان کی صحت کو کمزور کر دیتی ہیں۔ بلکہ ان کی مالی حالت میں بھی بگاڑ پیدا کرتی

آجاتی ہے اور پھر وہ جائز و ناجائز طریقوں سے روپے پیسے جوڑنے اور خواہ مخواہ کی بری حرکتوں میں پھنس جاتے ہیں جو انہیں ذلالت کی زندگی تک پہنچا دیتے ہیں۔

اور بعض لوگ تو بالکل ہی دنیا کے کاموں سے جی چھوڑ جاتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے بے کار ترین لوگوں میں شمار ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ صرف زمین پر ہی بوجھ ہوتے ہیں بلکہ قوم، ملک اور خاندان پر بھی بوجھ ہو جاتے ہیں۔ پھر بعضوں کی نوبت تو بیکاری پن تک پہنچ جاتی ہے اور بعضوں کا دماغ ہی جواب دے جاتا ہے۔

اور اسی طرح دنیا میں ایسے بھی بہت سے انسان موجود ہیں جنکے دماغوں میں بہت اعلیٰ قسم کے خیالات چکر کاٹتے ہیں، وہ اپنے ذہنوں میں بلند ترین مقاصد چھپائے رکھتے ہیں۔ لیکن اگر انہوں نے ان مقاصد کے حصول کے لئے کوئی جد و جہد نہیں کی۔ تو اس کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہمیں دنیا کے دھندوں سے نجات مل جائے۔ یا یہ کہ پیٹ کا مسئلہ بیچ میں حائل نہ ہو، یہ بیوی بچے نہ ہوں، اس ملازمت کے چلے جانے کا خطرہ نہ ہو۔ افلاس کا ڈر نہ ہو۔ ہماری [illegible] حکومت کا ڈر نہ ہو۔ یا یہ پیسے کی کمی نہ ہو تو ہم ضرور اپنے مقصدِ حیات کے حصول میں [illegible] کامیاب ہو جائیں۔ لیکن

حقیقت یہ ہے اور اس میں ذرہ برابر بھی مبالغہ نہیں۔ کہ کام کرنے والوں نے دنیا کے بڑے بڑے کام تکالیف ومصائب اور رنج والم کے ہجوم میں گھبرا کر کئے ہیں۔ جن جوانمردوں اور دانشوروں نے قوموں کی ناؤ پار لگائی ہے۔ اور قوموں کو ترقی کے بامِ عروج تک پہنچایا ہے۔ وہ اکثر فراغت والے طبقے میں سے نہیں تھے۔ بلکہ اُن لوگوں میں سے تھے جو ضروریاتِ زندگی کے حصول کے لیئے دھکے کھاتے اور سخت جدوجہد کرتے رہے ہیں۔

اگر ہم انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگیوں پر غور کریں (اور یہی وہ اعلےٰ ترین ہستیاں ہیں جن کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کا قرآن ہمیں حکم دیتا ہے "لَقَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ" تحقیق تمہارے لیئے ابراھیم ؑ اور جو لوگ اُن کے ساتھ تھے کا اُسوہ حسنہ ہے "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" تحقیق تمہارے لیئے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اُسوہ حسنہ ہے۔ یعنی اُن کی زندگیوں میں تمہارے لیئے بڑے بڑے اسباق موجود ہیں) تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان حضرات نے کبھی قوم سے کسی اجرت، تنخواہ یا معاوضے کا مطالبہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ تو فرمایا کرتے تھے کہ "إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ" نہیں ہے ہمارا اجر کسی کے ذمے سوائے اللہ تعالےٰ کے

یعنی ہم کسی سے کوئی اُجرت نہیں مانگتے) اور یہ بات بھی نہ تھی کہ وہ اتنے مالدار تھے کہ اُجرت یا تنخواہ سے مستغنی تھے۔ قرآن گواہ ہے کہ وہ حضرات دنیاوی کام کاج بھی کرتے تھے۔ بازاروں میں خرید و فروخت کرتے تھے۔ جیسے کہ ارشاد ہے قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِىْ فِى الْاَسْوَاقِ ۵ پ ۱۸ ع ۱۷ (ترجمہ یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے کہ وہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے) بلکہ قرآن تمام پیغمبروں کے متعلق فرماتا ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِى الْاَسْوَاقِ ط پ ۱۸ ع ۱۷۔ ترجمہ:- اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی پیغمبر بھیجے ہیں سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے۔ یعنی وہ دنیوی کاروبار بھی کرتے تھے۔ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ خود پالتے تھے اور ساتھ ساتھ اُن کو قوم کی اصلاح کا فکر بھی لگا رہتا تھا۔

غرض کہ دنیا کی تمام قابل ترین ہستیوں کی زندگیوں پر اگر ہم غور کریں تو شاذ و نادر ہی ہمیں کوئی ایسی ہستی ملے گی جس نے تکلیفوں اور مصیبتوں کے بغیر ہی قوم کی کوئی خدمت کی ہو۔ لیکن اس کے برعکس اس کی مثال آپ کو عام ملے گی کہ جو لوگ فرصت اور فراغت کے متمنی ہیں اور جن کا اپنے متعلق یہ خیال ہے کہ اگر انہیں فرصت مل جائے تو وہ کارہائے نمایاں کریں گے۔ جب انہیں فرصت ملتی ہے۔ تو وہ کچھ کرتے کراتے نہیں۔

مقصد یہ ہے کہ انسان تب ہی اپنے مقصدِ حیات میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور تب ہی وہ کوئی کارِ نمایاں انجام دے سکتا ہے۔ جب اُس کے دل میں کوئی ٹھوس نصب العین جگہ کر لے اور اُس کے دماغ میں قوم کی اصلاح اور بھلائی کے لئے کسی کارِ خیر کا تصوّر آجائے اور وہ اُسی وقت سے جس حال میں بھی ہو۔ اپنی استطاعت کے مطابق اُس کے لئے جدوجہد شروع کر دے۔ تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ اکثر نہایت ہی حسین و لطیف کمالات ایسے مردوں اور عورتوں نے حاصل کئے ہیں جو مصائب و مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ اور جنہیں روزمرہ کی دکھ بھری زندگی میں اطمینان و سکون کا سانس لینے کی مہلت نہیں ملی اور بعض بہترین و عظیم ترین کتابیں شدید ترین افلاس اور مصیبت کے ایام میں لکھی گئی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ مقصدِ حیات ایک ابدی شے ہے جو حالات کی وجہ سے فنا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اُس کی پیاس بجھ سکتی ہے۔ چاہے انسان پہ کیسے ہی حالات کیوں نہ آجائیں۔ البتہ! اگر انسان اُسکے حصول میں مستقل مزاجی کو چھوڑ دے۔ تو معمولی سی بات بھی اُس کیلئے بہانہ بن جاتی ہے اور پھر وہ نہ صرف اپنے مقصدِ حیات کو کھو جاتا ہے بلکہ روحانی قابلیت کے امتحان میں ناکام ہو کر اپنے آپ کو اسفل میں گرا دیتا ہے۔

در اصل انہی امتحانات میں ثابت قدم رہنے اور مستقل مزاجی

سے اپنے نصب العین کی طرف بڑھنے کا سبق انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہمیں دے گئے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے ملک و ملت اور خویش و اقارب سے علیحدہ کئے گئے طرح طرح کی تکلیفیں اور ایذائیں پہونچائی گئیں۔ مگر وہ اپنے نصب العین سے ہرگز نہ ہٹے۔ خود رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب قریش نے طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں اور حد درجہ تنگ کیا تو آنجناب علیہ الصلوٰۃ والسلام "فداہ ابی و امی۔ ونفسی و اہلی و مالی"! نے فرمایا کہ: "اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج رکھ دیا جائے اور دوسرے پر چاند، تب بھی میں حق بات سے نہ ہٹونگا اور اپنے مقصد حیات کو نہ چھوڑوں گا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالے نے ان حضرات علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت اور ان کا اسوۂ حسنہ مسلمانوں پر فرض کر دیا ہے۔ اور اس ابراہیمی اور محمدی سنت کو جگر گوشۂ رسول علیہ السلام نے میدان کربلا میں زندہ و پائندہ کر دکھایا۔ آپؑ اپنے آخری خطبے میں یزیدی فوج کو یوں مخاطب کرتے ہیں: "یزید کی بیعت ناممکن ہے۔ میں نے مسلمانوں کے لئے صبر و استقلال۔ استقامت و ایثار اور خود داری کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اور میں تمہیں اعلانیہ کہنا ہوں کہ تمہاری توقعات پوری نہ ہو سکیں گی۔ اور دنیا بہت جلد تمہیں اپنا کرشمہ دکھلا دیگی۔ خدا اُن کے لئے مجھے زندہ نہ رکھے

کہ میں چند روزہ زندگی کی خاطر ایک فاسق و فاجر کی بیعت کر لوں، اور بنو فاطمہ کے دامن پر سیاہ داغ لگا دوں۔ خداوند قدوس کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے ایک باضمیر انسان بنایا۔ مجھے خطرہ تھا۔ کہ میرا ضمیر کہیں میرے معصوم بچوں کی محبت اور پدری شفقت کی بنا پر دھوکہ نہ دے دے۔ لیکن یہ اُس پاک ماں کے پاک دودھ کا اثر تھا۔ کہ جھوٹی توقعات اور فانی ضروریات حقیقت کے سامنے مغلوب ہو گئے۔ اور اب میں خداوند تعالے کے حضور میں سُرخروئی کے ساتھ جا رہا ہوں (از حسینؑ ابن علیؓ)

غرض یہ ہے کہ اگر انسان روزمرہ کی زندگی کے جھمیلوں میں رہ کر اُس اضطراری حالت کو جو اُس کے دل و دماغ میں تفکرات، تصورات، احساسات، اور جذبات کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ عملی صورت دینے کی سعی کرے اور پھر اپنے اس مقصد کے لیئے سردھڑ کی بازی لگا دے۔ تو اس کا نصب العین قوم کا نصب العین بن سکتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ایسی پرزور طاقت کا روپ اختیار کر لے۔ جو ایک مرتبہ تمام دنیا کو ہلا دے اور تمام دنیا اُس کے اس کارنامہ پر انگشت بدندان رہ جائے۔ بس انہی امیدوں کو لیکر خدائے رحمان و رحیم کے نام سے میں میدانِ عمل میں قدم رکھ رہا ہوں۔

دراصل میرے حالات بھی بعض وجوہات کی بنا پر اُن افراد

سے مماثلت رکھتے ہیں جو مصائب و مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ اور جنہیں روزمرہ کی مصروفیتوں سے سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔ بلکہ میں تو روزمرہ کی زندگی کے جھمیلوں کے علاوہ ایک ایسا گمنام اور بے مایہ شخص ہوں جو نہ صرف ادبی دنیا میں طفل مکتب کے برابر ہوں۔ بلکہ کسی یونیورسٹی۔ کالج یا مدرسہ کا سند یافتہ بھی نہیں ہوں لا البتہ کچھ اردو۔ فارسی، اور عربی کا شوق رکھنے کے باعث بعض قابل قدر کتب کا مطالعہ ضرور رکھتا ہوں)۔ لیکن میرے دل میں بچپن ہی سے دین اسلام کو تمام دنیا کے ادیان پر غالب کرنے کا ایک ایسا جذبہ کارفرما ہے کہ جس نے نہ صرف میری ساری زندگی کو دینی جذبات و احساسات سے بھر دیا ہے۔ بلکہ میرے سینے میں ایسا ٹھاٹھیں مارتا ہوا بحر بے کراں موجزن کر دیا ہے۔ جسکے آغوش میں کئی سیلاب اور طوفان چھپے ہوئے ہیں۔ اور جو قرن اول کے اسلام کی احیاء کے لیے کئی انقلابات کو برپا کرنے والا ہے اور جسکی کئی وجوہات ہیں۔

نسلی لسانی اور مذہبی تعصبات کی بنا پر مسلمانوں کا ایک دوسرے سے جدا ہو جانا

:۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ میں نے بڑی مدت سے مسلمانوں کی اس حالتِ زار کو بچشم تر مطالعہ کیا۔ اور میں نے دیکھا۔ کہ مسلمان نہ صرف خدا، رسولؐ، اور قرآن ہی سے دین بدل

بیگانہ ہوتا جا رہا ہے۔ بلکہ دنیا میں بھی اس کی کوئی قدر و منزلت باقی نہیں رہی۔ ایک وقت وہ تھا۔ جب مسلمان روئے زمین کی بادشاہت کا مالک تھا چین سے لیکر سپین تک اور سائبیریا کے میدانوں سے لیکر جنوبی افریقہ کے صحراؤں تک اسلامی پرچم لہرا رہا تھا۔ اتفاق و اتحاد کا وہ عالم تھا۔ کہ اگر مشرق کے مسلمان کی پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا تو مغرب کے مسلمان کے دل سے اُسکی آہ نکلتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلام نے نہ صرف عرب قوموں کے قومی اور نسلی تعصبات کی بنا پر کئی سالوں کی خانہ جنگی کو صلح و آشتی اور اخوت و مساوات سے بدل دیا تھا۔ بلکہ اُن تمام قوموں فرقوں اور قبیلوں کو جو تین سو ساٹھ بتوں کو پوجنے والی تھیں ایک صف میں کھڑا کر کے ایک خدا کے آگے سرنگوں کر دیا تھا۔ اور بقول شاعر ملت ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

خود قرآن کا ارشاد ہے:۔ " وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا۔ الخ " (پ ۴ آلعمران ع ۱۰)

ترجمہ:۔ اور اللہ تعالےٰ کی اُس نعمت کو یاد کرو۔ جبکہ تم (قومی

عصبیت اور نسلی تفوق و برتری کے احساس کے باعث) آپس میں دشمن تھے پس ہم نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی جس سے تم خدا کے فضل اور اُس کی نعمت (یعنی اسلام) کے باعث بھائی بھائی بن گئے اور تم لوگ (آپس کی خانہ جنگی اور تعصب کی) دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے سو اُس (خانہ جنگی کی تباہی کے گڑھے) سے اللہ تعالے نے تمہاری جان بچائی لیکن آج مسلمان نہ صرف نسلی، لسانی اور علاقائی جھگڑوں میں مبتلا ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ بلکہ مذہبی عقائد کی بنا پر تفرقہ بندی اور مذہبی تعصبات کے باعث ایک دوسرے سے برسرپیکار ہونا تو ایک خطرۂ عظیم بنتا جا رہا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں دشمنوں نے بعض پیشہ ور ایجنٹوں کو مسلمانوں کے درمیان اختلاف و افتراق ڈلوانے کی خاطر نہ بھیجا ہو؟ آخر یہ چند سالوں سے ہمارے مختلف گروہوں کے اندر یہ علامہ، مفتی، آغا، حافظ، قاضی اور مولانا صاحبان اتنے زیادہ کہاں سے پیدا ہو گئے ہیں۔ آخر یہ صاحبان مختلف العقائد گروہوں کی سٹیجوں پر سے ایک دوسرے کے خلاف زہر افشانی کیوں فرما رہے ہیں؟ مسلمانوں کو آپس میں کیوں لڑایا جا رہا ہے اُن میں اندرونی طور پر نفاق پھیلانے کی مہم کہاں سے چلائی جا رہی ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ اِن صاحبان میں دشمنوں کے ایجنٹ بھی موجود ہوں؟ اور وہ اسی غرض کو لیکر آئے ہوں کہ مسلمانوں کو

آپس میں لڑا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے اور ان کو کسی ایک سیاسی یا مذہبی مسئلہ پر متفق نہ ہونے دیا جائے "تاکہ ان کے تمام قومی اور ملکی فلاح و بہبود کے کام التوا میں ہی پڑے رہیں۔ اور کیا ان مذہبی اور سیاسی رہنماؤں میں ایسے لوگ نہیں ہیں جنکو ہمارے دشمن خرید کر ہمارے خلاف استعمال کر لیں ؟ کیا ان سیاسی اور مذہبی جھگڑوں کا وجود کسی وقت بھی ہماری تباہی کا موجب نہیں بن سکتا ؟ کیا مسلمان ان فرقہ بند جماعتوں اور گروہوں کی موجودگی میں کبھی بھی چین کی زندگی بسر کر سکتے ہیں ؟ ہماری فوج میں سپاہی سے لیکر بڑے بڑے آفیسروں تک مختلف الخیال۔ مختلف العقائد اور مختلف المذاہب فرقوں کے افراد موجود نہیں ؟ اگر ہیں تو کیا ہمارا دشمن اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ان کے اندر خفیہ طور پر نفاق پھیلانے کی مہم نہیں چلا سکتا ؟ اور اگر یہ سب باتیں درست ہیں اور اس میں ذرا برابر مبالغہ بھی نہیں۔ تو پھر بتلایا جائے کہ کیا دنیائے اسلام میں کسی جماعت یا حکومت کے پاس مسلمانوں کے درمیان۔ عقائد کی بنا پر پیدا شدہ افراط و تفریط کو ختم کرنے اور قرن اول کے اسلام کا از سر نو اعادہ کرنے کا کوئی لائحہ عمل ہے؟ کیا کسی جماعت نے اس کے لئے کوئی عملی جدوجہد بھی کی ہے؟ اگر نہیں تو کیوں ؟

دوسری وجہ
دعوت و تبلیغ اسلام کا مفقود ہو جانا:-
جو میری پریشانی

کا باعث بنی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ دین اسلام جو تمام ادیان پر غالب ہونے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اور جس کو مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پہنچانے کی ذمہ داری تمام اُمت پر ڈالی گئی تھی یعنی "اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ" کا وہ چشمۂ فیض جو فاران کی وادیوں سے نکلا تھا اور جس نے آن کی آن میں سیلاب کی صورت اختیار کر کے تمام روئے زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اب وہ تو یہ بڑا ہی تعجب کا مقام ہے کہ آج آپ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جائیے، مگر جہاں آپ پہونچیں گے۔ وہاں آپ عیسائیت کا ایک نہ ایک مشن ضرور دیکھیں گے۔ جو عیسائی مذہب کی دعوت و تبلیغ کا کام انجام دے رہا ہوگا۔ چاہے وہ کسی رنگ میں ہی کیوں نہ ہو۔

خود ہندوستان و پاکستان میں آپ بیرشن ہسپتال، مشن سکول، کنونیٹ سکول۔ گریمر سکول۔ ایڈورڈ کالج وغیرہ وغیرہ تو دیکھتے ہی ہیں۔ ان سکولوں، کالجوں اور ہسپتالوں کی غرض و غایت صرف یہی ہے کہ خدمت خلق۔ حُسنِ سلوک اور ملازمت دلانے کے خاطر طریقوں سے لوگوں کو اپنے مذہب میں شامل کر لیا جائے اور صرف یہ نہیں بلکہ علی الاعلان بھی دعوت و تبلیغ میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ عیسائی مذہب کا

صرف ایک فرقہ " واچ ٹاور مشن " کا ایک اردو رسالہ بعنوان " مینا رد یاد بانی " میری نظر سے گزرا ، اس کے مطالعہ سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ رسالہ جو ۳۲ صفحات پر مشتمل تھا چالیس زبانوں میں چھپتا ہے اور اسی طرح اس رسالے کے ساتھ اور لٹریچر بھی انہی زبانوں میں چھپ رہا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس تمام لٹریچر کے ساتھ انہی زبانوں میں تربیت یافتہ افراد پر مشتمل وفود بھی بھیجے جاتے ہیں جو مختلف اقوام میں اُن کی زبانوں میں دعوت و تبلیغ کا کام انجام دیا کرتے ہیں ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمان جماعتیں عیسائی مشن کے مقابلہ میں عشر عشیر کے برابر بھی دعوت و تبلیغ اسلام کا کام انجام دے رہی ہیں ؟ نہیں ! بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ کارل مارکس اور لینن کے وہ چند اصول جو انہوں نے اشتراکیت کے نام سے نہ صرف سرمایہ داری کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہوئے پیش کئے تھے ۔ بلکہ مذہب کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ترک کر دینے کا اعلان کر دیا تھا ۔ آج دنیا کے کونے کونے میں پھیل رہے ہیں ۔ کمیونزم کا ہر رکن آج اپنے ازم کو پھیلانے میں سر دھڑ کی بازی لگائے بیٹھا ہے اور تو اور ہندو بھی آج شدھی تحریک چلانے میں تن من دھن کی بازی لگا رہا ہے ۔

لیکن مسلمان اپنے بیوی بچوں ۔ کاروبار اور مکانات کیلئے تو پریشان رہتا ہے ۔ ان کے لئے جدوجہد کرتا ہے ۔ تا جاگزراں ممکنوں

اور چھوٹے مقدمہ بازیوں کے لئے تو دن رات متفکر رہتا ہے اگر اُسکا بچہ بیمار ہو جائے۔ یا اُس کی بیوی کو کوئی تکلیف ہو۔ یا اُسے کوئی اور دنیاوی غرض در پیش ہو تو اُسے۔ دفتر۔ دکان۔ کاروبار کہیں بھی چین نصیب نہ ہوگا۔ دفتر میں کام تو کرتا ہوگا۔ لیکن اُس کا دل بچے کی بیماری میں ہوگا۔ دکان پہ بیٹھا ہوگا۔ لیکن اُسکے ذہن میں بیوی کی تکلیف کا خیال چکر کاٹ رہا ہوگا۔ ڈاکٹروں کے پاس دوڑیگا طبیبوں سے مشورے کریگا روپیہ پیسہ خرچ کریگا۔ ملنگوں پیروں اور فقیروں کی درگاہوں پہ دعائیں کرائیگا۔ غرض جو کچھ اُس سے ہو سکے وہ کریگا۔ مگر بیوی بچوں کی تکلیف برداشت نہ کرسکیگا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو بیوی بچوں کا ذمہ دار سمجھتا ہے اور ہر ذمہ دار شخص کو ایسا کرنا بھی چاہیئے۔ اسیطرح اگر اُسکا کسی مکان۔ دکان۔ یا کسی اور غرض سے مقدمہ عدالت میں پیش ہے تو وہ اُس کے لئے صبح و شام متفکر رہے گا۔ وکیلوں کے پاس دوڑیگا۔ قابل لوگوں سے مشورے کریگا کیوں۔؟ اس لئے کہ وہ اُس مکان۔ دکان۔ زر۔ زراع۔ اور زمین کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور اپنی ملکیت کو [illegible] کرنے کے لئے کسی کا جدوجہد کرنا ایک فطری تقاضا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج کا مسلمان دین کے لئے بھی اتنا متفکر ہے تو کیا اس کا سمودا اس متفکر ہونا اُسے ہے؟۔ اور کیا

کمیونسٹوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کو ان تمام ضروریاتِ انسانی سے واسطہ نہیں پڑتا؟ پھر کیا وجہ ہے کہ کمیونسٹ تو ان تمام تقاضوں کے باوجود کمیونزم پھیلانے میں دن رات مصروف ہیں۔ نصرانی اپنی عیسائیت کی مشن کو ان تمام فطری تقاضوں کے ساتھ ساتھ فروغ دے رہے ہیں، ہندو بھی ان تمام ضروریات کو پورا کرتے ہوئے شدھی تحریک چلا رہے ہیں۔ مگر مسلمان ہے کہ اللہ کا دین اُس کی آنکھوں کے سامنے مٹتا جا رہا ہے اور اُسے احساس تک نہیں۔ لکھوکھا مسلمان دین سے بے دین بنائے جا رہے ہیں لیکن اُس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ آخر یہ کیوں؟ کیا مسلمان سمجھتا ہے۔ کہ اُس کے دین کا ٹھیکیدار صرف ملا ہی ہے۔ کیا "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" کا فرمانِ خداوندی اُس سے متعلق نہیں؟ اگر ہندو شدھی تحریک، کمیونسٹ کمیونزم، اور نصرانی عیسائی مشن کو پھیلانے میں بہتر سے بہتر طریقے استعمال کر سکتے ہیں تو کیا مسلمانوں کے سامنے "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ" (لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ کی طرف پُرحکمت طریقوں اور مواعظ حسنہ سے بلاؤ) کی حکم کے بموجب احسن سے احسن طریقے اور ذرائع استعمال کرنے کا تقاضا نہیں؟ کیا آج کا مسلمان "اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" کی آیت کے تحت تمام

روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کی اصلاح کا ذمہ دار نہیں ؟ اگر ہے تو کیا آج کا مسلمان امریکہ۔ روس۔ چین۔ جاپان۔ تمام یورپ اور دوسری غیر اسلامی دنیا کے ادیان پر دین اسلام کا اظہار کر رہا ہے ؟ کیا ممالک اسلامیہ میں اس اہم فریضہ کو ادا کرنے کے لئے اجتماعی طور پر کوئی ٹھوس عملی کام ہو رہا ہے ؟ کیا غیر اسلامی ممالک میں مسلمانوں کی ایسی جماعتیں موجود ہیں۔ جو دعوت و تبلیغ اسلام کے لئے ہر ممکن ذرائع استعمال کر رہی ہوں ؟ میں مانتا ہوں کہ کسی اسلامی جماعت نے کچھ لٹریچر مختلف زبانوں میں ترجمہ کرا کر غیر اسلامی دنیا میں بھیجا ہوگا۔ یا اس قسم کی کوئی اور کوشش کی ہوگی۔ لیکن کیا غیر اسلامی ممالک میں مسلمانوں کی جماعتیں عملی طور پر بھی کوئی کام کر رہی ہیں ؟ کیا کسی اسلامی مملکت میں خود حکومت یا کسی جماعت کی طرف سے کوئی ایسی تربیت گاہ بنائی گئی ہے کہ جس میں طالبعلموں کو مختلف زبانوں میں دعوت و تبلیغ اسلام کا کام سکھلایا جا رہا ہو۔ تاکہ وہ امریکہ۔ روس۔ چین۔ جاپان اور دیگر غیر اسلامی ممالک میں جا کر اُن کی زبانوں میں۔ انہیں دین اسلام کی دعوت دیں ؟ کیا کسی اسلامی مملکت میں کوئی ایسی تربیت گاہ ہے جو مبلغین اسلام کو ظاہری اور باطنی علوم سے آراستہ کر کے پھر انہیں غیر اسلامی ممالک کی زبانوں اور ادیان سے پوری طرح واقفیت دلا کر کسی غیر اسلامی مملکت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سکونت اختیار کرنے کی غرض سے اسلئے بھیج رہی ہو۔ تاکہ وہ غیر اسلامی دنیا میں اسلام کا عملی نمونہ اپنے

کردار و اعمال سے پیش کر دیں اور اسطرح اُن پیرانِ عظام کی طرح تارکِ وطن بنکر دعوت و تبلیغِ اسلام کا کام اپنے ملک سے باہر انجام دیں؟ جن کی زیارتیں آج بھی ہند و پاکستان میں بطور گواہ کے موجود ہیں!؟ اور اگر نہیں اور اسکا عشرِ عشیر بھی نہیں تو کیوں؟

توحیدِ خداوندی میں ذہنی انتشار کا پیدا ہو جانا:۔

تیسری بات جو مجھے پیچ

کر رہی ہے وہ یہ ہے۔ کہ مسلمان جو وحدت کے پرستار تھے جنہوں نے نمرود کے بت خانے کو درہم برہم کر دیا تھا۔ جو تین سو ساٹھ بتوں سے چھٹکر صرف ایک خدا کے بندے بن گئے تھے اور جن کو تپتی ہوئی ریتوں پر لٹایا گیا۔ آگ کے انگاروں سے داغ دیا گیا۔ لیکن اُن کی زبانوں سے اَحَدٌ اَحَدٌ کا ہی نعرہ بلند ہوتا رہا۔ جو بت شکن تھے اور ساری دنیا کو توحید کی دعوت دینے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ آج خود تین سو ساٹھ جلی و خفی بتوں میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ غیر اللہ سے استمداد و فی الغیاث کے قائل ہو گئے ہیں حالانکہ توحید خداوندی ہی اہم کام ہے جس سے ہر نبیؑ نے اپنی تحریک کی ابتدا کی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط پ ۸ ع ۱۵ الاعراف ع ۸۔ ترجمہ:۔ ہم نے نوحؑ کو اُن کی قوم کی طرف بھیجا سو اُنہوں نے فرمایا اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اسکے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں۔ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ط قَالَ

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط پ ۸ ع ۱۶
ترجمہ :- اور ہم نے قومِ عاد کی طرف اُن کے بھائی ھود علیہ السلام کو بھیجا اُنھوں نے فرمایا اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اُس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ...... وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط پ ۸ ع ۱۷
ترجمہ :- اور ہم نے ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالح علیہ السلام کو بھیجا اُنھوں نے فرمایا اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں...... وَاِبْرَاهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ط پ ۲۰ ع ۱۳ العنکبوت ع ۲ اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا جب کہ اُنھوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اُس سے ڈرو ..... وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط پ ۸ ع ۱۸ الاعراف ع ۱۱
ترجمہ اور ہم نے مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا اُنھوں نے فرمایا کہ اے میری قوم تم اللہ تعالےٰ کی عبادت کرو اُس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ...... بلکہ قرآن تو تمام پیغمبروں کے متعلق فرماتا ہے کہ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ط پ ۱۴ ع ۱۱ اور ہم ہر اُمت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر بھیجتے رہے ہیں کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچتے رہو۔ خود رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہے۔ قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ

اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ط پ ۱۲ع
انعام ع ۷ - آپ کہہ دیجئے کہ مجھکو اس سے ممانعت کی گئی ہے کہ میں
اُن کی عبادت کروں جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو - اور ارشاد
ہے - قُلْ اِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ وَلَآ اُشْرِكَ بِہٖ
اِلَیْہِ اَدْعُوْا وَاِلَیْہِ مَاٰبِ ۝ پ ۱۳ع - ترجمہ - آپ فرما دیجئے
کہ مجھکو صرف یہ حکم ہوا ہے کہ میں اللہ تعالے کی بندگی کروں اور کسی کو
اُس کا شریک نہ ٹھہراؤں - میں اللہ ہی کی طرف بلاتا ہوں اور اُسی کی
طرف مجھکو جانا ہے - اور یہی وہ پیغام تھا جو رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام
نے گھر گھر جا کر سنایا - کہ یَاَیُّھَا النَّاس قُوْلُوْا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ
تُفْلِحُوْا - اے لوگو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پڑھو نجات پاؤ گے -

میرا مقصد یہ نہیں کہ مسلمان کلمہ پڑھنا نہیں جانتے اور ہم
اب انہیں کلمہ پڑھائیں - بلکہ مجھے جو چیز پریشان کر رہی ہے وہ یہ
کہ اسوقت مسلمانوں میں دو مختلف نظریے چلے آرہے ہیں بعضوں
کا نظریہ یا عقیدہ یہ ہے کہ زیارت قبور - تعویذ - ٹوٹکے - چڑھاوے
چڑھانا اور استمداد من عباد الرحمٰن فی الغایبت، مراقبہ، وغیرہ وغیرہ
قسم کی چیزیں شرک، بدعت - اور غیر ضروری ہیں - اور بعض لوگ
ان چیزوں کو مراتب کی بلندی کا ذریعہ، ثواب دارین - اور مرادوں کا
وسیلہ سمجھتے ہیں اسطرح سے مسلمان ٹکڑے ٹکڑے اور گروہ گروہ ہوکر
ایک عجیب ذہنی انتشار اور احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں -

مگر آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا ہے کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔
سعودی عرب کے محمد عبدالوہاب نے شرکِ خفی اور شرکِ
جلی پر ایک کتاب "کتاب التوحید" کے نام سے لکھی ہے جس
میں قرآن و حدیث کو دلیل بنا کر زیارتِ قبور اور استمداد من الانبیاء
کو شرک ٹھہرایا ہے مگر بعض پیرانِ عظام اور علماء کرام کی ایک
بہت بڑی جماعت نے اس کی مخالفت کی۔ اور اس کی تحریک کو وہابی
تحریک کا نام دیکر کفر کے فتوؤں سے نوازا۔ مگر جب وہ عرب میں
برسرِ اقتدار آیا تو اس تحریک پر اس شدت سے عمل کیا کہ آج تک
عرب میں کوئی شخص کسی زیارت یا قبر کو استمداد کی خاطر بوسہ دینے
یا مس کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس نے اس پر اتنی سختی سے کام لیا۔
صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے جلیل القدر ہستیوں تک کی قبروں کو بھی
زمین سے ملا دیا۔ یہ تحریک صرف عرب تک ہی محدود نہیں رہی۔ بلکہ
ہندوستان میں شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ جیسے حضرات نے
بھی اس میں خوب حصہ لیا۔ چنانچہ شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ نے
"تقویۃ الایمان" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو محمد عبدالوہاب
کی "کتاب التوحید" سے بالکل ملتی جلتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر علماء
اور پیرانِ عظام نے آپ کی سخت مخالفت کی اور آپ کی مشن کو
کامیاب ہونے میں مانع بنے رہے۔ بلکہ آج تک بہت سے پیرانِ
حضرات اور علماء آپ کے خلاف ہیں۔ موجودہ زمانے میں جماعتِ اسلامی

نے بھی توحید اور شرک کے متعلق وسیع پیمانے پر لٹریچر شائع کیا ہے اور لوگوں کو ذہنی طور پر موحد بنانے کی کافی سعی کی ہے۔ تبلیغی جماعتوں کے جلسوں اور اجتماعات میں بھی بسا اوقات "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کے عنوان سے توحید اور شرک پر تقریریں ہوتی ہیں۔ مگر آجتک کوئی جماعت ایسا حل پیش نہ کر سکی، جو ہر دو فریق کے درمیان صراط المستقیم کی حیثیت رکھتا ہو اور جس پر دونوں قسم کے عقیدوں کے لوگ متفقہ طور پر جمع ہو سکے ہوں

جھوٹی اور بے سند پیری مریدی :- چوتھی بات جو باعثِ صد پریشانی ہے وہ جھوٹی

اور بے سند پیری مریدی ہے جس نے مسلمانوں کے شیرازہ کو منتشر کر کے اُنہیں ذہنی پریشانی اور احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔

جس طرح یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ کہ اکثر اولیاء اللہؒ نے اپنی روحانی طاقت اور علوی علوم کے ذریعے۔ سورج۔ چاند ستارے۔ آگ۔ ہوا۔ پانی اور کائنات کے ایک ایک ذرہ کو باذن اللہ مسخر کر کے روحانی طور پر خلیفۃ اللہ ہونے کا عملی ثبوت دیا ہے۔ اور بہت سے حضرات نے حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو پا کر دنیا کو علوم معرفت اور نورِ محمدیؐ سے منور کر دیا ہے۔ اور عوام الناس کو ان علوم اور روحانی فیض سے مستفیض کیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بہت سے نام نہاد اور جھوٹے پیروں اور مرشدوں نے عوام الناس

کے بیشتر حصے کو اپنی پیری مریدی کی آڑ میں من گھڑت اور خود ساختہ طور طریقوں پر ڈال کر قرآن و سنت کے بتلائے ہوئے صراطِ مستقیم سے بہت دور جا پھینکا ہے۔ آج اگر یہ صاف دل اور سادہ لوح مسلمان غیر شرعی طور پر قبروں پر چادر سے چڑھاتے اور پیر یا سوا کو اپنی مُرادوں کی بر آری کے لیئے پکارنے کے باعث شرکِ خفی و جلی میں مبتلا ہو گئے ہیں تو اُس کی بھی وجہ یہی انسان نما ابلیس جیسے اور کذاب پیر اور ملنگ ہیں جو دراصل استدراج کے مالک ہیں اور جن کا نام شیطان کے نام کے ساتھ جہنم میں لکھا ہوا ہے لیکن بظاہر مسمریزم۔ ہپناٹزم (قوت ارادی) جادو اور ٹوٹکوں کے ذریعے سادہ لوح اور سادہ دل لوگوں کو شریعتِ اسلامی سے ہٹا کر اپنی طرف راغب کر لیتے ہیں اور پھر خود ساختہ طور طریقوں کو عبادت کے نام سے رائج کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح لوگوں کو قرآن و سنت سے ہٹا کر ایسی بدعات میں مبتلا کر دیتے ہیں جو بظاہر تو اچھے کام نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ قرآنی احکام سے غفلت میں ڈالنے والے ہوتے ہیں۔

قرآن ہمیں بتلاتا ہے کہ وہ لوگ جو قرآن و سنت کے علاوہ ایسے طور طریقے رائج کر لیتے ہیں۔ جن کے باعث سادہ لوگوں کو راہِ حق سے ہٹا کر ان خود ساختہ راہوں پہ ڈال لیتے ہیں جو مومنین کی مسلک کے خلاف ہو تو اُن پر اللہ ایک شیطان مسلط کر دیتا ہے۔

جو انہیں لہو ولعب میں مبتلا کر دیتا ہے اور پھر ان کو بھی شیطان کی طرح مہلت دی جاتی ہے تاکہ وہ چند دن اس دنیا کی رنگ رلیوں میں اپنا جی بہلا لیں۔ مگر ان کا انجام جہنم ہی ہے جو بہت بری جگہ ہے۔

چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق قرآن فرماتا ہے "وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (پ ۲۵ ع ۱۰ الزخرف ع ۴) ترجمہ اور جو شخص اللہ تعالےٰ کی نصیحت سے آنکھیں موند لے زندگی ہم اس پر شیطان مسلط کر دیتے ہیں سو وہ اس کے ساتھ رہتا ہے اور وہ ان کو راہ حق سے روکتے رہتے ہیں اور یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ راہ راست پر ہیں۔

اور ایک جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝ (پ ۵ ع ۱۴ النساء ع ۱۷) اور جو شخص رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کریگا (یعنی بدعت وگمراہی کو دین یا روحانیت کے نام سے رواج دے گا) بعد اسکے کہ اسکو امر حق ظاہر ہو چکا تھا۔ اور مومنین کا رستہ چھوڑ کر (قرآن وسنت کے سوا) کسی دوسرے

راستے کو اختیار کرے گا تو ہم اُسے موڑ دیتے ہیں جس طرف وہ مڑ چکا ہے (یعنی جو کچھ وہ کرنا چاہے ہم ڈھیل دیئے جاویں گے) اور اُسکو جہنم میں داخل کرینگے اور وہ بہت بری جگہ ہے رہنے کے لحاظ سے ۔ غرض ایسے لوگوں کا کام یہی ہوتا ہے کہ خود تو گمراہ ہوتے ہیں ۔ اوروں کو بھی اپنے ساتھ گمراہ کرتے رہتے ہیں ۔ بقولِ شاعر ؎

"ہم تو ڈوبے ہیں صنم تمکو بھی لے ڈوبیں گے "

اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو بزعم خود غلط کے مصداق کسی منصب و ولایت کے مالک تو نہیں ہوتے مگر وہ اپنے اندر یہ تصور رکھتے ہیں کہ ہم صاحبِ ولایت و منصب ہیں ۔

اور بعض وہ لوگ ہیں جن کے باپ دادے تو اچھے پیر اور ولی اللہ گذرے ہوں لیکن وہ خود کسی ولایت و کرامت کے مالک نہیں ہوتے ۔ یا لوگ اُن کی تعظیم ۔ تعریف اور توقیر کر کر کے اُنہیں اُوپر چڑھا دیتے ہیں ۔ جس کے باعث وہ خواہ مخواہ "پدرم سلطان بود" کی بھول بھلیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور باپ دادوں کے نام پر پیری کو سنبھالے رہتے ہیں وہ اصل امانت تو ان کے ہاتھوں سے "لاینال عھدی الظالمین" کے حکم کے بموجب جیسی ہوئی کہیں اور منتقل ہوتی ہے ۔ مگر یہ صاحب اپنے آپ کو پیر بنا کر گدی نشین بن جاتے ہیں ۔ اور پھر طرح طرح کی شعبدہ بازیوں سے لوگوں کو اپنے گرد جمع رکھتے ہیں یا باپ داووں کے قصے سنا سنا کر اپنی وقعت اور کبریائی

جماتے اور روپے پیسے بٹورتے رہتے ہیں۔

غرض یہ لوگ بھی اپنے حلوے مانڈے کی خاطر مسلمانوں کو طرح طرح سے ذہنی انتشار میں مبتلا کرکے گمراہ کرتے رہتے ہیں کہیں سماع کے بہانے رنڈیوں اور طوائفوں اور دوسرے گانے والوں کو جمع کرکرکے لوگوں کے جی بہلاوے کا سامان کرتے ہیں کہیں چرس اور بھنگ کے اڈے جما کر لوگوں کو اپنے گرد جمع کرتے رہتے ہیں تاکہ ان کی گدی قائم رہے۔ روحانیت سے نہیں تو شعبدہ بازی سے سہی۔ بس اُن کو حلوہ پلاؤ مرغ و متنجن ملتا رہے۔ اور ادھر عوام بیچارے ہیں جن کی مثال "انعام" کی ہے وہ ان کے باپ دادوں کی بزرگی اور کشف و کرامات کے قصوں کو سن کر اتنے مرعوب ہوجاتے ہیں کہ اُن کے ہر ناز و ادا کو ثوابِ دارین سمجھ کر سر آنکھوں پر بٹھاتے رہتے ہیں۔ اور اگر وہ ان نام نہاد پیروں اور ملنگوں سے کوئی خلافِ شرع کام دیکھتے بھی ہیں تو دل ہی دل میں کہہ دیتے ہیں کہ بابا یہ بزرگ لوگ ہیں شاید اس میں بھی کوئی حکمت ہو۔ ادھر یہ حضرات بھی اُنہیں سناتے رہتے ہیں کہ ؏ بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید۔ حالانکہ قرآن و سنت کے خلاف ہر فعل از روئے شریعتِ اسلامی بدعت سمجھی جاتی ہے اور بدعت کے متعلق حکم ہے "کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ" ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا انجام جہنم ہے۔ چاہے یہ بدعت و گمراہی کسی ایسے شخص کے ہاتھوں کیوں نہ

رواج پا گئی ہو جو بظاہر ہوا میں اڑتا ہو اور صاحب کشف و کرامات ہو.
لیکن اُس نے قرآن وسنت کے خلاف کوئی حکم یا فعل جاری کر دیا ہو تو وہ
پیر نہیں بلکہ آدم نما ابلیس ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ
الْكَافِرُونَ. فَأُولٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ.
فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ اور جو لوگ اللہ تعالےٰ کے
نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ دیں وہ کافر ہیں۔ ظالم ہیں
اور فاسق ہیں

مگر آجکل حق و باطل کی کوئی تمیز باقی نہیں رہی ہے۔ اصلی پیر اور
نقلی پیر کا عوام کے سامنے کوئی معیار نہیں ہے جس کا جی چاہے وہ اپنے
آپ کو پیر بنا سکتا ہے۔ کیونکہ جہاں کسی نے کوئی جھنڈا اگا دیا۔ وہاں لوگوں
کی بھر مار شروع ہو جاتی ہے۔ پھر نہ حق دیکھا جاتا ہے۔ نہ ناحق۔ جو سائیں
بابا نے کہہ دیا وہ وحی کی حیثیت رکھتا ہے امیر۔ غریب۔ چھوٹے بڑے
مرد وزن سب اپنی اپنی مرادوں کو لیکر باباجی کے پاس پہنچتے ہیں روپیہ
کی بھر مار ہے نذرانے دیئے جا رہے ہیں۔ ہر شخص باباجی سے اپنی مراد
بیان کرتا ہے اور دعا لیکر چلا جاتا ہے نہ باباجی کو یہ خیال کہ ان لوگوں کو
کچھ راہ ہدایت کی تلقین کردوں کچھ قرآن و سنت کے احکام بیان کروں
کچھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہی فریضہ ادا کر دوں کچھ مواعظ
حسنہ ہی کہہ ڈالوں بس مراد پوچھی اور دعا کا سکہ اس جیب میں ڈالا

اللہ اللہ خیر سلّا ؟ اور پھر جس کی مراد بر آئی وہ تو اُس کو بابا صاحب سے منسوب کر کے ڈھول گلے میں لٹکا اور گھر گھر گلی گلی یہ ڈھنڈورا پیٹتا رہتا ہے کہ بس باباجی نے میرا کام بنا دیا۔ اگر باباجی نہ ہوتے تو مجھے یہ ہو جاتا وہ ہو جاتا اور میں تو بس تباہ ہی ہو جاتا باباجی نے مجھے بچا لیا اور اگر کسی کی مراد پوری نہ ہوئی تو وہ اپنی قسمت کو ہی کوستا ہے کہ میری قسمت ہی بُری ہے ورنہ باباجی کے پاس تو جو بھی گیا مراد لیکر ہی آیا غرض اس طرح باباجی کی پوزیشن بنی رہتی ہے۔ اور یہ پتہ نہیں لگ سکتا کہ باباجی واقعی خدا رسیدہ بزرگ ہیں یا کوئی ٹھگ۔ اور اس طرح مسلمان احساسِ کمتری میں مبتلا ہو ہو کر ان جھوٹوں اور بے سند پیروں ملنگوں کے دامِ تزویر کے شکار ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آج تک کوئی ایسی جماعت وجود میں نہ آسکی ہے جو جھوٹی اور بے سند پیری مریدی اور ملنگی کو ختم کر کے اصل پیری مریدی اور اس کے اصل نصب العین کو آشکارا کرے اور عوام کو احساسِ کمتری اور ذہنی انتشار سے نجات دلائے۔

ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم اور اس کا غلط انجام

پانچویں بات جو باعث صد پریشانی ہے وہ ہے ہمارا ناقص نظامِ تعلیم۔ اس وقت ہماری قوم کے سامنے علم کا کوئی صحیح معیار موجود نہیں ہے۔ عوام الناس نے جو خود ساختہ معیار مقرر کر رکھا ہے یا بالفاظِ دیگر غیر اسلامی حکومت

کی ابتدا سے تعلیم کا جو معیار مقرر ہو چکا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں دینی اور دنیوی۔ دینی علم سے مراد فقہی مسائل، منطقی بحث و تمحیص اور فتووں کا جاننا ہے۔ اور دنیوی علم سے مراد ایم۔ اے۔ بی۔ اے۔ ایف۔ اے یا کم از کم میٹرک تک پڑھنا ہے تاکہ کوئی نہ کوئی ملازمت مل سکے اور بس اب ہم ان ہر دو علوم کا اختصار کے ساتھ کچھ جائزہ لیں گے۔

دینی علوم: اس سے انکار نہیں کہ دینی علوم سے مراد قرآن و حدیث اور فقہ کا جاننا ہے۔ مگر ہمارے ہاں آج تک اس کا کوئی صحیح معیار مقرر نہیں ہو سکا ہے۔ جب کسی نے قرآن کی چند آیتیں بغیر ترجمہ کے حفظ کر لیں۔ یا چند حدیثیں یاد کر لیں یا کچھ ابتدائی فقہ پڑھا ہوا ہو یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ کچھ عربی کی صرف و نحو بھی جانتا ہو بس وہ "عالم" "ملا صاحب"۔ اور "مولوی صاحب" سمجھا جاتا ہے۔

دراصل عہد بنو امیہ میں جب مسلمانوں کی فتوحات زیادہ ہو گئیں اور فاتحین اسلام مشرق و مغرب کی طرف بڑی تیز رفتاری کے ساتھ بڑھنے لگے۔ تو ایک طرف تو اسلامی مملکت کی توسیع میں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ اور دوسری طرف نو مسلم اسلام میں جوق در جوق آنے لگے۔ لہذا عاملین اسلام کو ان مفتوحہ علاقوں [illegible] دینی احکام کو عام کرنے اور انہیں عربی زبان سکھلانے کا مسئلہ درپیش ہوا چنانچہ انہوں نے حکومت وقت کے مستند علماء کی مدد سے ابتدائی فقہ کی

چند ایسی کتابیں مرتب کروائیں۔ جن میں نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ نکاح۔ طلاق۔ اور روزمرہ کے معاملات کے احکام قرآن وسنت کی روشنی میں بیان کئے گئے تھے۔ اور پھر ان تصنیفات کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ ہر مسجد کو مدرسہ کی شکل دیکر ہر امام مسجد کے ذمہ یہ فرض عائد کر دیا۔ کہ وہ پنجوقتہ نماز پڑھانے کے ساتھ ساتھ گاؤں قصبہ۔ یا محلہ والوں کے مردوزن اور چھوٹے بڑوں کو یہ ابتدائی کتب بھی پڑھایا کریں۔ تاکہ تمام مسلمان دین اسلام کے ابتدائی احکام سے باخبر ہو جائیں۔ اور ہر مسلمان بھی "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَىٰ كُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ" کے حکم کے تحت علم دین کو سیکھنے کے از حد شائق تھے۔

لہٰذا یہ طریقہ تعلیم بہت شاندار طور پہ کامیاب ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں تمام مسلمانوں میں دین ہی دین کی باتوں اور علم دین کا چرچا ہونے لگا۔ ہر گھر اور ہر محلے میں نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج اور روزمرہ کے معاملات کے متعلق قرآن وسنت کے احکام کا تذکرہ ہوتا رہتا۔ اور اس طرح سے علماءِ دین کی توقیر وعزت بھی عوام الناس کے دلوں میں بڑھتی گئی۔ مگر اس میں جو خامی رہ گئی تھی وہ یہ کہ ان عاملین یا حکومت وقت نے ان علماءِ حضرات کے نان و نفقہ کے متعلق آمدنی یا تنخواہ کی کوئی مقدار مقرر

نہیں کی۔ بلکہ اس معاملہ کو عوام الناس کے سپرد کر کے یہ کہا گیا۔ کہ ان حضرات کی تم خود جس قدر مدد کر سکو کرتے جاؤ۔ اور چونکہ خطرہ تھا کہ عوام الناس پر ان علماءِ حضرات کے اخراجات کہیں بوجھ نہ ہو جائیں۔ لہٰذا یہ بھی کہہ دیا گیا۔ کہ اگر اور مدد نہ کر سکو تو کم از کم زکوٰۃ۔ صدقات اور فطرانہ وغیرہ ہی سے ان حضرات کی مدد کر دیا کرو تاکہ یہ لوگ معاش کی فکر سے فارغ ہو کر دین کی طرف پوری توجہ دے سکیں۔ گو یہ تجاویز وقتی طور پر پیش کی گئی تھیں اور اس وقت مناسب بھی تھیں۔ مگر جوں جوں مسلمانوں کی آمدنی اور پیداوار میں اضافہ ہوتا گیا ملا صاحبان کی آمدنی بڑھتی گئی۔ اور چونکہ ان ملا صاحبان کو زکوٰۃ صدقات اور فطرانہ خود جمع کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے انہیں ہر شخص کے سامنے خود سائل بن کر جانا پڑتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض نفس پرست اور حرص زدہ ملاؤں کو تو دین کے اصل مقصد سے ہٹ کر زر پرستی اور دولت جمع کرنے کی بیماری لاحق ہو گئی۔ جس کے باعث انہیں نے غریب عوام کو چھوڑ کر صرف سرمایہ داروں سے اپنے تعلقات مستحکم کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ اور اس طرح ایک طرف عوام الناس نے ان زر پرست اور حریص ملاؤں سے دل برداشتہ ہو کر علم دین اور مساجد میں آنا ترک کرنا شروع کر دیا اور دوسری طرف

سرمایہ داروں نے ملاؤں کو اپنی طرف جھکتے ہوئے دیکھکر انہیں
اپنے مقصد کے لیئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ بس یہی وہ کمزوری
تھی جس کو دیکھکر ہر وقت کے حکمرانوں نے ملاؤں کو اپنے اپنے
مفاد کے لیئے استعمال کرنا شروع کر دیا اور یہی کمزوری علماء سوء
کی تعداد بڑھنے دن دگنے اور رات چوگنے اضافہ کی باعث ہی۔
غرض اس طرح عوام الناس کو علم دین پڑھانے اور سکھانے کی بجائے
حصول علم دین کا طریقہ یہ رہ گیا۔ کہ ہر گاؤں۔ قصبہ اور شہر کی
مساجد میں چند طالب علم سکونت پذیر ہوتے ہیں۔ جن کے خرچ
اخراجات کا ذریعہ یہ ہوتا ہے کہ صبح و شام گاؤں۔ قصبہ یا محلہ
والوں کے گھروں سے روٹی کے ٹکڑے اور ترکاری مانگ مانگ
کے جمع کر لیتے ہیں اور اس طرح ان جمع شدہ ٹکڑوں پر ہی بسر
اوقات کرتے ہیں۔ کپڑوں اور دیگر اخراجات کے متعلق ہر طالب علم
کی زندگی ایک یتیم اور لاوارث کے برابر ہوتی ہے۔ جو عوام کے
رحم و کرم پر پڑے رہتے ہیں۔ اگر کسی خدا کے بندے نے ترس
کھا کر انہیں کچھ دیدیا تو اچھا ورنہ پھٹے پرانے اور جوکوں والے
لباس میں گذر اوقات کرنی پڑتی ہے۔ چونکہ ہر دینی کام کے ساتھ
کچھ دنیوی غرض بھی اکثر وابستہ ہو ہی جایا کرتی ہے اور پھر اس
در در کی بھیک منگی اور ٹکڑوں پر گذر اوقات کا تو نتیجہ ہی یہ ہونا ہے
کہ اکثر طالب علم اپنا نصب العین یہ بنا لیتے ہیں کہ ہم جلد سے جلد

اس قابل ہو جائیں کہ نماز۔ جنازہ اور نکاح پڑھا سکیں تاکہ کسی مسجد
میں امام بنکر آرام کی زندگی گزار سکیں۔ لہذا اُن کی کوشش یہی ہوتی
ہے کہ وہ ایسی چیزیں جلد سیکھ لیں جو امامت مسجد میں کام آسکتی ہوں۔
اور چونکہ اُن کا نصب العین ہی امامت مسجد ہوتا ہے۔ اس لئے
اُن کی بے حرصی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ کسی آسودہ حال لوگوں
کی مسجد کی امامت کو حاصل کرنے کے لئے خود بھی ایک دوسرے
پر کفر کا شرک کے فتوؤں تک تیار ہو جاتے ہیں اور اسی
نصب العین کے تحت وہ آئے دن ایک گاؤں کو دوسرے
گاؤں سے اور ایک قوم کو دوسری قوم سے لڑاتے پھراتے
رہتے ہیں غرض اس محدود نصب العین نے لوگوں کے
دلوں سے علم دین کا شوق مفقود کر دیا۔ عوام الناس نے اپنے
بچوں کو مسجدوں کے بجائے سکولوں میں بھیجنا شروع کر دیا
تاکہ ان کے بچوں کو کم از کم کوئی عزت کی نوکری تو نصیب ہو سکے
اور اسی طرح آہستہ آہستہ مسجدوں میں علم دین حاصل کرنے کا طریقہ
ختم ہوتا گیا اور مسجدیں صرف نماز پڑھنے ہی کے لئے مخصوص ہو گئیں
جس کا فطری نتیجہ یہی ہوتا تھا کہ امامت مسجد کی آسان ہو جاتی
اور ہر کس و ناکس کو امامت مسجد حاصل کرنا آسان ہو جاتا۔ اور
پھر ایسی مسجدوں کی امامت سے ہی کیا مشکل جس میں صرف نماز ہی
پڑھانا مقصود ہو۔ قرآن کی چند سورتیں حفظ کر لیں۔ ابتدائی

فقہ جس میں نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکواۃ ہی کے متعلق چند ضروری احکام ہوتے ہیں وہ تو وہ پڑھ ہی چکے ہوتے ہیں گو زبانی یاد کسی کو بھی نہیں ہوتے البتہ بوقت ضرورت کتاب سے دیکھ کر بتلا دینے کی صلاحیت کچھ ہونی چاہیئے اور کچھ نماز جنازہ اور نکاح کا پڑھ لینا اور بس اس میں بھی بسا اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض ملا صاحبان جب نکاح پڑھاتے ہیں تو نکاح کی کتاب میں جو فرضی نام زید بکر یا کچھ اور دیئے ہوئے ہوتے ہیں اُن ہی کو ہی پڑھ کر نکاح کرا لیتے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ بیچارے ترجمہ تو جانتے نہیں نکاح کی دُعا (یا طریقۂ نکاح) جو کتاب میں عربی زبان میں مسطور ہوتی ہے وہی زبانی یاد کرکے بوقت ضرورت جوں کی توں پڑھ لیتے ہیں اور بس۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ مسلمان علماء علم دین سے واقف ہی نہیں ہیں اور نہ ہی اس میں میرا خطاب اُن علماء دین سے ہے۔ جو حقیقت میں قرآن و سنت اور علم فقہ کے عالم ہیں۔ بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ مستند دار العلوم کے سند یافتہ علماء تو شاذ و نادر ہی کہیں پائے جاوینگے مگر عام ملا یت کا کوئی معیار مقرر نہیں ہے۔ ہمارے روزمرہ کے مشاہدے میں ایسے اکثر ملا صاحبان آتے ہیں جو خواہ مخواہ اپنے نان نفقہ کی خاطر کسی مسجد کے امام بن گئے ہیں۔ وہ نہ تو کسی دینی مدرسہ دار العلوم کے سند یافتہ ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں دین کے متعلق

کوئی صحیح معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مگر عوام الناس چونکہ اکثر دین
کے بارے میں خود کورے اور بے خبر ہوتے ہیں لہٰذا وہ ہر اُس
شخص کو ملا و مولوی صاحب تصور کر لیتے ہیں جو صرف نماز جنازہ
اور نکاح ہی پڑھانا جانتا ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے
ملاؤں کی اکثریت علم دین سے قطعی طور پر بے خبر ہوتی ہے۔
اور بعض ملاّ ایسے بھی ہیں جو کچھ علم تو رکھتے ہیں مگر اُن کا علم محض
فقہی مسائل، فتاویٰ اور بحث و مناظروں میں اُلجھا ہوا علم ہوتا ہے
اور چونکہ وہ انہی چیزوں کو علم دین تصوّر کئے ہوئے ہوتے ہیں۔
لہٰذا ایسے علماء کی اکثریت اپنا سارا وقت منطق اور صرف و نحو
کے سیکھنے میں ہی صرف کر ڈالتی ہے۔ چنانچہ ایسے لوگ قوموں
میں فتنہ و فساد برپا کرنے اور سادہ لوح عوام کو آپس میں لڑانے
کے سوا کچھ کرتے کراتے نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قرآن و سنت
کے اصل مقصد سے ہٹ کر اُن چیزوں میں اپنا سارا وقت لگا
دیتے ہیں جو کسی زبان کو سیکھنے کے آلات تو ہیں مگر یہ چیزیں خود علم
نہیں۔ کیونکہ علم تو دراصل اُن معاملات و احکامات کا جاننا ہے
جن کا آنکھ، کان، اور فواد یعنی عقل کے مشاہدہ سے تعلق ہو تاکہ
آنکھ جو کچھ دیکھے، وہ قرآن و سنت کے مقرر کئے ہوئے حدود
کے اندر دیکھے۔ کان جو کچھ سنے وہ قرآن و سنت کے فرمان کے
مطابق سنے۔ اور ذہن جو کچھ سوچے وہ قرآن و سنت کی ہدایات

کے مطابق سوچے۔ اگر کوئی شخص ان تینوں انسانی آلات (سمع۔ بصر۔ فواد) سے متعلق قرآن وسنت کے احکام سے بے خبر ہے، یا وہ ان احکامات کے بیان کرنے سے قاصر اور ان پر عمل کرنے سے محروم ہے۔ اور پھر بھی اپنے آپ کو عالم تصوّر کرتا ہے تو اُس کی مثال یہود کے اُن علماء کی طرح ہے۔ جن کو قرآن نے "حمار" سے تشبیہ دی ہے۔ جیسے کہ ارشاد ہے۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۝

(پ ۲۸ الجمعہ ع ۱) ترجمہ :۔ جن لوگوں کو توریت اٹھوائی دی گئی اور پھر انہوں نے اُسے اُٹھایا نہیں یعنی اُس پر عمل نہیں کیا۔ سو اُن کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جس نے بہت سی کتابیں اُٹھا رکھی ہوں۔ بہت بُری مثال قائم کی اُن لوگوں نے جنہوں نے خدا کی آیتوں کو جھٹلایا۔ اور اللہ تعالےٰ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا "

یہ مثال اللہ تعالےٰ نے اس لئے بیان فرمائی ہے کہ یہود کے علماء اپنے آپ کو توریت کے حاملین تو تصور کرتے تھے۔ لیکن توریت میں جو خدائی احکام بیان کیئے گئے تھے وہ اُن کو اپنے اعمال سے جھٹلاتے تھے اور حق بات کو چھپا کر من گھڑت باتیں

خدا سے منسوب کرتے تھے۔ اور یہ تو ایک نفسیاتی اثر اور فطری امر بھی ہے۔ کہ جو شخص خود کسی امر پر عمل نہیں کرتا وہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین نہیں کر سکتا۔ پس جو علماء اپنے کان، آنکھ اور ذہنوں کو قرآن و سنت کی ہدایات کے مطابق نہ چلا سکتے ہوں وہ علماء حق نہیں بلکہ علماء سو ہیں۔ جن کا علم فتنہ و فساد پھیلانے اور کفر و کافر گری کے فتووں کے سوا کچھ نہیں پس ایسے علماء اگر جہان بھر کی کتابیں بھی کیوں نہ پڑھ لیں اُن کی مثال اُس "حمار" کی مانند ہے جو کتابوں کو اپنی پیٹھ پر لادے پھر رہا ہو۔ اور ایسے علوم کا ردِ عمل یہی ہوتا ہے کہ وہ نام نہاد علماء، اپنی قوم کو گروہ بندی میں مبتلا کر کے آپس کی خانہ جنگی سے ٹکڑے ٹکڑے اور کمزور کر دیتے ہیں۔ یا چند ٹکوں کی خاطر غیروں کے ہاتھ بک کر اپنی قوم کو تباہ اور دوسروں کے دست نگر کر دیتے ہیں۔

دنیوی علوم دنیوی علوم کا جو معیار اس وقت عوام کے سامنے ہے۔ وہ یہی ہے کہ اکثر لوگ اپنے بچوں کو میٹرک تک تعلیم دلاتے ہیں۔ تاکہ وہ کہیں نہ کہیں کوئی ملازمت اختیار کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ان میں سے بعض لوگ جو متمول ہیں اور اپنے بچوں کو ذرا زیادہ پڑھانے کے شوق کے ساتھ ساتھ ان کے اخراجات برداشت کرنے کی استطاعت بھی رکھتے ہیں۔ وہ ایف۔ اے۔ بی اے اور ایم اے تک پڑھا دیتے ہیں

مگر نصب العین اُن کا بھی یہی ہوتا ہے کہ ہمارے بچے کسی اچھی ملازمت کو اختیار کر سکیں۔ ان میں وُہ لوگ بھی شامل ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے ڈاکٹری، انجینئرنگ اور دوسری اعلیٰ قسم کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ مگر اس میں بھی صرف وہی لوگ اپنے اِن مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جو اپنے بچوں کو باہر کے ممالک میں بھیجنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ اور یا کم از کم اتنا ہی کر سکیں کہ اپنے بچوں کو اندرونِ ملک میں ہی کوئی اچھی تعلیم دلانے کا خرچ برداشت کر سکتے ہوں یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اِن علوم کے حاصل کرنے کے لئے بھی سرمایہ داری شرطِ اوّل ہے۔ جو لوگ افلاس و غربت زدہ ہیں یا وہ متوسط درجے کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے سے قاصر ہیں بلکہ وہ طوعاً و کرہاً اس بات پر مجبور کئے گئے ہیں کہ اپنے بچوں کو زیادہ سے زیادہ مڈل۔ یا میٹرک تک ہی تعلیم دلا کر کسی دفتر میں ملازم کرا دیں اور بس۔

در اصل انسانی زندگی کے اُن علوم میں جن پر قوموں کے عروج و بلندی کا دارومدار ہے۔ انگریزی سیاست بہت دور تک کارفرما ہے۔ انگریز جب ہندوستان پر حکمران تھا۔ تو وہ سمجھتا تھا۔ کہ ہندوستانیوں کو اپنی غلامی میں پوری طرح جکڑنے کا واحد علاج یہی ہے کہ اُن علوم کو اُن سے چھپایا جائے جن پر انکے عروج و ترقی کا دارومدار ہے۔ لہٰذا اُنھوں نے نہایت ہی بڑے

اسرار طور پر اُن تمام علوم کو جن کا حاصل کرنا ایک طالب علم کے لئے ضروری تھا۔ انگریزی زبان میں منتقل کر دیا اور پھر اُن کے حصول کے لئے ایسی لمبی سیڑھیاں بنا لیں کہ جن تک پہنچتے پہنچتے طالبعلم کی آدھی عمر ضائع ہو جاتی ہے۔ اور صرف چند امیروں کے بچے ہی اُس حد تک پہونچ سکتے ہیں۔ غریب اور متوسط درجے کے طالبعلموں کو ان علوم کی ہوا بھی نہیں لگنے پاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان علوم کو حاصل کرنے کے لیئے اعلےٰ قسم کی انگریزی سیکھنا لازمی قرار پایا۔ اور اعلیٰ قسم کی انگریزی سیکھنے کے لئے چودہ یا سولہ درجے مقرر کئے گئے اور پھر ہر درجے کو پاس کرنے کے لئے ایک سال کا وقفہ مقرر کیا گیا۔ چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ جب تک کوئی طالبعلم بی اے یا ایم اے کی ڈگری حاصل نہ کرے وہ کسی میڈیکل، ٹیکنیکل۔ یا مکانیکل کالج میں نہیں لیا جا سکیگا اور لطف یہ ہے کہ فطری علوم کے ان بڑے بڑے کالجوں کو اکثر ملک سے باہر ہی بنایا گیا تھا۔ تاکہ سرمایہ داروں کے علاوہ کسی اور شخص کی رسائی ان تک نہ ہو سکے۔

غرض اس طرح ایک طرف تو انسانی زندگی کے ضروری علوم کو بلند بام پر لٹکا کر عوام الناس کو ان سے محروم کر دیا گیا اور دوسری طرف سرکاری ملازمتوں کا معیار بھی انگریزی تعلیم پر ہی رکھا گیا۔ انگریزی زبان کو سرکاری زبان قرار دیکر تمام سرکاری دفاتر فوج اور سول کے محکموں، ایم ای ایس اور ریلوے تک کے

دفتروں میں انگریزی کے بغیر کسی دوسری زبان میں خط و کتابت کرنا ممنوع یا حقارت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اور طالبعلموں کو ہر طرح سے اسباب پر مجبور کیا گیا کہ اگر وہ کسی سرکاری ملازمت کو اختیار کر لینے کا شوق رکھتے ہوں۔ تو انہیں کم از کم میٹرک پاس ہونا چاہیئے۔ یا بہ معنیٰ دیگر انگریزی لکھ پڑھ سکنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنی چاہیئے۔

ان تمام کوششوں کا مقصد یہ تھا۔ کہ ایک طرف تو غریب اور متوسط درجے کے لوگ اُن علوم سے محروم رہ جائیں کہ جن پر قوموں کے عروج و ترقی کا دار و مدار ہے۔ اور دوسری طرف یہ لوگ اپنی روزی کمانے کی فکر میں بچوں کو انگریزی تعلیم دلانے میں اتنے منہمک ہو جائیں کہ قرآن و سنت کے علوم کی طرف توجہ ہی نہ دے سکیں اور اس طرح یہ دینی و دنیوی ہر دو علوم سے محروم رہ کر ہمارے ہی دستِ نگر بنے رہیں۔

غرض یہ ہے۔ کہ اگر ایک طرف ہمارے سادہ لوح ملاؤں نے فقہی مسائل اور منطقی مباحثوں کو معراج علم قرار دے دیا ہے تو دوسری طرف ہماری دنیوی تعلیم کا وہ معیار بھی جو انگریزوں کا مقرر کردہ ہے کوئی خاص بلند نہیں۔

علم کا صحیح معیار :- یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ایک قوم کے علماء کا اثر اُس قوم کے اخلاق۔ عادات

جذبات، احساسات۔ اور کردار پر براہِ راست پڑتا ہے۔ اگر کسی قوم کو صحیح علماء نصیب ہو جائیں۔ تو وہ قوم نہ صرف راہِ حق پر آسانی سے چل سکتی ہے بلکہ شاہراہِ ترقی پر بھی بہت جلد گامزن ہو سکتی ہے۔ اور یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ علماء دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک علماء فطرت۔ اور دوسرے علماء شریعت۔

علمِ فطرت: علمِ فطرت سے مراد علمِ طب۔ علم الطبیعات علم الکیمیا۔ حیاتیات۔ حیوانیات۔ فلکیات۔ ارضیات۔ زراعت۔ انجینئرنگ۔ اور وائرلیس ریڈیو۔ تار۔ ٹیلیفون۔ ٹیلیویژن اور سائنس کے دیگر ایجادات کا علم حاصل کرنا ہے۔ یہ وہ فطری علوم ہیں۔ جو آدمؑ (یعنی انسان) کو فرشتوں کے مقابلے میں ودیعت کر دیئے گئے تھے۔ تاکہ وہ کائنات کی تمام ظاہر و مخفی طاقتوں کو اس علمِ فطرت کے ذریعے مسخر کر کے خلیفۃ اللہ ہونے کا حق ادا کر سکے۔

لیکن افسوس ہے کہ آج ہم ایک طرف تو ہر اُس شخص کو بھی عالم تصور کر لیتے ہیں جو قرآن کی چند آیتیں بغیر ترجمہ کے پڑھ لیتا ہو یا وہ فقہ کے ابتدائی کتب سے کچھ واقفیت رکھتا ہو۔ یا عربی کی صرف و نحو جانتا ہو یا زیادہ سے زیادہ اُسے چند حدیثیں بھی یاد ہوں۔

لیکن دوسری طرف ہم بڑے سے بڑے سائنسدان، فلاسفر

سرجن۔ انجینئر اور بہترین سے بہترین ماہر فطرت کو بھی عالم نہیں سمجھتے۔

یہی وجہ ہے کہ غیر اسلامی دنیا نو فلکِ علم و ہنر پر آفتاب بنی ہوئی ہے۔ ہواؤں میں اُڑ رہی ہے سمندروں میں تیر رہی ہے بجلی کو مسخر کر کے دنیا کو طاقت اور روشنی بہم پہنچا رہی ہے۔ وائرلیس اور ٹیلیفون اور ٹیلیویژن کی قسم کی نئی سے نئی ایجادات کر رہی ہے آتمی پاور سے اپنی طاقت بڑھا رہی ہے۔ ہائیڈروجن بم اور دخان کی دھمکی سے دنیا پر اپنا رعب داب بٹھا رہی ہے۔ چاند پر چڑھنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مگر سادہ لوح مسلمان کو اس تسخیر کائنات میں ایک ٹٹو بھی میسر نہیں ہے

وہ برق سے براق بنانے میں ہیں مصروف؛ ہمکو تو میسر نہیں ٹٹو بھی جہاں میں

اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کا مسلمان خلافتِ الٰہی کا صرف روحانی تصور رکھتا ہے۔ جسمانی طور پر خلافتِ الٰہی کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ یا یہ کہ اُس نے قرآن میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ورنہ قرآن تو ہمیں بتلاتا ہے کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اللہ تعالےٰ نے انسان کے لئے مسخر کر رکھا ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ اپنے فطری علم کی بدولت اُس سے فائدہ اُٹھائے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (پ ۱۳ ع ۱۷ ابراھیم ع ۵)

اللہ تعالےٰ تو ایسا ہے کہ اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور پھر آسمان سے پانی برسایا پھر اُس پانی سے تمہارے لئے (پھل، پھول، سبزی، دانے کی قسم کا) رزق پیدا کیا۔ اور تمہارے ہی نفع کے واسطے کشتی کو مسخر بنایا۔ تاکہ وہ خدا کے حکم سے دریا میں چلے۔ اور تمہارے ہی نفع کے واسطے نہروں کو مسخر بنایا۔ اور تمہارے ہی نفع کے واسطے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا جو ہمیشہ چلتے ہی رہتے ہیں اور تمہارے ہی نفع کیواسطے رات اور دن کو مسخر کیا۔ اور جو چیز تم نے مانگی تمکو ہر چیز دی اور اگر تم اللہ تعالےٰ کی نعمتیں شمار کرنے لگو تو شمار میں نہ لا سکو گے۔ سچ تو یہ ہے کہ آدمی بہت ہی بے انصاف اور بڑا ہی ناشکرا ہے۔ اور ارشاد ہے:۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ (روم ۲۲) اور اُنہی آیات میں سے ارض و سما

کی تخلیق نیز رنگوں اور زبانوں کا جدا جدا ہونا بھی ہے بیشک علماء فطرت کے لئے ان میں بڑے بڑے اسباق موجود ہیں۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (سورہ جاثیہ) اور لیل و نہار کی اختلاف اور زمین کو زندہ کر دینے والے قطرات باران اور ہواؤں کے رخ بدلکر چلنے میں عقلمند قوم کے لئے بڑے بڑے اسباق موجود ہیں۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ

(روم ۲۴) اور آیات خداوندی میں سے تم ایک تو بجلی کو دیکھتے ہو جو تمہارے لئے بیم و رجا کا سامان پیدا کر دیتی ہے یعنی اس کی روشنی سے فائدے اٹھاؤ گے اور اس کے دوسرے نقصانات سے خوف زدہ ہو جاؤ گے۔ اور اس کے ذریعے آسمان سے پانی برسایا جاتا ہے اور مردہ زمین کو اس سے زندہ کیا جاتا ہے۔ بیشک اس میں عقلمند قوم کے لئے بڑے اسباق موجود ہیں۔ جب بجلی چمکتی ہے تو اس کی برقی لہریں ہوا سے گذر کر زمین کو

چھوڑتی ہیں اور ہر ذرہ زمین کی نس نس میں عناصر حیات پیدا کر دیتی ہیں
جو زمین امراض کا شکار ہو جاتی ہے۔ رگوں کا واحد علاج بھی یہی بجلی
کی چمک اور بادلوں کی گرج ہے۔ آج کل بہت سی انسانی بیماریوں
کا علاج بھی بجلی کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں
میں بجلی کے ذریعے بڑے بڑے کارخانے۔ ریل گاڑیاں اور ٹریم
چلائے جاتے ہیں اور وہ وقت بھی قریب ہے کہ بجلی کے ذریعے
انسان ہوا میں پرواز کرنے کے قابل بھی ہو سکیگا۔ اسی طرح
خود انسان اور ان حیوانات کی تخلیق کے متعلق قرآن یوں اشارہ
کرتا ہے۔ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَابَّةٍ
آيَاتٌ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ (سورہ جاثیہ) اور تمہاری
تخلیق اور زمین پر پھیلے ہوئے حیوانات کی تخلیق میں (اللہ پر)
ایمان رکھنے والی قوم کے لئے آیات موجود ہیں۔

دراصل کمال تخلیق اور نظام ربوبیت کی عظمت کا اندازہ
تو ان لوگوں ہی کو ہو سکتا ہے۔ جو علم فطرت کے حصول میں عمریں بسر
کرتے ہیں۔ مثلاً انسان کو ہی لے لیجئے۔ ایک عام شخص انسان کا ڈھانچہ
دیکھکر یہ تو معلوم کر سکتا ہے۔ کہ یہ ایک بولتا۔ ہنستا۔ چلتا
پھرتا۔ کھاتا۔ پیتا۔ سوتا اور جاگتا پتلا ہے مگر وہ یہ نہیں بتلا
سکتا کہ یہ تمام طاقتیں جو اسے حاصل ہوئی ہیں ان میں کمی بیشی
رکاوٹ یا تیزی کیسے پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ایک انسان

کے بولنے یا سننے میں نقص آجائے۔ یا چلنے پھرنے کی طاقت میں کمی واقع ہو جائے یا اُسکے کھانے پینے کے نظام میں گڑبڑ پیدا ہو جائے یا وہ بے خوابی۔ یا نسیان جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے۔ تو عام لوگ اسکے علاج سے قاصر ہیں۔ مگر اُن کے مقابلے میں ڈاکٹر لوگ نہ صرف ان بیماریوں کا علاج ہی جانتے ہیں۔ بلکہ وہ ہمیں انسان کے سر۔ منہ۔ آنکھ۔ ناک۔ کان۔ سینہ۔ پیٹ۔ کمر اور پاؤں وغیرہ کی ایک ایک بیماری۔ کمزوری اور صحت یابی سے متعلق اطلاع دیتے ہیں۔ انسان کے اندر۔ دماغ۔ نخاع۔ پھیپھڑیوں۔ دل۔ جگر۔ گردول تلی۔ معدہ۔ مثانہ۔ انتڑیوں۔ ۲۴۸ ہڈیوں، ۵۰۰ پٹھوں ۳۶۰ عروق۔ اور ۹۰۰ وریدوں تک کی بیماریوں، امراض، اور صحت یابی کی خبر بھی دے سکتے ہیں۔ ان میں خون، صفرا، بلغم اور سودا کی کمی یا زیادتی کو سمجھتے ہیں۔ اور جراثیم وغیرہ کی خبر دیتے ہیں۔ ان سے بڑھکر بعض علماء وہ ہیں جو ہمیں انسان کی عقل۔ روح۔ تخیلات، توہمات۔ تفکرات۔ تحفظات اور تذکرات کی خبر بھی دیتے ہیں۔ اس طرح بعض علماء ایسے بھی ہیں۔ جو جمادات، نباتات۔ اور حیوانات کے علم و تحقیق میں دن رات ایک کرتے ہیں اور اُن میں غور و فکر کرکے انسانیت کے لئے فائدے بہم پہنچاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ۝ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (فاطر ۳۵ ۲۸) اور پہاڑوں میں سفید و سرخ اور سیاہ ترین رنگوں (یعنی الماس و کروم کوئلہ کے قسم) کے پتھروں کی تہیں موجود ہیں اور انسانوں اور مویشیوں کے بھی مختلف رنگ ہیں (ان کا مطالعہ کرو) اور یاد رکھو۔ کہ اللہ تعالیٰ سے تو صرف اس کے عالم بندے ہی ڈرتے ہیں۔ یعنی ان چیزوں کا مطالعہ کرو ان کا علم حاصل کرو تب تمہارے اندر خشیت الٰہی پیدا ہوگی اور تب ہی خدا کی صفات تم پر کھل سکیں گے۔

غرض یہ ہے کہ زمین کے اندر معدنیات کا ایک حیرت انگیز سلسلہ موجود ہے۔ فضا میں بے پناہ طاقتیں (یعنی گیس، اثیر روشنی اور بجلی وغیرہ) محو عمل ہیں۔ آج بجلی اور اس کے کرشمے سسٹیم اور اس کے عجائبات۔ پیٹرول اور اس کے کمالات سے اقوام عالم فائدے اٹھا رہی ہیں۔ ہم آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں کانوں سے سن رہے ہیں۔ دل اور دماغ کے ذریعے ان سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں۔ لیکن اس علم کے حصول کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کرتے

حالانکہ مسلمانوں کو قرآن ساڑھے تیرہ سو سال سے آواز بلند پکار رہا ہے۔ کہ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً ؕ (یعنی اے قرآن پڑھنے والو) کیا تم نہیں دیکھتے؟ کہ اللہ تعالےٰ نے تمہارے لئے ہی مسخر کر رکھا ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ بھی زمین میں ہے۔ اور تم پر پوری کر دی ہیں اس کی نعمتیں جو ظاہر بھی ہیں اور جو مخفی ہیں۔ زمین و آسمان اور فضا کے اندر جو بھی ظاہر اور مخفی ہے سب کچھ تمہارے ہی لئے ہے۔ مگر عقل کا اندھا۔ کانوں کا بہرہ۔ اور کور چشم مسلمان ایک بیکار آدمی کی طرح ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہے لیس اسے نا عاقبت اندیش۔ کام چور اور غفلت زدہ انسانو! یاد رکھو! اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل ۳۶) تحقیق کان۔ آنکھ اور دل ہر ایک کے استعمال کے متعلق ضرور بازپرس ہوگی۔ (کہ ان کو صحیح طور پر استعمال کیا ہے یا نہیں)

پس میرے نزدیک ہمارے علماء نے اس بات کی کوشش ہی نہیں کی کہ علم سے مراد کیا ہے اور علم ہے کیا چیز؟ وہ تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ علم سے مراد جاننا ہے کیا جاننا؟

صرف و نحو جاننا، منطق جاننا یا زیادہ سے زیادہ کچھ ابتدائی
فقہ جاننا، کچھ حدیثوں کا ترجمہ جاننا، کچھ قرآن کا بے ترجمہ
پڑھنا جاننا وغیرہ وغیرہ علم ہے اور بس۔ انہوں نے اسباب
کی تدبیر جاننے کی تکلیف ہی گوارا نہیں کی ہے کہ علم سے مراد
انسانیت اور اس کی ذمہ داریوں کا جاننا ہے۔ جو خلیفہ
خلافت اور اس کی ذمہ داریوں سے بے خبر ہوگا۔ وہ
عالم نہیں بلکہ جاہل مطلق سمجھا جائے گا۔ چاہے وہ صرف و نحو
منطق وغیرہ قسم کی سب چیزیں کیوں نہ پڑھا ہوا ہو۔

خلافت مشتمل ہے علم آدمیت، اور علم نبوت پر
یعنی علم فطرت اور علم شریعت پر۔ علم فطرت وہ علم
ہے جس میں علم الاشیاء اور تسخیر کائنات کا علم شامل ہے۔
یہ وہ علوم ہیں جو فرشتوں کے مقابلے میں آدم کو عطا کئے گئے تھے
وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى
الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ
إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا
عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ
الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝ (اور ہم نے آدم کو تمام اشیاء
کے نام سکھائے پھر ہم نے ان کو فرشتوں پر پیش کیا۔ کہ
بتلاؤ ان چیزوں کے نام اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو!

انہوں نے عرض کیا۔ کہ آپ ہی ہر کمزوری سے پاک ہیں۔ ہمیں تو ان چیزوں کا علم نہیں۔ ہمیں تو صرف وہی علم حاصل ہے جو آپ نے ہمیں عطا کیا ہے۔ تحقیق آپ ہی سب سے زیادہ علم رکھنے والے اور حکیم ہیں۔

در اصل علم الاشیاء اور تسخیر کائنات کا علم فرشتوں کو اس لئے نہ دیا گیا تھا کہ اُن میں ایسے علوم کی اہلیت نہ تھی کیونکہ نہ تو وہ کھانے پینے تھے اور نہ ہی اُن کو کھیتی باڑی پھل پھول۔ سبزی اور اشیاء خوردنی کے علوم کی ضرورت تھی۔ اور جب ان کو کھانے پینے اور دیگر انسانی ضروریات کی اشیاء کی ضرورت نہ تھی۔ تو ظاہر ہے کہ اُن میں تسخیر کائنات کا مادہ بھی مفقود ہونا چاہیئے۔ کیونکہ انسانی ضروریات ہی توپ، ٹینک، ہوائی جہاز۔ آئٹم و ہیڈروجن۔ بجلی۔ اور ٹیلیوژن کے قسم کی ایجادات کی اصل محرک ہیں۔ اور جب فرشتوں کو ان اشیاء کی ضرورت ہی نہ تھی تو ان کا علم انہیں سکھلا دینا بھی بے معنی تھا۔ اسی لیئے تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ " اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ " میں وہ کچھ جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے۔ وگرنہ جب آدمؑ کو یہ علوم ودیعت کر دیئے گئے۔ تو فرشتے کبھی تو یہ عرض نہ کر سکتے تھے کہ ہمیں بھی وہ علوم عطا کیئے جا دیں جو آدمؑ کو عطا کیئے گئے ہیں۔ مگر انہوں نے ایسی دعا نہیں کی بلکہ مسخر ہوگئے

حالانکہ "نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ"
کا دعوے تو وہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ اور پھر ایک ایسے شخص کے
مقابلے میں جس میں "سفاکیت" اور فسادیت کا مادہ موجود ہو۔
فرشتوں جیسی پاک مخلوق جو مفسدانہ اور سفاکانہ حرکت سے
ہی پاک ہے۔ بلکہ تسبیح و تحمید و تقدیس بیان کرنے والی اور
ہر حال میں خدا کی فرمانبردار رہی ہے۔ خلافت کی زیادہ
حقدار ہونا چاہیئے تھی۔ مگر باوجود اسکے فرشتوں کو خلافت
ارضی اور علم آدمیت سے محروم رکھنا سوائے اس کے
نہ تھا۔ کہ فرشتوں میں نفس آدم نہ ہونے کے باعث ان علوم کی
صلاحیت نہ تھی اور نہ ہی انہیں ان علوم کی ضرورت تھی لہذا
انہیں ایسے علوم سکھلا دینا جن کے وہ اہل ہی نہ تھے بے معنی
تھا۔ ورنہ اللہ تعالے ذرہ برابر کسی کا حق مارنے والا نہیں ہے

علم شریعت یا علم نبوت :- علم شریعت یا علم نبوت
وہ نظام حیات ہے جس پر
چل کر انسان اس سفاکی اور فسادی مادے کو دبا سکے جو اسکی
خمیر میں موجود ہے۔ یہ ایک ایسا علم ہے کہ جو فرشتوں ہی کے
ذریعے انبیاء علیہم السلام تک پہنچایا گیا ہے خود رسول علیہ الصلوٰۃ
والسلام کی ذات اقدس کے متعلق ارشاد ہے۔ وَكَذَٰلِكَ
أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنتَ تَدْرِي

مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا (شوریٰ ع ۵) اور اسی طرح ہم نے وحی کی (حکم کیا۔ مقرر کیا۔ مسلط کیا) آپکی جانب ایک روح کو اپنے امر سے ورنہ آپ نہ جانتے تھے۔ کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا؟ لیکن ہم نے اُس کو ایک نور بنایا۔ ہدایت دیتے ہیں۔ ہم اُس کے ذریعے جس کو چاہیں۔ اپنے بندوں میں سے جیسے عیسےٰ علیہ السلام کے متعلق ارشاد خداوندی ہے۔ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ اور ہم نے عیسےٰ علیہ السلام کی تائید روح القدس سے (یعنی جبرائیل امین سے کی) اسیطرح نزول قرآن کے متعلق ارشاد ہے۔ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (البقرہ ع ۱۲) آپ کہدیجئے کہ جو شخص بھی جبرئیل سے عداوت رکھتا ہے تحقیق انہوں نے تو اللہ تعالےٰ کے حکم سے ہی یہ قرآن آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے۔ جو تصدیق کر رہا ہے۔ اپنے سے قبل والی کتابوں کی۔ اور رہنمائی کر رہا ہے اور خوشخبری سنا رہا ہے اپنے ماننے والوں کو۔

سورۂ تکویر میں قسم کھا کر فرمایا گیا ہے کہ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۝ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۝ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۝ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۝ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝ (پارہ ۳۰ التکویر ۱) سو قسم ہے ان ستاروں کی جو پیچھے کو ہٹنے لگتے ہیں۔ چلتے رہتے ہیں اور قسم ہے رات کی جب وہ جانے لگے۔ اور قسم ہے صبح کی جب وہ آنے لگے کہ یہ قرآن کلام ہے ایک معزز فرشتہ کا لایا ہوا جو قوت والا ہے۔ مالک عرش کے نزدیک ذی رتبہ ہے۔ وہاں اس کا کہا مانا جاتا ہے پھر امانت دار بھی ہے۔

اسی طرح سورۂ عبس میں بھی قرآن کا فرشتوں کے ہاتھوں لکھے جانے اور اس کی حفاظت کرنے کا بھی ذکر ہے۔ ارشاد ہے۔ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝ (ہرگز ایسا نہ کیجئے قرآن تو ایک نصیحت کی چیز ہے سو جس کا جی چاہے اسے قبول کرے وہ ایسے صحیفوں میں ہے جو مکرم ہیں رفیع المکان ہیں، مقدس ہیں۔ جو ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہے کہ وہ مکرم نیک ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ قرآن فرشتوں کے ہاتھوں لکھا گیا ہے فرشتوں کی حفاظت میں ہے فرشتوں کے ذریعے سے بھیجا گیا ہے۔ اور اگر یہ قرآن اور دوسری آسمانی کتب جو دوسرے پیغمبروں پر بھی فرشتوں ہی کے ذریعے سے نازل کی گئی تھیں وہ علم سمجھا جائے جو آدمؑ کو فرشتوں کے مقابلے میں دیا گیا تھا۔ اور فرشتے اس علم کے حامل، محافظ، لکھنے والے۔ اور لانے والے ہو سکتے تھے تو سوال پیدا ہوگا کہ اُس وقت فرشتوں کو ان علوم سے کیوں محروم رکھا گیا تھا؟ کیا اُس وقت جبرائیلؑ جیسے فرشتے موجود نہ تھے؟ یا سفرۃٍ کرامٍ بررۃ موجود نہ تھے؟ یا اُس وقت یہ قرآن اور دیگر آسمانی کتب موجود نہ تھیں؟ اور اگر "اسمآء کلھا" میں قرآن اور دوسری آسمانی کتب بھی شمار کی جائیں تو پھر تو افضل الانبیاءؐ کا خطاب آدمؑ کو ہی ملنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ اُن کو تو فرشتوں کی درد کے بغیر ہی تمام علوم سکھائے گئے تھے۔ اور باقی تمام پیغمبروں کو فرشتوں ہی کے ذریعے کتب پہونچی ہیں مگر نہیں! ایسا نہیں ہے بلکہ آدم علیہ السلام کو جو علم دیا گیا تھا وہ علمِ فطرت ہی تھا۔ جو فرشتوں کے اور اک سے بالاتر تھا۔ ورنہ تسبیح، تحمید، تقدیس جیسے قرآنی علوم تو فرشتے پہلے بھی جانتے تھے وہ اگر عاجز کئے گئے تھے تو علمِ فطرت کے

سامنے ہی عاجز کئے گئے تھے۔ جس میں "علم طب" (الادویہ) علم الطبیعات۔ علم الکیمیا۔ حیاتیات حیوانیات۔ فلکیات۔ الارضیات (علم طبقات الارض) زراعت۔ اور انجنئرنگ وغیرہ وغیرہ قسم کے علوم شامل ہیں اور یہی وہ علوم ہیں جن کی بدولت انسان توپ۔ ٹینک، ہوائی جہاز، بجلی، آٹم، ہائیڈروجن وائرلیس، ریڈیو۔ تار برقی۔ ٹیلیفون۔ ٹیلیویژن اور سائنس کی دوسری ایجادات کرتا رہتا ہے۔ اور جو انسان کے لئے تو ضروری تھیں۔ مگر فرشتوں کے لئے ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لہذا انسان کو تو ودیعت کئے گئے اور فرشتے محروم رہے۔

پس یہی وہ علوم آدمیت ہیں جو فطری طور پر آدم کو ودیعت کئے گئے تھے اور جو سفا کی اور فسادی ہونے کے باوجود ہر آدمی ان علوم کو حاصل کرنے کی فطری صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر علم نبوت فاسق و فاجر شخص ہرگز حاصل نہیں کر سکتا واللہ لا یھدی القوم الفاسقین ۔ اللہ تعالے فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتا ۔ لا ینال عھدی الظالمین " ظالم لوگ امامت وقیادت کے حقدار ہرگز نہیں ہو سکتے لا یمسہ الا المطھرون ۔ پاک لوگوں کے سوا

اسے کوئی مس بھی نہیں کر سکتا۔

ہدایت خداوندی دراصل وہ نظام زندگی (شریعت) ہے جو خداوند تعالیٰ نے انسانوں کو امن و سلامتی سے رہنے کے لئے اپنے خاص بندوں (پیغمبروں) کے ذریعے بھیجا ہے تاکہ انسان کے ضمیر میں جو صفائی اور خدا دی ہونے کا فطری مادہ موجود ہے وہ خدا اور رسولؐ کی فرمانبرداری اور اطاعت کے باعث ابھار ہے اور تاکہ وہ آپس میں امن و سلوک سے رہ کر تعمیر انسانیت کے لئے کوشاں رہ سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۞ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (البقرہ ع ۲۶)

ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقہ پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اُن میں اختلاف رونما ہو گئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے "بشرین" اور کجروی کے نتائج سے ڈرانے والے "منذرین" تھے اور اُن کے ساتھ کتاب برحق بھیجی تاکہ لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے اُن کا فیصلہ کر دیں۔

آیت مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسانوں میں

اختلافات رونما ہوتے تو پیغمبروں کے آنے کی ضرورت نہ
رہتی۔ پس انسان کا اصل نصب العین علم فطرت کے ذریعے
تعمیرِ انسانیت کرنا ہے۔ شریعتِ خداوندی اُس کا لائحۂ
عمل ہے۔ اگر وہ شریعتِ خداوندی کے بغیر اپنی زندگانی
گزارنے کیلئے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے گا تو اُس کے
اندر جو سفاکی اور فسادی مادہ موجود ہے وہ اُسے گمراہی میں
ڈال کر حصولِ نصب العین سے قبل ہی ہلاکت میں ڈال دیگا۔ جیسے
وہ ایٹم اور ہائیڈروجن تو ایجاد کر لیگا۔ مگر یہی ایجادات
اُس کی ہلاکت کا موجب بن جائیں گی جیسے کہ آج ہو رہی ہیں
اور اگر وہ شریعت خداوندی کو اختیار کرے تو خداوند تعالیٰ
اُسے ایسی نیکی کے راستے پر ڈال دیگا کہ وہ ایٹمی توانائی سے دنیا
کو طاقت دینے کا موجب ہوگا اور اپنی تمام ایجادات کو
انسانیت کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرے
آج امریکہ۔ روس۔ اور دیگر غیر اسلامی ممالک علم
فطرت کی بدولت دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ مگر علم شریعت یعنی
دینِ فطرت سے محروم ہونے کے باعث اپنی ہلاکت کا سامان
اپنے ہاتھوں تیار کر رہے ہیں۔ دوسری طرف مسلمان قوم ہے
جن کے پاس دینِ فطرت کامل و اکمل صورت میں موجود تو ہے
اور یہ وہ دینِ کامل ہے۔ جس کو خود خداوند نے "الیوم اکملت"

لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۔ فرمایا تھا ۔ اور جس کے باعث انہیں خیر الامم کا خطاب ملا تھا " کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ " تم وہ بہترین اُمت ہو جو تمام انسانوں کی بھلائی کے لئے اُٹھائے گئے ہو ۔ اور " اُمَّةً وَّسَطًا " اور " شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ " جیسے خطابات سے نوازا گیا تھا ۔ آج خود دین کامل سے ہٹا ہوا ہے ۔ اور تاریخ عالم شاہد ہے کہ جو قوم دینِ فطرت پر عامل اور علمِ فطرت کی عالم نہ ہو ۔ اُس کا خلافت ارضی اور اقوامِ عالم کی امامت و قیادت کے منصب سے یک بینی و دوگوش ہٹائے جانا اور دوسروں کا دستِ نگر بن جانا یا اس صفحۂ ہستی سے ہی مٹ جانا اٹل ہے ۔

مگر افسوس! کہ ہمارے سادہ لوح اور ناسمجھ ملاؤں نے صرف فقہی مسائل ، اور منطقی مباحثوں کو ہی معراجِ علم قرار دیکر ساری کی ساری قوم سے قوائے عمل چھین لی ہیں ۔ اگر ایک بچہ بچپن ہی سے داہنے ہاتھ کی بجائے بائیں ہاتھ کو متواتر استعمال کرتا ہے اور داہنا ہاتھ کبھی استعمال نہیں کرتا ۔ تو بڑا ہو کر وہ کبھی داہنے ہاتھ سے وہ کام نہ لے سکیگا جو اُسے لینا چاہئے تھا ۔ اسی طرح سنیاسی یا جوگی اپنے جسم کے کسی حصے کو کچھ مدت کے لئے بے حرکت رکھتے ہیں ۔ چنانچہ وہ حصہ بالکل

سوکھ کر بے حرکت ہو جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی واقعہ مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ کہ اُن کے علماء نے صرف تقلید ہی کو اپنا شعار بنایا۔ جس کے باعث نہ صرف وہ خود بھی غور و فکر کی صلاحیت کھو گئے۔ بلکہ ساری قوم کو تخیلات، تفکرات تذکرات اور تحفظات کے قوائے عمل سے محروم کر کے رکھ دیا ہے۔ آج ساری مسلمان قوم پر جمود طاری ہے وہ اقوال کی نقال ضرور ہے۔ لیکن خود کسی ایجاد اور تحقیق و تعمل کا مادہ نہیں رکھتی۔ وہ آج لکیر کی فقیر ہے۔ مغربی دنیا کی تقلید ضرور کر سکتی ہے لیکن خود دنیا کے سامنے کوئی نئی چیز پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اور اس کی وجہ صرف اور صرف یہی ہے کہ اُس نے علمِ فطرت سے مُنہ موڑا تو خدا نے تسخیر کائنات کی تمام طاقتیں اُس سے چھین لیں جس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ ساری کی ساری مسلمان قوم غیروں کی دست نگر بن جائے اور جب وہ دوسروں کے محتاج و دستِ نگر بن گئے تو اُن میں شریعتِ اسلامی کے نفاذ کی صلاحیت بھی باقی نہ رہ سکی اور بقولِ شاعر ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم ۔۔۔ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

احسان اور خدمتِ خلق کے سبق کا بھول جانا۔

چوتھی بات جو ہمیں پریشان کر رہی ہے وہ مسلمانوں کے اندر سے احسان اور

خدمتِ خلق کے جذبے کا مفقود ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا (پ ۲۳ ص ع ۳) اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو چیزیں ان میں موجود ہیں ناحق پیدا نہیں کیے۔

اگر ہم اس کائنات کی طرف ذرا غور کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ سورج۔ چاند۔ ستارے۔ آگ۔ پانی ہوا۔ مٹی۔ پتھر۔ پہاڑ۔ اشجار۔ احجار۔ غرض ارض و سما میں جس چیز کی طرف بھی ہماری نگاہ جاتی ہے۔ یا جس چیز میں بھی ہم غور کریں گے اسے ضرور کسی نہ کسی مقصد کو پورا کرنے کا موجب پائیں گے۔ بلکہ اگر ہم ذرا مزید تحقیق کریں تو ہمیں اس مٹی۔ پانی۔ آگ اور ہوا میں بھی بے شمار مخلوق کی موجودگی کا ثبوت ملے گا۔ گو کسی کوئی چیز جاندار معلوم ہو گی اور کوئی بے جان۔ مگر ہر چیز میں کوئی نہ کوئی مقصد چھپا ہوا محسوس ہو گا۔ اور ہر چیز کو کسی نہ کسی خدمت میں مصروف پائیں گے دراصل یہی وہ بات تھی جس کو پا کر قرونِ اولیٰ کا مسلمان بے ساختہ بول اٹھتا تھا کہ "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا" (اے ہمارے پروردگار واقعی تو نے ان کو بے کار پیدا نہیں کیا) علمائے فطرت کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ

وابستہ ہے اسی طرح سورج، چاند، ستارے۔ آگ۔ ہوا پانی سب اس کائنات میں ایک دوسرے کی ممد ہیں اور سب ایک دوسرے کی خدمت میں مصروف ہیں اور اگر یہ سورج چاند۔ ستارے۔ آگ۔ ہوا۔ پانی ایک ذرہ برابر بھی اپنی خدمت گذاری میں کوتاہی کر دیں۔ یا ایک لمحہ بھر اپنی ذمہ داری سے غافل ہو جائیں تو کائنات کا یہ سارا سلسلہ اور یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ لیکن افسوس! صد افسوس کا مقام ہے کہ یہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے خود غور نہیں کرتا کہ آیا وہ کسی خدمت کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے؟ کیا اس کے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں؟ اس کے ذمے کوئی حقوق نہیں کیا بہ عبث پیدا کیا گیا ہے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۝ (قیامت کے روز سوال ہوگا) کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمکو یوں ہی مہمل پیدا کر دیا تھا اور یہ کہ تم ہمارے پاس نہیں لائے جاؤ گے۔

غور کا مقام ہے کہ:۔ یہ عناصر جن سے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ یا جن سے انسان کی پرورش کی جا رہی ہے۔ یعنی تمام کائنات کے تمام اجزا تو خدمت خلق میں مصروف ہیں اور خدمت ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ لیکن کیا انسان محض کھانے

پلنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ کیا وہ غریبوں پر ظلم و ستم ڈھانے اور کمزوروں پر حکمران بننے ہی کے لئے دنیا میں آیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ خاصہ تو درندوں اور وحشی حیوانات کو بھی حاصل ہے۔ پھر اسے اشرف المخلوقات بننے کا کیا حق حاصل ہے؟ اور اگر ایسا نہیں تو غور کیا جائے کہ آخر اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ قرآن فرماتا ہے! وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ط (رعد ۱۷) (مگر جو چیز انسانوں کے نفع کی ہے وہ زمین میں باقی رہتی ہے) (قدرت کا ازل سے یہ دستور چلا آتا ہے) کہ وہ صرف ان اقوام کو دنیا میں باقی رکھتی ہے۔ جو انسانیت کے لئے نفع رساں ہوں۔

علماء فطرت نے جمادات، نباتات اور حیوانات پر مدتوں تجربے کرکے ہمیں یہ بتلایا ہے کہ انسان جن جن چیزوں کی جستجو کرتا ہے۔ قدرت وہی چیزیں اس کے لئے مہیا کرتی رہتی ہے۔ اور جن جن چیزوں کو انسان چھوڑ دیتا ہے۔ قدرت اُسے ختم کر دیتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کیلئے جو انسان روئے زمین انسانوں کے لئے جب تک مفید ثابت ہو۔ تب تک قدرت اسے زندہ رکھتی ہے۔ اور جب وہ کمزور ہو جاتا ہے اور انسانیت کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہونچا سکتا تب قدرت کی اسے دے دیتی ہے اور یہیں فلسفہ بڑھاپے کی موت کا ہے۔ لیکن جو بڑھے نوجوان ہوتے

ہو کر کسی کام سے باز نہیں آتے اُن کی زندگی امید اور اندازے
سے کہیں بڑھ جاتی ہے۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ جو قومیں
جتنی زیادہ خادم خلق اور فیض رساں ہوتی ہیں۔ اُن کی زندگی
اُتنا ہی دوام پکڑتی رہتی ہے۔ اور جو قومیں کاہل و سست
خود پرست اور نفس پرست ہو جاتی ہیں۔ وہ نہ صرف
یہی کہ وہ گوشۂ امارت و خلافت کی مسند سے ہٹا دی
جاتی ہیں بلکہ دوسروں کی غلام اور محکوم بنا دی جاتی ہیں بلکہ
خوار و ذلیل کر کے بعض اوقات نیست و نابود کر دی جاتی ہیں۔
یا انہیں نعمتوں سے محروم کر کے ذلت کلفت میں مبتلا کر دیا
جاتا ہے۔ آپ لوگوں نے بھیک منگوں کو خوب دیکھا ہوگا
کہ اُن کی زندگی کتنی خستگی اور ذلالت کی زندگی ہوتی ہے۔
بسا اوقات ایسے بھی فقیر دیکھے گئے ہیں کہ اُن کی موت کے
بعد اُن کی گدڑیوں سے سینکڑوں روپے نکل آئے ہیں لیکن
دنیا میں وہ ان روپوں سے کوئی فائدہ نہیں لے سکتے۔ وہ بھی
یہ کہ چونکہ وہ پیسے کا [illegible] انسان تھے۔ لہذا قدرت نے
بھی اُن پر اپنی نعمتیں حرام کر دیں۔ کہ وہ روپے ہونے کے باوجود
دنیا کی نعمتوں سے محروم رہ گئے۔ یعنی کمانے کو تو وہ بھی روپے
کما گئے۔ مگر چونکہ وہ انسانیت کو فائدہ نہیں پہنچا سکے تھے
بلکہ انسانیت پر بوجھ تھے۔ لہذا وہ ہزار شرمندگی اُٹھا گئے

بھی خدا کی نعمتوں سے محروم رہے۔ بلکہ قیامت کے دن اُن کے چہروں سے پردہ بھی اُتار دیا جائے گا تاکہ آخرت میں بھی شرمندگی سے اپنا منہ کسی انسان کو دکھا نہ سکیں۔ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے دنیا میں انسانیت کی خدمت سے منہ موڑا تھا۔ لہذا آخرت میں بھی وہ انسان کو منہ دکھانے کے قابل نہ ہوں گے۔

پس دنیا و آخرت کی انعامات کے حصول کا اصل ذریعہ خدمتِ خلق ہے۔ سہ

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد ؎ ہر کہ خود را دید او محروم شد

جس نے انسانیت کی خدمت کی وہ مخدوم ہوا۔ تمام کائنات، جن و انس، ملک اُس کی خدمت گذار ہوں گے۔ اور جس نے اپنے نفس کو دیکھا۔ یا خدمتِ ذاتی سے غافل رہا۔ وہ کائنات کی نعمتوں سے بھی محروم رہے گا۔ قرآن نے ہمیں۔ "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" کہہ کر خیرِ اُمم کے خطاب سے نوازا ہے۔ لہذا ہمارے ذمہ دو اہم ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں اول یہ کہ خیرِ اُمت ہونے کی حیثیت سے تمام انسانیت کی اخلاقی اصلاح کی جائے۔ اور دوسری یہ کہ نفع رسانی کے تمام اسباب مہیا کر کے تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کا مکمل سامان کیا جائے۔

اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ کوئی قوم

سربلندی و عزت اور خیر امم بننے کی صرف اُسی وقت حقدار ہو سکتی ہے کہ جب وہ صحیح معنوں میں فیض رساں اور خادم خلق ہو۔ جو مخازن ومعاونِ ارضی وسماوی کو استعمال میں لا کر رفاہِ عامہ کے لیئے گاڑیاں چلائے۔ دریاؤں پر پل باندھے۔ نہروں اور سڑکوں کا جال بچھا کر معاشی مشکلات کے راستے آسان کر دے۔ سمندروں کی طغیانیاں مسخر کر کے اُنہیں تجارت کے قابل بنائے۔ جو اپنی تلاش وجستجو سے خلقِ خدا کو فائدے پہنچائے۔ جو آبشاروں سے بجلی پیدا کر کے دنیا کو طاقت اور روشنی عطا کرے۔ جو قدرت کے خزانوں کوئلہ اور پٹرول وغیرہ کا صحیح استعمال جانتی ہو۔ جو ایک عظیم ہیبت و قوت کی مالک ہو۔

خیر امم قوم وہی بن سکتی ہے۔ جو عالمگیر علم فطرت بیشتر اسباب قوت۔ اور جاذب القلوب متاع اخلاق کی مالک ہو تاکہ اگر ایک طرف اُن کی شمشیرِ خاراشگاف سے ہفت اقلیم کی شیطانی اور طاغوتی طاقتیں لرزہ براندام ہوں تو دوسری طرف دنیا اُن کے بلند اخلاق کی ثناخواں ہو۔

علماء فطرت کے ہاں خدمت خلق کا جو نظریہ قائم ہے وہ یہ ہے کہ اسلوبِ قدرت کا دائمی مطالعہ کیا جائے۔ یعنی کتب صحیفۂ کائنات کے مطالعہ میں عمریں صرف کی جائیں۔ اُن کی نگاہ اگر کائنات میں مچھر جیسی چھوٹی مخلوق پر پڑے تو اُس کی

تحقیق میں صرف کر دیں اور اُس کی حقیقت کو ظاہر کر کے
دنیا کو "ملیریا" جیسی مہلک بیماری سے نجات حاصل کرنے کے
آلات و ادویات مہیا کئے۔ اگر اُن کی نگاہ عظیم الشان سمندر
کی طرف گئی۔ تو امواجِ بحر کو سفینوں، دخانی اور دیگر قسم کے
بادبانی جہازوں سے مسخر کر لیا۔ مینارہ روشنی تک ایجاد کر لئے تاکہ
سفر کا راستہ آسان ہو۔ پانی کی تہ سے موتی اور مونگا نکالا۔
پانی کے جانوروں تک کی واقفیت حاصل کر لی۔ ہر سال میں تین ارب
(۳،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰) روپے کی مچھلی پکڑ کر دنیا کو جسمانی طاقت
حاصل کرنے میں مدد دی۔ مچھلی کا تیل نکالکر ادویات میں استعمال کیا۔
بڑی کالی مچھلی مثلاً ویل وغیرہ کے چمڑے سے مشینوں کے پٹے بنائے
اور خون کو زخم کے لئے استعمال کیا۔ اور اگر اُن کی نگاہ حشرات
پر پڑی تو جوں، عنکبوت۔ مکڑی۔ شہد کی مکھی۔ زنبور، ٹڈی
دیمک۔ جگنو، پسو۔ کالی بھڑ۔ بیلوں کی مکھی۔ درختوں کی مکھی
اور کتوں کی مکھی تک کا حال معلوم کیا اور اس طرح فلاح و نجات
کے راستے قوموں کے لئے صاف کئے اور دنیا پر ثابت کر دیا۔
کروڑی اقوام آج باعظمت۔ طاقتور۔ اور پرہیبت ہیں جنہوں
نے علم فطرت سے قوانین قدرت کا درس لیا۔ اور کائنات کے
مناظر و حقائق کو ایک حقیقت رس نگاہ سے دیکھا۔
مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج مسلمانوں کے اندر سے

خدمتِ خلق کا یہ جذبہ قطعاً مفقود ہو چکا ہے۔ مسلمانوں میں ہر طرف سے نفسا نفسی کا عالم چھایا ہوا ہے۔ آج ہر شخص اپنی ساری محنت صرف اپنی جان ہی پر صرف کر رہا ہے۔ وہ صبح و شام یہی سوچتا ہے کہ بس میری ہی جان ہے۔ میرا ہی پیٹ ہے۔ میرا ہی واحد نفس سب نعمتوں کا زیادہ حقدار ہے۔ میرے ہی نام سب الاٹمنٹیں ہوں۔ باقی سب مر جائیں میرا پیٹ بھرا رہے۔ میں ہی عزت و حشمت کا مالک بنوں۔ سب کچھ میرے ہی قبضہ میں رہے۔ یہ کارخانے۔ یہ ملیں۔ یہ لیبریں، یہ تجارتیں، یہ صنعتیں۔ یہ موٹریں۔ یہ بنگلے سب میرے ہی ہوں۔ میں ہی سب سے زیادہ فائدہ اٹھا جاؤں۔ میرا ہی نفس پھلتا پھولتا اور موٹا ہوتا جائے۔ غرض انہی خیالات و جذبات و احساسات کے ماتحت اُسے جو کچھ بھی ہاتھ آتا ہے بے ڈکار ہضم کرتا۔ اور "ھل من مزید" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ قوم کا احساس نہیں، وطن کا خیال نہیں، دین کی محبت نہیں۔ اُس کا مقصد روپیہ کمانا ہے چاہے دغا بازی دھوکہ دہی۔ بے ایمانی۔ رشوت ستانی۔ حرامخوری۔ فریبکاری جھوٹ، چوری۔ امانت میں خیانت۔ کم تولنے، کم ناپنے آٹے میں ملاوٹ۔ مرچ مصالے میں ملاوٹ۔ دودھ دہی، گھی اور تمام اشیاء خوردنی ملاوٹ سے ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ یہی اس کا شعار بن گیا ہے

ادنٰے درجے کے لوگوں سے لیکر اعلےٰ سوسائٹی کے افراد تک تمام کئی طرح کے ذہنی، روحانی، سیاسی اور مذہبی جرائم کے ارتکاب میں انسانیت کے نصب العین سے ہٹ کر بہیمیت کے گڑھے میں گرچکے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے کیا خوب فرمایا ہے :- لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ (پ ۳۰ العلق ع ۱) ترجمہ :- ہم نے انسان کو بہت خوبصورت ڈھانچے میں بنایا پھر ہم اُسے پستی کی حالت والوں سے بھی پست کردیتے ہیں۔ سوا اُن لوگوں کے جنہوں نے اللہ کی بات مانی اور اچھے اعمال کئے تو اُن کیلئے اس قدر مزدوری ہے جو کبھی ختم نہ ہو " غیر ممنون " کا لفظ قابل غور ہے۔ سورہ لیٰسین میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :- اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ؕ وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ ۝ (پ ۲۲ لیٰس ع ۱) ترجمہ " بیشک ہم ہی مُردوں کو زندہ کریں گے اور ہم لکھتے جاتے ہیں اُن اعمال کو بھی جن کو لوگ آگے بھیجتے جاتے ہیں اور وہ اعمال بھی جن کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں، اور ہم نے ہر چیز کو ایک واضح کتاب میں ضبط کر دیا تھا " " اٰثارھم " کی تفسیر میں رسول عربی

علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ جس وقت کوئی شخص مرجاتا ہے تو اُس کے نیک اعمال بند ہوجاتے ہیں مگر کوئی صدقۂ جاریہ چھوڑ جائے تو اُس کا ثواب باقی رہتا ہے مثلاً کوئی مسجد، مدرسہ یا کنواں بنا کر چھوڑ جائے یا کوئی علم دین کی ایسی کتاب چھوڑ جائے جس سے لوگوں کو نفع پہونچے۔ یا ایسی نیک اولاد چھوڑ جائے جو اُس کے حق میں دُعائے خیر کرے (مسلم) ان اعمال کو "باقیات الصالحات" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی قوم کے لئے کنواں یا مسجد بنا کر چھوڑ جائے جس کا فائدہ صرف ایک گاؤں کے افراد تک محدود ہوتا ہے اُس کے لئے اتنی بشارت ہے۔ تو اس شخص کے ثواب کے کیا کہنے جو اپنی قوم کے لئے بجلی ایجاد کر کے اُسے روشنی اور طاقت عطا کرے۔ یا کوئی ایسی دوائی ایجاد کرے جس سے قوموں کی بیماریاں دور ہوں۔ یا اپنی تحقیق سے قوم کے لئے پیٹرول کے چشمے، کوئلے اور کروم کی کانیں، تلاش کرے۔ اُس کے ثواب کا کوئی اندازہ ہی قائم نہ ہو سکے گا اور یہی لوگ ہیں جو "اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ" کے مستحق ہیں۔ البتہ ان کے لئے ایمان کی شرط لازمی ہے۔ "اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" جو لوگ صاحبِ ایمان ہیں۔ اُن کو ان خدمات کا صِلہ دنیا و آخرت دونوں میں دیا جاتا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے وہ اپنی اُجرت

دنیا میں ہی حاصل کر لیتے ہیں۔

مگر آہ! مسلمان نے آج ان خدمات سے منہ موڑ لیا ہے اور اُس کی تمام کوشش اپنی ذات تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ اسی لئے آج قوموں کی قیادت و امامت کی باگ ڈور اُس کے ہاتھ میں نہیں اور وہ دوسروں کا دست نگر ہے۔ ان کے علماء اور ان کے سیاسی لیڈروں نے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد اور نفس پرستی کے باعث اُنہیں ذلالت کے گڑھے میں جھونک کر اسفل سافلین کے مقام پر پہنچا دیا ہے۔ آج اُن کا زمیندار۔ کاشتکار دکاندار۔ ٹھیکیدار۔ دیندار۔ دنیادار۔ ماہرفن۔ ڈاکٹر۔ انجنیئر تاجر۔ معلّم۔ عالم۔ غیر عالم۔ سرکاری و غیر سرکاری۔ ملازم علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے ذاتی مفاد۔ نفسانی خواہشات کے محدود اغراض و مقاصد کو پورا کرنے میں مصروف ہے۔ آج اُن میں علماء فطرت کا انحطاط ہے اور وہ "خیر اُمم" کے منصب سے پُر اسرار طور پر اُتارا گیا ہے۔ آہ! اگر اس گھپ اندھیرے میں اُس نے آنکھ نہ کھولی اور اسلام کے اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو اپنے ایمان کے نور سے منوّر نہ کر دیا تو اندیشہ ہے: کہ اس آنے والے انقلابی دور یعنی ہاتھیوں کی جنگ میں اس طرح پیسا جائے۔ کہ کوئی پتہ بھی نہ لگ سکے اور خدائے "واحد القہار" اس کی جگہ کسی اور قوم کو نا تابعوں کی طرح مسلمان بنا کر امامت و قیادت اقوام

اور خدا کی۔ زمین کا وارث بنا دے۔

ساتویں وجہ ہماری **نئی نسلوں کا غلط راہ پر گامزن ہونا**: پریشانی کی یہ ہے۔ کہ ہماری موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے کوئی صحیح لائحہ عمل موجود نہیں ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ کہ قوموں کے عروج و ترقی کا انحصار اُن کی آنے والی نسلوں کے ذہنی ارتقاء، علم و عقل کی بلندی اور بلند اخلاق پر ہے۔ بمعنیٰ دیگر ہمارے مستقبل کے عروج و تنزل کا دارومدار ہمارے اُن بچوں پر ہے جو آج ہمارے زیر سایہ اور زیر تربیت ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا ۱۵ التحریم (پ ۲۸ ع ۱۹) اے ایماندارو اتم اپنے آپکو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔ قرآن ہمیں اپنے آپ کو اور اپنے بیوی بچوں کو آگ سے بچانے کی تعلیم دیتا ہے۔ اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ ہماری جانیں اور ہمارے بچوں کی جانیں کیسے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور قرآن نے کیوں بچوں کی ذمہ داری مومن کی جان کی ذمہ داری کے ساتھ شامل کر دیا ہے

ماہرین نفسیات اور علمائے فطرت نے بچوں کی تربیت اور دیکھ بھال کے متعلق بہت سی کتب لکھی ہیں اور انہوں نے سائنٹیفک تجربوں کی بنا پر ہمیں یہ بتلا دیا ہے کہ "بچے کا دل دماغ اور

زندگی اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے ایک اہم بالشان قومی اور سماجی عمارت کی بنیاد ہے جس کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سہ

خشتِ اول چون نہد معمار کج ؎ تا ثریا مے رود دیوار کج۔

(جب معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھ دیتا ہے۔ تو عمارت اپنی آخری بلندی تک بھی کج ہی رہتی ہے) جدید سائیکالوجی کے بعض مغربی مفکرین کی رائے ہے کہ بچے کی تربیت کا زمانہ اس کے دو برس کی عمر سے شروع ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ ان کی تحقیق یہ ہے کہ بچے کی تربیت کا خیال اُس کی پیدائش کے ساتھ ہی ہونا چاہیئے۔ مگر اسلام بچے کی پیدائش سے بہت پیشتر شکمِ مادر میں آجانے کے ساتھ بلکہ اُس کے والدین کے ہم صحبت ہونے سے قبل کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔ کہ بچے کے والدین کے اُس وقت کے خیالات و ارادات کا اثر بھی مولود یعنی پیدا ہونے والے بچے کی عادات اور اخلاق پر پڑتا ہے۔ جبکہ وہ ایک دوسرے سے ہم صحبت ہوتے ہیں حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر بچے کے والدین کا ہم صحبت ہونا محض نفس پرستی اور عیاشی پر مبنی ہو۔ تو اُس کا اثر بچے کے چال چلن پر بھی ویسا ہی پڑے گا۔ اور وہ بچہ بھی عیاش بنے گا اور شہوانی میلان لیکر آئے گا۔ لیکن اگر وہ قدرت کے

منشا اور فطرت کے احکام اور شریعت کی مطابقت کرتے ہوئے ہم صحبت ہوں۔ تو اُن کے اُن پاکیزہ خیالات وارادات کا پاکیزہ اثر مولود کی طبیعت پر پڑ کر اُسے نیک وسعید بنا دے۔ حرامی بچوں کی پیدائش کو اسلام نے اسی لئے حرام ٹھہرایا ہے کہ اُس کی پیدائش بالخصوص نفس پرستی، عیاشی اور بد چلنی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حرامی بچے کبھی حلال زادوں کی طرح نیک اور ایماندار بن ہی نہیں سکتے۔

بلکہ اسلام نے تو یہاں تک بھی بتلا دیا ہے کہ اگر بچے کے والدین لقمۂ حرام کھانے والے ہوں اور اُس حرام لقمہ سے بچے کا نطفہ بن گیا ہو تو اُس کا بھی بچے پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ آج کل اکثر بچے والدین کی پریشانی کا باعث اسی لئے بنتے ہیں کہ اُن کی پرورش اکل حلال سے نہیں ہوتی۔ اسلام نے اس بارے میں مسلمانوں کو سخت تاکید اور ہدایت کی ہے۔ اور یہاں تک تاکید کی ہے کہ اگر تم نے بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی اُس کو کسی "دایا" کا دودھ پلانا ہو۔ تو دیندار پاکیزہ خصلت اور حلال کھانے والی عورت کا دودھ بچے کو پلایا کرو۔ بلکہ اگر ہو سکے تو بچے کا باپ اُس دودھ پلانے والی دایا کو خرچہ خوراک اپنے پلے سے دیا کرے تاکہ والدین کو یقین رہے کہ ہمارے بچے کی پرورش حلال لقمہ سے ہو رہی ہے۔ یہ

پابندیاں اس لئے لگائی گئی ہیں۔ یا یہ ہدایات اس لئے دیئے گئے ہیں کہ حرام کے دودھ میں بھی کوئی خیر و برکت نہیں۔ لہٰذا آنے والی نسلوں کو اس کے اثر سے بھی بچایا جائے یعنی اسلام نے بننے والی قوم کی اصلاح کا دارومدار آنے والی نسلوں کی دیکھ بھال پر اس طرح رکھدیا ہے کہ شکم مادر میں پڑنے سے قبل اور دودھ پلانے کے زمانے سے لیکر جوان ہونے تک اُن کی اخلاقی و ذہنی تربیت سے لمحہ بھر کی غفلت برتنی گناہِ عظیم کے مترادف ہے۔

لہٰذا ہمیں مستقبل کی آزادی و خوشحالی، اور فلاح و بہبود کی خاطر اپنے بچوں کی دیکھ بھال اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں پر کرنی چاہیئے اور اُن کی صالح تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ قوموں کے عروج کا انحصار آنے والی نسلوں کے ذہنی ارتقاء، علم و عقل کی بلندی، اور اخلاقِ حمیدہ پر ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جو آج ماں باپ ہیں وہ کل بچے تھے اور جو آج بچے ہیں وہ کل ماں باپ بنیں گے اور ان ہی بچوں پر ہمارے مستقبل کے قومی عروج و تنزل کا دارومدار ہے اور بچوں کی تربیت کی یہ عظیم ذمہ داری نہ صرف اکیلے والدین ہی پر پڑتی ہے۔ بلکہ سکولوں کے اساتذہ علماء دین۔ قومی رہنماؤں۔ اور خود حکومت کے عہدیداروں پر

بھی ہے۔

یہ چھوٹے چھوٹے معصوم اور شیرخوار بچے جو آج آپ کو کھلونے نظر آرہے ہیں۔ حقیقت ہے کہ کل کو یہی ہمارے ملک و ملت کے محافظ و نگہبان، بری، بحری اور فضائی بیڑوں کے کماندار ہوں گے۔ جو آج بچے ہیں وہ کل جوان ہوں گے اور ان ہی جوانوں نے اپنے زور بازو سے ملک و ملت کی خدمت کرنی ہوگی۔ دشمنوں کے سامنے ان ہی نے سپر ہو کر میدان کارزار میں لڑنا ہوگا۔ ان ہی نے دشمنوں کی صفوں کا صفایا کرنا ہوگا۔ ان ہی نے ملک و ملت کے لئے جانی و مالی قربانی پیش کرنی ہوگی۔ مگر یہ کب؟ جب ہم بچپن ہی سے ان کے ذہنوں میں ایسی قسم کی روحیں پھونک دیں اور انہیں آزاد قوموں کے خصائل و خصوصیات کی تلقین دیں ان کے اخلاق و عادات کو سدھارنے اور بہتر سے بہتر بنانے کی ابتدا ہی سے فکر کریں۔ ایک اچھے صناع اور دانشمند کاریگر کی طرح ابھی سے اس کچی دھات کو بہتر سے بہتر سانچے میں ڈھالنے کی سعی کریں۔ آج ہماری مثال اس لوہار اور اس کمہار کی مانند ہے جو اپنی کچی دھات یا اپنی کچی مٹی سے جو اوزار یا جو چیز اس کی مرضی ہو بنا لے۔ حضرت امام غزالی نے "احیاء العلوم" میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق

مں باب لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ " بچہ ماں باپ کے پاس ایک
انت ہے، اُس کا قلب ایک جوہر نفیس، سادہ، ہر نقش وصورت
ے خالی اور ہر نقش کو قبول کرنے کے قابل ہے جس طرف اُس کو مائل
جائے وہ اسی طرف کو مڑ جاتا ہے۔ مثلاً اگر اُس کو اعلیٰ اور
یزہ تعلیم دی جائے اور اچھی عادات سکھائی جاویں۔ تو وہ بڑا
کر ایک بڑا خیر اندیش اور اعلیٰ درجہ کا نیکوکار آدمی بن جائے گا۔
دونوں جہانوں کی سعادت سے بہرہ یاب ہوگا۔ اور اس
ب میں اُس کے والدین اُس کے اساتذہ اور اُس کے ادیب
مب شریک ہوں گے۔ اور اگر بچے کو جانوروں کے بچوں کی طرح
نے کھلا، بیکار اور بے تعلیم واہیات چھوڑ دیا جائے گا۔
وہ بڑے ہو کر بڑا " یا وہ گو" بڑا عیاش اور بڑا بدذات ثابت
دگا۔ اور اُن کے اس وبال اور گناہوں میں اُس کے مربی
بھی شریک ہوں گے۔ اسی لئے تو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے
" اے ایمان والو! اپنی جانوں اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے
بچاؤ۔ پس اُن کی حفاظت نار دوزخ سے اس طرح ہے
اُن کو بچپن ہی سے ادب، تہذیب، محاسن اخلاق سکھائے
جائیں۔ بُری صحبتوں سے ان کو بچایا جائے۔"

جدید ماہرین علم النفس بھی اس پر متفق ہیں کہ بچہ جب
پیدا ہوتا ہے۔ تو اُس کا ذہن ایک صاف تختی یا کاغذ کی طرح

ہوتا ہے۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ اپنے ماحول کا رنگ اختیار کرکے ویسا ہی بن جاتا ہے۔ جیسا اُس کا ماحول ہوتا ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے ہے۔ کہ بچے کی فطری صلاحیت علیٰحدہ چیز ہے اور تعلیم کے ذریعے اُس کی خداداد صلاحیتوں سے کام لینا اور اُنہیں اُجاگر کرنا اور ہے۔ گو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی ذہانت اُن کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اُسے کام میں لانے کا فیصلہ عموماً اُسی تعلیم سے ہوتا ہے جو اُنہیں دی جاتی ہے۔ اگر ایک بچہ مسلمان کے گھر پیدا ہوتا ہے اور اسلامی ماحول میں تربیت پاتا ہے۔ تو وہ ایک صحیح مسلمان بن جاتا ہے۔ لیکن اگر وہی بچہ کسی عیسائی ماحول میں پرورش پا جائے اور اُسے تعلیم بھی عیسائیت ہی کی دی جائے۔ تو بڑا ہو کر وہ عیسائی ہی بنے گا۔ اسی طرح اگر کوئی ہندو کا بچہ یا کسی اور ملک کا کوئی بچہ عربوں کے ہاتھ دے دیا جائے اور اُس کی تعلیم و تربیت بھی عربوں ہی میں کی جائے۔ تو وہ عربوں کے رسم و رواج ہی کے مطابق اپنی زندگی بنائے گا اور اُسی کو پسند بھی کرے گا وہ صرف شکل سے ہی عرب نظر نہ آئے گا بلکہ وہ نشست و برخاست بول چال عادات و خصلات میں بھی عرب معلوم ہو گا۔ یہ وہ حقیقت تھی جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "مَن تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُم" کے جملے میں ظاہر کر دیا تھا۔ جو بیٹھا ہو

صدیوں سے ہندوستان میں آباد چلے آرہے ہیں۔ گروہ اپنے آپکو پٹھان یا خان کہلواتے ہیں۔ لیکن اُن کی اُٹھک بیٹھک بول چال، رسم ورواج رنگ، لباس سب کچھ ہندوستانیوں ہی سے ملتی جلتی ہے بلکہ آپ دیکھیں گے کہ اُن کی ہمدردیاں بھی ہندوستانیوں ہی سے وابستہ ہوں گی اور یہی حقیقت اس حدیث شریف کی ہے۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ" (سب بچے ایک ہی فطرت پر پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کے ماں باپ اُنہیں یہودی اور نصرانی بنا لیتے ہیں۔ یعنی جو بچہ یہودیوں کی ماحول میں پرورش پائے گا وہ یہودی بن جائے گا اور جو نصرانیوں کی ماحول میں پرورش پا ئے گا وہ نصرانی بن جائے گا علیٰ ہذا القیاس جو ہندوانہ ماحول میں پرورش پائے گا۔ وہ ہندو بنیگا اور جو اسلامی ماحول میں پرورش پائے وہ مسلمان بن جائے گا۔

بعینہ یہی مثال فاسق و فاجر اور حرامخور والدین کی اولاد کی ہے اگر ماں باپ حرام لقمہ پہ گذر اوقات کرتے ہیں تو اُن کے بچوں کا حرامخور اور حرامی بن جانا لازمی ہے۔ اسی طرح اگر ماں باپ نفس پرستی اور عیاشی کا شکار ہوں تو اُن کی اولاد کا نفس پرست اور عیاش بننا بھی لازمی ہے (اِلَّا ماشاءاللہ) اور ان بچوں کے گناہوں میں اُن کے والدین بھی ان کے ہمراہ شریک ہوں گے۔ کیونکہ

انہوں نے ہی اُن کی پرورش اس طرز پر کی تھی کہ وہ بدمعاش بن گئے
اسی حقیقت کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا ہے: "وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ" خواہ مخواہ اُٹھاویں گے یہ (مجرم) لوگ اپنے اپنے بوجھ کے ساتھ کتنے اور بوجھ بھی۔ یعنی بُرائی پھیلانے والے لوگ یا گناہوں میں اوروں کو مبتلا کرنے والے لوگ اپنے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ ساتھ اُن لوگوں کے گناہ کا بوجھ بھی اپنے اوپر ڈالیں گے جن کو انہوں نے بُرائی میں مبتلا کیا تھا۔

بارہا تجربے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اگر ایک خاندان یا گھرانے کے بڑے بڑے لوگ بُری عادتوں کا شکار ہو جائیں۔ تو اُن کی اولاد بھی ضرور اُن سے متاثر ہوتی ہے۔ اور اس طرح یہ برائیاں وبا کی طرح ساری قوم میں پھیل جاتی ہیں کیونکہ بُرائی کی مثال متعدی بیماری کی طرح ہے جو چھوت چھات سے ایک دوسرے کو لگ جایا کرتی ہیں۔ علماء طب اسبات پر متفق ہیں کہ بعض بیماریاں موروثی طور پر خاندانوں میں چلی آتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک خاندان کا ایک فرد اپنی بدفعلی کے باعث آتشک کی مہلک بیماری کا شکار ہو جائے تو یہ بیماری اُس کی اولاد میں بھی پشت در پشت چلتی رہتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی غفلتوں اور بے احتیاطی کے باعث تپ دق کے مرض کا شکار ہو جائے تو یہ بیماری بھی اُس کے سارے خاندان میں پھیل جاتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جب قوم کے بڑے بڑے

لوگ بری عادتوں کا شکار ہو جاتے ہیں تو پھر ان کی اولاد بھی ان ہی کے
نقش قدم پر گامزن ہو کر انہی برائیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس
حقیقت کو قرآن یوں واضح کرتا ہے۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا
فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكَابِرَ مُجْرِمِيهَا لِيَمْكُرُوا فِيهَا ۖ وَمَا
يَمْكُرُونَ إِلَّا بِأَنفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُونَ۔ سپ ۸

(اس سے پہلے کفار کا ذکر ہے جن کو شیطان اپنے اعمال مستحسن
کر کے دکھاتا ہے) ترجمہ آیت :۔ اور اسی طرح ہم نے مسند اقتدار
دی ہر قریہ میں وہاں کے اکابر (رئیسوں) کو (جرائم کی ارتکاب
کے باعث) اس طرح مجرم ٹھہرایا کہ وہ وہاں شرارتیں کیا کریں اور وہ
لوگ اپنے ہی ساتھ شرارت کر رہے ہیں مگر وہ اس کا شعور نہیں
رکھتے۔

یعنی جب بڑے لوگ جرائم کا ارتکاب کر کے شرارتوں کی
بنیاد رکھ دیتے ہیں تو ان کی اولاد بھی ان ہی کے نقش قدم پر چل کر
خود ان کے لئے باعث صد پریشانی و رسوائی کا سبب بنتی ہے۔ اور
وَمَا يَشْعُرُونَ سے یہ مراد ہے کہ وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے
کہ جن جرائم کا ارتکاب آج ہم کر رہے ہیں ان کو کل ہماری اولاد
بھی کرے گی اور بڑے ہو کر ہمارے لئے ہی ذہنی پریشانیوں کو بڑھا دے گی
اور یہی مقصد وَمَا يَمْكُرُونَ إِلَّا بِأَنفُسِهِمْ کا ہے کہ وہ
اپنے ہی ساتھ مکر کر رہے ہیں۔ اور بسا اوقات یہی برائیاں لاعلاج۔

اور وبا کی طرح ساری قوم میں پھیل جاتی ہیں۔ اور پھر یہی برائیاں ساری قوم کی ہلاکت کا باعث بن جاتی ہیں جس کی طرف قرآن نے یوں اشارہ فرمایا ہے۔ سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِندَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ (الانعام ۱۵۴) سو عنقریب (زمانہ قریب یعنی دنیا ہی میں) ان لوگوں کو جنہوں نے جرم کیا۔ اللہ کے ہاں سے ذلت ملے گی اور خود ان کی اپنی شرارتوں کی پاداش میں انہیں سخت سزا دی جائے گی۔ اسی کو سورہ بنی اسرائیل میں زرا تفصیل کے ساتھ یوں واضح کیا گیا ہے۔ مَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۗ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ۞ وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا ۞ پ ۱۵ ترجمہ: جو شخص راہ راست پر چلا وہ اپنی ہی نفع کے لئے سیدھی راہ چلتا ہے۔ اور جو شخص بے راہی کرتا ہے۔ سو وہ بھی اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ اور کوئی کسی کا بوجھ ہلکا نہ کر سکیگا۔ اور سزا نہیں دیتے ہم جبتک کسی رسول کو نہیں بھیج لیتے اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش عیش لوگوں کو حکم دیتے ہیں۔ پھر وہ لوگ نافرمانیاں کرتے ہیں۔ وہاں شرارت مچاتے ہیں جب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے۔ تب ہم اس بستی کو تباہ اور غارت

کر ڈالتے ہیں۔

آج ہمارے بچوں کے اندر آزاد اقوام کے بچوں کی طرح نہ وہ زندگی ہے اور نہ ہی وہ گرم خون، نہ ہی اُن میں وہ اخلاق ہے اور نہ وہ شعلہ فگن روحیں۔ جن سے اگر ایک طرف کفار ایک ماہ کی مسافت پر مرعوب و مغلوب ہو جایا کرتے تھے۔ تو دوسری طرف خود اُن کو اتنے با اخلاق اور امانت دار سمجھتے تھے کہ دور دور سے اپنا مال لا لا کر ان کی حفاظت میں دیتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُس وقت ہمارے اسلاف ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اور اب طویل مدت کی غلامی سے ہماری ذہنیتیں اس قدر پست کر دی ہیں۔ کہ مغربی تقلید کے بغیر ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ اور اس اندھی تقلید کا ہماری قوم اور ہمارے بچوں پر جو اثر ہوا ہے وہ ہم خود دیکھ رہے ہیں کہ آج ہماری قوم کا ہر چھوٹا بڑا فرد انگریز کے رنگ میں رنگا ہوا نظر آ رہا ہے۔ فلمی دنیا سے وہ اس قدر متاثر ہو چکا ہے کہ ہمارا ہر لڑکا دلیپ کمار اور اشوک کمار بننا چاہتا ہے۔ اور ہماری ہر لڑکی نرگس و نسیم بننا چاہتی ہے۔ بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ ہمارے لڑکے اور لڑکیوں پر تو آج کل عشق کا بھوت ہی سوار ہو گیا ہے۔ تو بھی بے جا نہ ہو گا۔ علامہ ابو الاعلیٰ مودودی صاحب اپنی کتاب پردہ میں مغربی تہذیب پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"صنفِ مقابل کے لئے مقناطیس بننے کی خواہش عورت میں اتنی
بڑھ گئی ہے۔ اور اتنی بڑھتی چلی جا رہی ہے کہ شوخ و شنگ
لباسوں، غازوں، پوڈروں، سرخیوں اور بناؤ سنگھار کے نت نئے
سامانوں سے اس کی تسکین نہیں ہوتی بیچاری تنگ آکر اپنے کپڑوں
سے باہر نکلی پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات تار تک تن پہ نہیں
رہنے دیتی۔ اِدھر مردوں کی طرف سے ہر وقت ھل من مزید
کا تقاضا ہے۔ کیونکہ جذبات میں آگ لگی ہوئی ہے وہ حسن کی سر
بے حجابی پر بجھتی نہیں بلکہ اور زیادہ بھڑکتی ہے اور مزید بے حجابی
کا مطالبہ کرتی ہے۔ اِن غریبوں کی پیاس کچھ بڑھتے بڑھتے ہوس
بن گئی ہے۔ جیسے کسی کو لُو لگ گئی ہو۔ اور پانی کا ہر گھونٹ
پیاس کو بجھانے کے بجائے اور بھڑکا دیتا ہو۔ حد سے بڑھی
ہوئی شہوانی پیاس سے بے تاب ہو کر بیچارے ہر وقت ہر
ممکن طریقے سے اس کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔
یہ ننگی تصویریں۔ یہ جنسی لٹریچر۔ یہ عشق و محبت کے افسانے۔
یہ عریاں اور جوڑ دار ناچ۔ یہ جذبات شہوانی سے بھرے
ہوئے فلم آخر کیا ہیں"؟ یہی وجہ ہے کہ خود ہمارے ہی بچے
ہمارے لئے روز بروز باعثِ صد پریشانی بنتے جا رہے ہیں
آج والدین کے لئے۔ اُن کے بچے ایک دائمی فتنہ کی صورت
اختیار کر چکے ہیں اور اکثر والدین اپنے ہی بچوں کے ہاتھوں مصیبتوں

اور غلم الجون مبتلا ہیں

ایک وہ بھی وقت تھا کہ مسلمانوں کے پیچھے ایک طرف
قومتاع اخلاق کے مالک تھے اور دوسری طرف سپاہیانہ
زندگی اور مردانگی اُن کا شعار بن چکا تھا۔ اور چاردانگ عالم
میں اُن کا اتنا رعب جم گیا تھا کہ کفار اپنے فولادی قلعوں میں بھی اُن
رعشہ براندام تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ محمد بن قاسم نے جو فوجی
دستہ اپنی مسلمان بہن کو کفار کے پنجوں سے آزاد کرانے کے لیے
تیار کیا تھا اُس میں خود محمد بن قاسم کے سوا جو سترہ اٹھارہ سال
کی عمر کا تھا باقی کوئی لڑکا تیرہ سال سے بڑا نہ تھا۔ مگر جب ان
بچوں کا یہ دستہ حجاج بن یوسف کی خدمت میں بہ ایں جذبہ لیکر حاضر ہوا
کہ ہم اپنی مسلمان بہن کو کفار کے پنجوں سے آزاد کرانا چاہتے
ہیں۔ تو اُس نے نہ صرف حجاج بن یوسف کو مسلمان لڑکی کی اُس
آواز پر جبکہ اُس نے کفار کے قبضہ میں ہوتے وقت "المدد یا
یا حجاج" بالجہر پکارا تھا "لبیک لبیک یا بنتی"
حاضر ہوں حاضر ہوں اے میری بیٹی" کہنے پر مجبور کر دیا۔ بلکہ تمام
عرب قوم کے سرداروں میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اور آن کی
آن میں تمام عرب قوم ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے میدان
میں نکل آئی۔ واہ اسلام زندہ و پائندہ باد۔ کہ تو نے مردہ
ونیم مردہ اقوام میں بھی کیا مردانگی کی روح پھونک دی تھی کہ جب تک

ننھے ننھے بچوں کو بھی وہ غیرت و حمیت عطا کی کہ جس کے باعث ان کے نام رہتی دنیا تک زندہ رہ گئے۔

افسوس ہے کہ آج ہم بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ جبکہ چالیس ہزار معصوم و بے گناہ مسلمان لڑکیاں ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم تلے کراہ رہی ہیں۔ اُن میں بھی تو آخر ایسی لڑکیاں ہوں گی جنہوں نے بار بار مجاہدینِ اسلام کو پکارا ہوگا۔ اپنے نوجوان بھائیوں کو پکارا ہوگا۔ اور بہت سی ایسی مظلوم و مصیبت زدہ بچی ہوں گی جو آج تک مسلمان مجاہدین کی راہ تک رہی ہوں گی۔ اور خدا سے بار بار یہ دعا مانگ رہی ہوں گی۔ کہ اے ہمارے اللہ ہمکو اس بستی سے نکال لیجئے جس کے رہنے والے بہت بڑے ظالم ہیں۔ اے اللہ تو اپنی جانب سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر۔ مگر اُن بیچاریوں کو کیا معلوم ہے۔ کہ جن جوانوں سے انہوں نے امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ جن کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سننے کے لئے اُن بیچاریوں کے کان بج رہے ہیں۔ جن کا انتظار میں وہ بیچاریاں راہ تک رہی ہیں مگر وہ نوجوان یہاں دلیپ و اشوک بنے پھرتے ہیں۔ وہ پاکستان اگر رنگ رلیوں میں مبتلا ہو چکے ہیں جیسے صد حیف اُن نسلوں پر جو غیرت و حیا سے خالی ہوں۔

مسلمانو! یاد رکھو! یہ قصور ہمارے بچوں کا نہیں۔ بڑوں کا ہے۔ خود ہمارا ہی قصور ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

کیا خوب فرمایا ہے۔ ھِیَ اَعْمَالُکُمْ تُرَدُّوْنَ عَلَیْکُمْ
یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جا رہے ہیں۔ ہمارے
بچے آج بھی خالد و طارق اور محمد بن قاسم بن سکتے ہیں۔ ان میں
آج بھی وہ مادہ موجود ہے۔ کہ دنیا کی قیادت و امامت کی باگ
ڈور اپنے ہاتھوں میں لے سکیں۔ ؎

نہیں اقبال نا امید اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

آٹھویں بات جو باعث

عورت افراط و تفریط کا شکار :-

صد پریشانی ہے وہ عورت کے موجودہ دور میں پیدا شدہ پیچیدہ مسائل ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ عورت کی گود ہی نبیین صدیقین، شہداء، و الصالحین اور دنیا کے بڑے بڑے جنرل فلاسفر۔ ماہرین فن اور رہنمایان قوم کی اولین پرورش گاہ ہے، اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا میں اکثر فتنے اور تباہ کاریاں عورتوں ہی کے باعث وجود میں آتی ہیں۔

ابتدائے انسانیت میں سب سے پہلا فتنہ جب آدم پر مقدر ہوا تو عورت ہی کو اس کا ذریعہ بنایا گیا۔ جب کہ اس نے شیطان کی باتوں میں آکر خود بھی شجر ممنوعہ کھایا اور آدم علیہ السلام کو بھی کھلایا۔ دنیا میں سب سے پہلی لڑائی ہابیل اور قابیل نے لڑی جس کی وجہ بھی یہی ذات شریف تھی اور جب خدا نے چاہا کہ

دو فرشتوں ہاروت و ماروت کو سزا دے تو اُس کا سبب بھی عورت ہی کو قرار دیا۔ آج بھی ان تمام فتنوں اور اخلاقی خرابیوں کے تمام اسباب کا ذریعہ عورت ہی بنی ہوئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب عورت بنتی ہے تو قومیں بھی تعمیر و ترقی کی منازل طے کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ لیکن جب بھی عورت بگڑتی ہے تو قومیں بھی تباہی و تنزل کے عمیق غاروں میں گر کر ختم کر دیتی ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ عورت ہی وہ بنیاد ہے جس پر قوموں کی عمارتیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ اگر عورت کی اصلاح ہو جائے تو آنے والی نسلیں یعنی آئندہ بننے والی قوم بھی ضرور صالح ہو گی اور اگر عورت بگڑ جائے تو آئندہ بننے والی قوم کا بگڑ جانا بھی اٹل ہے۔ ہماری آنے والی نسلوں کے لیے جب تک اُن کی پہلی تربیت گاہ یعنی ماں کی آغوش کی صحیح اصلاح نہ کی جائے گی تب تک نہ ہم خالدؓ و طارقؒ جیسے فرزندانِ اسلام پیدا کر سکیں گے (کہ جن سے ایک طرف تو دشمنانِ اسلام اپنے فولادی قلعوں میں لرزہ بر اندام تھے اور دوسری طرف دنیا اُن کے محاسنِ اخلاق کی ثنا خوان تھی) اور نہ ہی اپنی اولاد کو آزاد اقوام کے بچوں کے دوش بدوش کھڑا کر دینے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ کیونکہ ماں کا دودھ دراصل ماں کے جذبات، احساسات، اور

اخلاق کے اثرات کو لیکر بچے کی پرورش کرتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے میدان کربلا میں اپنے آخری خطبے میں فرمایا کہ :۔ یہ اُس پاک ماں کے پاک دودھ کا اثر تھا کہ جس نے مجھے اس فانی دنیا کی فانی توقعات سے بچایا اور حق و باطل کے معرکے میں حق پر ثابت قدم رکھا اور جس کے باعث آج میں سرخرو ہو کر اس دنیا سے جا رہا ہوں " غرض یہ کہ ماں جس ایمان و اخلاق کی مالک ہو گی بچے بھی اُسی ایمان و اخلاق کے مالک بن جاتے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا عورت کی اصلاح اُس وقت تک ممکن ہے ؟ جبتک کہ یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ قومی تعمیر میں عورت کی حیثیت کیا ہے ؟ عورت کو مرد کے مشن پیدا کرنے سے خدا کا مقصد کیا تھا ؟ خلافت ارضی میں مرد کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ عورت کی ذمہ داریاں کیا ہیں ؟ کثرت ازدواج سے قرآن کا اصل منشا کیا ہے ؟ حقوق نسوان از روئے قرآن کیا ہیں ؟ حقوق زوجین کیا ہیں ؟ قوامم سے قرآن کا مقصد کیا ہے اسلام میں پردہ سے کیا مراد ہے ؟ موجودہ قسم کے برقعہ کی حقیقت از روئے اسلام کیا ہے ؟

اور اسی سے متعلق دوسرے سوالات ایسے ہیں کہ جن کے باعث مرد اور عورت دونوں آج سخت پریشان ہیں۔ بلکہ ہر دو فریق کی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ خود غرضی

دنفس پرست لوگوں نے ایک طرف تو عورت کو آزادی نسواں کی آڑ میں اخلاق حمیدہ اور حدود خداوندی سے نہایت چالاکی کے ساتھ ہٹا کر ساری کی ساری قوم کو اُن کے سنہری جالوں کے ذریعے شہوت رانی۔ بے حیائی اور بے غیرتی کا شکار کردیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی رنگ رلیوں، ہمارانہ چالوں۔ اور کمیونزم کے رنگین خوابوں نے صنف نازک کو شہوت رانی اور تعیش کی خاطر ایسی خطرناک راہوں پر ڈالا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے لئے ہی ہلاکت و تباہی کا موجب بن رہی بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی عذاب لانے کا سامان اپنے ہاتھوں تیار کر رہی ہے اور دوسری طرف بعض کوتاہ نظر تنگدل انسانوں نے حقوقِ نسواں کو غصب کر کے مظلوم و بے بس عورتوں کو پردہ کی آڑ میں ورک اسفل کی کال کوٹھڑیوں کا قیدی بنا کر اس قدر مغلوب و مرعوب بنا دیا ہے کہ وہ بیچاری حیوان ناطق ہوتے ہوئے کبھی منہ میں زبان نہیں رکھتیں۔ یا اُنہیں زبان کھولنے کی مجال تک نہیں۔ بقول شاعر ؎

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

غرض یہ کہ بعض مسلمان عورتیں تو امریکہ، انگلستان، روس، فرانس اور دوسری یورپین اقوام کی تقلید میں اتنی تیز گام ہیں۔ کہ حدود شریعت

و شرافت اور اخلاق کو بھی پھاند چکی ہیں۔ اور بعض بیچاری اپنے گھروں کے قید خانوں میں غلامی در غلامی کی زندگیاں بسر کر رہی ہیں۔ مگر کمال یہ ہے کہ جو حد سے باہر نکل چکی ہیں وہ بھی مردوں کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہیں۔ مردوں ہی میں مقبولیت حاصل کرنے کی خاطر نت نئے طریقوں سے عریاں ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اور جو بیچاری مغلوب و مرعوب ہیں وہ بھی مردوں ہی کے ہاتھوں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ اسطرح جہاں پہلی قسم کی عورتیں جن میں فاحشہ، بدکردار اور بدچلن عورتوں کی اکثریت ہے۔ زانی، شرابی فاسق۔ فاجر۔ چور۔ ڈاکو۔ راشی مرتشی۔ خود غرض۔ بے غیرت اور اسی قسم کے بچے پیدا کر رہی ہیں۔ وہاں دوسری قسم کی عورتوں سے پیدا ہونے والی اولاد۔ احساس کمتری۔ غلامانہ ذہنیت، بزدلی۔ نامردی اور کاہلی جیسی مہلک بیماریوں کا شکار ہیں (الا ماشاء اللہ) اس کا فطری نتیجہ تو یہی ہوتا ہے۔ کہ ایک طرف آزاد اقوام کے بچے شاہراہ ترقی پر گامزن ہوں گے اور دوسری طرف ہم روز بروز ذلت و تنزل کے گڑھوں میں گرتے جائیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے عورتوں کے متعلق ایک دو نہیں کئی درجن بڑی بڑی کتابیں تو لکھ لی ہیں۔ بڑے بڑے مضامین اخبارات میں شائع کرا رہے ہیں مگر کوئی ایسا فرد یا جماعت نظر نہیں آتی کہ جو مردوں اور عورتوں کے درمیان پیدا شدہ ان پیچیدہ مسائل کا

کوئی صحیح اور بہر دو فریق کو قابلِ قبول حل پیش کر سکے تاکہ ایک طرف تو اُن مظلوم اور بے بس عورتوں کو قرآن و سنت کے مطابق حقوق نسواں دلا کر کال کوٹھڑیوں کی قید سے آزاد کر دیا جائے اور دوسری طرف یورپ کی تقلید میں اخلاق و شرافت کی حد سے نکلنے والی عورتوں کی اصلاح کر کے اسلام کے بتلائے ہوئے صحیح دستور چلایا جائے تاکہ وہ تعمیر النسائیت میں ممد بن کر آنے والی نسلوں کے لئے صحیح بنیاد رکھ سکیں۔

اخلاق انسانی کا دیوالہ: دوسری بات جو ہمارے لئے باعث پریشانی ہے وہ ہماری قوم کے اخلاق کا روز بروز گرتے جانا ہے۔ تاریخ اقوام عالم اس بات پر شاہد ہے کہ بلند اخلاق کے بغیر نہ صرف یہ کہ کسی قوم کا اقوام عالم کی امامت و قیادت کو اپنے ہاتھ میں لینا محال ہے۔ بلکہ اخلاقِ رذیلہ کے باعث اُس کا امامت و قیادت کے منصب سے یک بینی دو گوش ہٹائے جانا بھی اٹل ہے۔ غرض یہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا دارومدار اُن کے اخلاق پر ہے۔

لیکن اس تاریخی حقیقت کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ قوموں کا اخلاق دن بدن گرتا چلا جا رہا ہے بد اخلاقی کا طوفان روز افزوں ترقی پر ہے۔ غنڈہ گردی۔ فسق و فجور۔ زناکاری۔ شراب خوری۔ رشوت ستانی اور طرح طرح کی حرام خوری کو

بازار گرم سے گرم تر ہوتا جا رہا ہے۔ بے غیرتی اور کمینگی عام ہو رہی ہے جا بجا بدمعاشی کے اڈے کھلے ہوئے ہیں۔ قتل و غارت کے واقعات ترقی پر ہیں۔ جعلسازی اور چوری سے عوام الناس پر آئے دن تباہی رہی ہے۔ اغوا، لوٹ مار، اور مسلح ڈکیتیوں کی داستانوں سے روزانہ کے اخبارات بھرپور نظر آتے ہیں۔ عدالتوں میں مقدمات بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ وکیلوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ کے باوجود اُن کی فرصت کے اوقات کم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جیلوں میں قیدیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان سب سے بڑھ کر جو بات باعث صد پریشانی بنتی جا رہی ہے وہ ہے ان جرائم کی بدولت جنسی بیماریوں کا روز افزوں اضافہ ہونا۔ اقوام عالم کے تمام ڈاکٹروں اور ماہرین امراض خبیثہ کا یہ متفقہ اور متحدہ فیصلہ ہے کہ سوزاک، آتشک اور تپ دق جیسی مہلک بیماریوں کی پیداوار کی اصل وجہ معاشرے میں زناکاری، شراب خوری اور اس قسم کی دوسری بداخلاقیاں ہیں۔ ڈاکٹر ڈائی سن کار ٹر اپنی تصنیف "گناہ اور سائنس" میں لکھتا ہے کہ "ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے محکمہ صحت عامہ کے سابق سرجن جنرل ڈاکٹر تھامس پیران نے سنہ ۱۹۳۶ء میں ایک رسالے میں ایک تاریخی مقالہ لکھا، اس مقالے کو پڑھ کر لاکھوں انسان دم بخود رہ گئے۔ جبکہ ایک بین الاقوامی شہرت کے مالک ڈاکٹر نے پہلی مرتبہ جنسی امراض کے موضوع کو

اسے پاکارانہ سنسرشپ سے آزاد کر دیا۔ جس نے بزعم خویش اسے عام تعلیم یافتہ لوگوں سے چھپا رکھا تھا۔ اس نے دو ایسی بیماریوں آتشک اور سوزاک کو ہر پروپیگنڈا کے آگے رسوائے اشاعت کر دیا۔ جن کا ذکر اخباروں کے اداریوں میں کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ وہ حیران کن حقائق جو سرجن جنرل نے افشا کیے مختصراً درج ذیل ہیں: سنہ ۱۹۳۶ء میں تیس لاکھ سے زیادہ امریکی لوگ آتشک میں مبتلا تھے اور تقریباً نوے لاکھ سوزاک کے مریض تھے۔ مزید براں ہر سال پانچ لاکھ افراد آتشک سے متاثر ہونے تھے۔ اور اس سے تگنے سوزاک سے۔ ہر سال لاکھوں افراد آتشک کی بیماری سے مرتے تھے۔ آتشک سے پاگل ہونے والے لوگوں کی حفاظت پر ہر سال کروڑوں ڈالر خرچ ہوتے تھے ان دونوں بیماریوں سے براہ راست جسمانی اور ذہنی اعتبار سے ناکارہ ہونے والے لوگوں کی تعداد اس قدر ہیبت ناک تھی کہ جس کا تصور بھی محال ہے۔"

کناڈا۔ برطانیہ اور اکثر دوسرے ملکوں میں بھی صورت حال اتنی ہی بری تھی یا اس سے بھی بدتر تھی ڈاکٹر پیران نے جنسی امراض کے بارے میں حق گوئی سے کام لیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ بیماریاں ایسے سماجی طاعون ہیں جو ہر قسم کے پیشہ ور، مذہبی، نسلی اور معاشرتی لوگوں کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ اور اس رفتار سے بڑھ رہی ہیں کہ ان سے قوم کی مجموعی صحت

خطرے میں ہے "

ڈاکٹر ڈائی سن کارٹر لکھتے ہیں کہ اسی اثنا میں سباہ کاری کے متوالوں کی لغت میں ایک نئے لفظ "وکٹری گرل" کا اضافہ ہوا۔ امریکہ کی بحری فوج کے دو ڈاکٹروں نے اچانک اشاعتی نارپیڈو داغ دیئے۔ لفٹننٹ کمانڈر روشن گراد نے نیویارک کے رہنے والوں کو اپنے بیان سے حیران کر دیا کہ دنیا کے سب سے بڑے شہر نیویارک میں طوائف اتنی خطرناک چیز نہیں رہی۔ چار میں تین جہازیوں کو غیر پیشہ ور لڑکیوں سے بیماری لگتی ہے (ہر جہازی خیال کرتے تھے کہ اتفاقاً ہاتھ لگی ہوئی چیز بے ضرر ہوتی ہے) لفٹننٹ کمانڈر بیکلے نے فلاڈلفیا کے اعداد و شمار جمع کئے اور نتیجہ نکالا کہ نوجوان اوباش لڑکیوں کی تعداد بدکار عورتوں سے چوگنی ہے "

اخبار "ٹائمز" کے نامہ نگار مقیم نارفوک نے لکھا کہ پرل ہاربر پر جاپانیوں کے حملے سے پہلے نارفوک میں طوائفوں کی اکثریت پیشہ ور تھی۔ لیکن آج پچاسی سے نوے فیصدی طوائفیں عام فیشن پرست عورتوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں بہت سی چودہ سال یا اس سے کچھ زیادہ عمر کی نوجوان دوشیزائیں ہیں جو بڑی بڑی ملازمتوں کے لالچ میں نارفوک کی طرف کھنچ آتی ہیں۔ یہ نوجوان لڑکیاں ہر ہفتے سینکڑوں کی تعداد میں آتی ہیں زرعی فارموں میں کام کرنے والی اور شہروں میں کلرکی کا کام کرنے والی لڑکیوں کے لئے اپنی پسند کے مرد تلاش کرنے کا یہ بڑا ہی آسان طریقہ ہے "

ڈاکٹر ڈالی سن کا رٹر آگے لکھتے ہیں :- امریکہ کی میڈیکل ایسوسی ایشن نے اپنے جرنل میں ان حقائق کی تصدیق کی اور لکھا کہ پرانی وضع کی طوائف کی حیثیت اب ثانوی ہوتی جا رہی ہے۔ طوائف کی نئی قسم اُنیس بیس سالہ نوجوان فیشن پرست لڑکی ہے۔ درحقیقت جنسی بیماریوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والا ذریعہ یہی نوجوان انہیں میں سے ایک ہے "

بیسر اوفیا نوسس کے اس پار برطانوی میڈیکل ایسوسی ایشن نے بھی اپنے جرنل میں انگلستان سے متعلق اس قسم کے حقائق کا انکشاف کیا اور انگلستان میں جنسی بیماریوں سے متاثر ہونے والے لوگوں کی تعداد اتنی بتائی جتنی کہ مسٹر نیکلے نے ڈاکٹر دنیا کے بارے میں بتائی تھی۔ اس تعمیرانگی رپورٹ کے مطابق اگر طوائف سے ایک مرد کو بیماری لگتی تھی تو "فیشن ایبل اور شوقین طبیعت والی" عورتوں سے چار کو۔ آسٹریلیا کے ڈاکٹروں نے اپنے ملک کے نوجوانوں میں بیماری اس سے بھی کہیں زیادہ بتائی۔ کناڈا کے صاحب اقتدار حضرات نے کھلے بندوں اندازہ لگانے سے گریز کیا۔ لیکن نوجوانوں کے خلاف مقدموں سے متعلق عدالتی کاغذات سے اندازہ لگایا گیا کہ تیرہ سے اُنیس برس کی لڑکیاں ملک بھر میں باقاعدہ گناہ کی طرف مائل ہیں۔

امریکہ کی مردم شماری کے افسر اعلیٰ ڈاکٹر ہابرٹ ڈیل وڈ نے

حال ہی میں انکشاف کیا ہے ۔ کہ امریکہ میں پیدا ہونے والے بارہ بچوں
میں ایک بچہ ولد الحرام ہوتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سکول کے
پہلے درجے میں ہر سال تقریباً ایک لاکھ ستر ہزار ایسے بچے داخل
ہوتے ہیں جو اپنے باپوں کے نام نہیں بتا سکتے ۔ ان میں سے قانوناً
کسی کا کوئی باپ نہیں اور نہ ان کا کوئی گھر نہیں ان بچوں کو عمر بھر ندامت
اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان بے گناہ معصوم بچوں کی
فوج میں روزافزوں اضافے کا المیہ دردناک ہے کہ ڈاکٹر ڈوزن ان
بدنصیب بچوں کی پیدائش کے اندراجات کو سماج کی نگاہوں
سے قانوناً خفیہ رکھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں کوئی
توقع نہیں کہ امریکی قوم بے باپ کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد
میں کمی کر سکتی ہے۔

علاوہ ازیں وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس قدر طلاقیں
ہو رہی ہیں کہ لاکھوں عورتیں اور مرد کسی دوسری عورت کے سابقہ
خاوند، یا کسی دوسرے مرد کی سابقہ بیوی سے شادی کئے ہوئے
ہیں۔ بیشمار بچے زندہ ماؤں کی محبت سے محروم ہیں یا زندہ باپوں
کی بٹی ہوئی محبت ان کے لئے عذاب سے کم نہیں۔ حالانکہ کلیسا
پہلے دن کی طرح آج بھی طلاق کا اسی سختی سے مخالف ہے لیکن
وہ طلاق کے رجحانات کو کم کرنے سے قاصر رہا ہے۔

وہ مزید آگے لکھتے ہیں کہ " شراب نوشی کبھی بد اخلاقی کا

ایک جز وہ ہے موجودہ زمانے ہیں ہمارے ملکوں کے بے شمار لوگوں کی دماغی بیماریوں کا موجب شراب ہے لیکن اس کے تدارک کے لئے کچھ بھی نہیں کیا جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ شراب نوشی ایک خطرناک وبا کی طرح اس قدر عام ہے کہ ہماری حکومتیں اس کی بدولت بے شمار منافع کماتی ہیں۔

غرض مغربی دنیا کے بڑے بڑے ڈاکٹر، سائنسدان اور اعلیٰ دماغ حضرات بہانگ دہل اسباب کا اعلان کر رہے ہیں کہ جنسی امراض، شراب نوشی۔ اولاد حرام۔ اسقاط حمل، طلاق۔ جرائم۔ بچوں اور نوجوانوں کی خطا کاریاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ تاریخ میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ ایک ہیبت ناک اخلاقی بحران، ایک بدمعاشی کا کھونٹ ہماری نظروں کے سامنے نمودار ہو رہا ہے لیکن ان تمام حقائق کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج کا مسلمان یورپین اقوام کی اندھی تقلید میں اسلامی اخلاق کا جنازہ نکالنے پر تلا ہوا ہے۔ خدائی احکام کا تمسخر اڑا رہا ہے۔ زنا شراب۔ عیاشی۔ بے حیائی۔ خودستائی رشوت خوری۔ حرام خوری۔ چغلخوری، بدگوئی۔ فحش کاری۔ جھوٹ۔ افترا۔ خیانت۔ کینہ، بغض و عداوت۔ سرکشی۔ بغاوت۔ تکبر و غرور۔ ظلم و جبر۔ خودغرضی۔ منافقت۔ حیلہ۔ مکر بہانہ دھوکہ۔ رنڈی۔ اوباشی۔ گناہ در یا کاری۔ تمدد حسد دھری۔ نافرمانی بخل اور اسراف جیسی تباہی خصلتوں کا بری طرح سے شکار ہو چکا ہے۔

خشیتِ الٰہی، رضائے الٰہی۔ خلوص، ایثار۔ رقت قلبیہ۔ زہد و تقویٰ، خدمتِ خلق، صبر و قناعت۔ خشوع و خضوع۔ صداقت۔ عدل۔ انصاف، اخوت و مساوات۔ اور رحمدلی و ہمدردی جیسے ملکوتی صفات سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔

آج ہمارے ملک میں شراب خانوں اور عصمت فروشی کے اڈوں کو دکانوں اور چکلوں کے چوہدریوں اور مالکوں کے علاوہ چند امیر اور صاحب دماغ لوگ بھی چلاتے ہیں۔ تاجر، گھرپتی۔ کارخانہ دار۔ ٹھیکیدار اور تفریح گاہوں کے مالک۔ جاگیردار اور صاحب جائیداد لوگ سب بھی اسی بیماری کے شکار ہیں۔ پرائیویٹ قحبہ خانوں اور جوئے کی کوٹھیوں کے دلال ہر وقت ان اڈوں پر موجود رہتے ہیں۔ تانگے والے، ہوٹلوں کے بیرے۔ عام جرائم پیشہ اور نشے کے عادی لوگ سستے اور گھٹیا درجے کے چکلوں۔ سراؤں اور سیاحوں کی قیام گاہوں کے مالک بھی ان میں شامل ہیں۔ اور غضب بالائے غضب یہ کہ صرف ہمارا امیر اور طبقہ ہی ان جرائم کی پشت پناہی نہیں کر رہا بلکہ ہمارے حکام۔ ہمارا عدالتیں۔ جج۔ مجسٹریٹ۔ وکیل اور ہماری پولیس بھی جان بوجھ کر۔ یا بامر مجبوری اس قسم کے مجرموں کی سرپرستی کر رہی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تک ان جرائم کا تدارک نہ کیا جائے اور ان بے حیائی کے اڈوں کو ختم نہ کیا جائے تب تک تو قوم میں اچھے اخلاق کے پیدا ہونے کا امکان ہے؟

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مسلمانوں کی لاپرواہی :-

اور دسویں بات جو میرے لئے باعث پریشانی ہے ۔ وہ مسلمانوں کی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے لا پرواہی ہے ۔ اللہ تعالے فرماتا ہے :- وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (پ ۴ العمران ع ۱۱) ترجمہ :- اور تم میں ضرور کوئی ایسی جماعت ہونی چاہیئے ۔ جو لوگوں کو خیر کے کاموں کے لیئے بلائے اور انہیں بھلی باتوں کا امر کیا کرے اور بری باتوں سے منع کیا کرے ۔ اور ان ہی لوگوں کے لئے فلاح ہے (یعنی ایسے ہی لوگوں کا وجود خدا کے عذاب سے بچ نے کا موجب ہے)

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالے کسی قوم ، ملک ، شہر یا قصبہ پر اس وقت تک کوئی عذاب نہیں بھیجتا جب تک وہاں کے بڑے بڑے لوگ بلکہ وہاں کی اکثریت گناہوں کی مرتکب نہ ہوجائے ۔ اور فطرت کا یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی قوم میں جرائم پیشہ لوگوں کو وہاں کے علماء حق برائیوں سے منع نہ کریں تو وہ گناہ آہستہ آہستہ ان میں پھیلکر ایک وبا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو بعد میں علماء حق کی طاقت سے باہر ہو جاتے ہیں ۔ پس ایسی حالت میں جب اللہ تعالے کسی مصلح کو بھیجتا ہے تو وہ سب سے پہلے ان

علماء و مشائخ کو ہی سخت و سست کہنا شروع کر دیتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج اکثر لوگ اُن ملاؤں اور پیروں سے متنفر ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے غفلت برتا کرتے چلے ہیں اس حقیقت کو قرآن یوں واضح کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کے متعلق ارشاد ہے۔ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (المائدہ ع ۱۱) بنی اسرائیل میں مجرم لوگوں پر لعنت کی گئی تھی داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے۔ اس سبب سے کہ انہوں نے احکام خداوندی کو چھوڑا اور حد سے نکل گئے اور جن برائم کے وہ مرتکب ہوئے تھے۔ اس سے باز نہ آتے تھے واقعی اُن کا یہ فعل برا تھا۔ حدیث شریف میں اس کی تفسیر یوں آئی ہے کہ جو لوگ برائی میں مبتلا ہو جاتے تو منع کرنے والے آج تو اُن کو منع کرتے اور کل خود بھی اُن کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے کھانے پینے۔ جیسے کہ اُنہوں نے کوئی برائی کی ہی نہ ہو نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ منع کرنے والے بھی اُن کے ساتھ منسلک ہو جاتے۔

اس لئے تو رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔

من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فان لم يستطع

فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ (مسلم) یعنی تم میں سے جب کوئی شخص کسی برائی کو دیکھے تو چاہیئے کہ اپنے ہاتھوں سے اُسے روک دے اور اگر ہاتھ سے روکنے کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر زبان سے بھی روکنے کی طاقت نہ ہو۔ تو دل سے یعنی اپنے دل میں اُس کے اس فعل سے نفرت کرے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔ خود اپنی اُمت سے بھی رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے۔ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَاْخُذُنَّ عَلٰی یَدِ السَّفِیْهِ وَلَتَاْطُرُنَّهٗ عَلَی الْحَقِّ اَطْرًا اَوْ لَیَضْرِبَنَّ اللّٰهُ بِقُلُوْبِ بَعْضِكُمْ عَلٰی بَعْضٍ ثُمَّ یَلْعَنُكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ (فی السنن والمسند) قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے کہ تم ضرور اچھی باتوں کا امر کرو اور بری باتوں کو روکو۔ اور چاہیئے کہ بیوقوف مرتکب گناہ کا ہاتھ پکڑ کر اُس کو حق بات پر مجبور کرو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب کو بھی خلط ملط کر دیگا۔ اور پھر تم پر بھی لعنت ہو گی جیسا کہ پہلی امتوں پر لعنت کی گئی تھی۔

اور ایک اور روایت میں ہے:۔ وفی سنن ابی داؤد وابن ماجۃ عن جابر بن عبد اللہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما من رجل

یکون فی قوم یعمل فیھم بالمعاصی یقدرون علی ان یغیروا علیہ ولا یغیرون الا اصابھم اللہ بعقاب قبل ان یموتوا۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ اگر کسی جماعت اور قوم میں کوئی شخص گناہ کرتا ہے۔ اور وہ قوم باوجود قدرت اُس کو نہیں روکتی تو سوا اس کے نہیں کہ اُن پر اُن کی موت سے قبل اللہ تعالے اپنا عذاب بھیج دے گا۔ یعنی دنیا ہی میں انہیں طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کردیگا۔ قرآن کا ارشاد ہے۔ واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ ج واعلموا ان اللہ شدید العقاب ○ (پ ۹ الانفال ع ۳) اور تم اُس وبال سے بچو جو خاص اُن لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں اُن گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں اور یہ جان رکھو کہ اللہ تعالےٰ سخت سزا دینے والے ہیں۔ یعنی اگر کسی قوم میں چند جرائم پیشہ لوگ پیدا ہو جائیں اور نیک لوگ اُن جرائم کو فوراً ختم نہ کردیں تو پھر یہ جرائم اتنے پھیل جاتے ہیں کہ نیک لوگ بھی اُن کی زد میں آجاتے ہیں اور پھر سب قومیں ان جرائم کی بدولت تنزل کی طرف جاتی ہیں۔ تو نیک لوگ بھی اُن کے ہمراہ گر جاتے ہیں یا جب قوموں پر طوفان سیلاب یا زلزلے آتے ہیں تو یہ نیک لوگ بھی اُن کے ہمراہ گرفتار وبال ہو جاتے ہیں۔

اسی لئے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مُرُوْا بالمعروف وانھوا عن المنکر قبل ان تدعوا فلا یستجاب لکم وَقَبْلَ اَنْ تَسْتَغْفِرُوْا فَلَا یُغْفَرُ لَکُمْ اِنَّ الْاَمْرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيَ عَنِ الْمُنْکَرِ لَا یَدْفَعُ رِزْقًا وَلَا یُقَرِّبُ اَجَلًا، اَلَا اِنَّ الْاَحْبَارَ مِنَ الْیَهُوْدِ وَالرُّهْبَانَ مِنَ النَّصَارٰی لَمَّا تَرَکُوا الْاَمْرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيَ عَنِ الْمُنْکَرِ لَعَنَهُمُ اللّٰہُ عَلٰی لِسَانِ اَنْبِیَآئِهِمْ ثُمَّ عَمَّهُمْ بِالْبَلَاءِ ۔ عبد اللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اچھی باتوں کا امر کرو اور بری باتوں سے منع کرو قبل اس کے کہ تم دعا مانگو اور وہ قبول نہ ہو اور قبل اس کے کہ تم استغفار پڑھو اور تمہاری مغفرت نہ ہو یاد رکھو کہ اچھی باتوں کا امر کرنا اور بری باتوں سے منع کرنا روزی کو کم نہیں کرتا اور نہ ہی عمر کے نبیڑے کو پورا کرنا ہے (یعنی کہ تم موت ڈر جاؤ) اور یاد رکھو! کہ یہود کے علماء اور نصاریٰ کے زاہدوں نے جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے انبیاء کی زبان سے اُن پر لعنت کی۔ اور پھر وہ سب کے سب بلاؤں میں مبتلا کر دیئے گئے۔

اور ایک حدیث شریف ہے :۔ اَنَّهٗ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْ لَيُسَلِّطَنَّ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اَشْرَارَكُمْ عَلٰى خِيَارِكُمْ فَيَدْعُوْا خِيَارُكُمْ فَلَا يُسْتَجَابُ لَهُمْ۔ تم ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کرو نہیں تو اللہ تعالیٰ تمہارے شریر اور برے لوگوں کو نیک لوگوں پر مسلط کر دیگا۔ پھر تمہارے نیک لوگ دعا مانگا کریں گے لیکن اُن کی دعا ہرگز قبول نہ ہوگی۔

یعنی جب ایک قوم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی منصب سے گر جائے تو اُن کے دل خلط ملط ہو جاتے ہیں اور برائیاں اتنی غالب ہو جاتی ہیں کہ نیک لوگوں کی طاقت سے باہر ہو جاتی ہیں۔ تب نیک لوگ سوا اسکے کہ دعا ہی مانگا کریں اور کچھ نہیں کر سکتے اور اُن کی دعا اس لئے قبول نہیں ہوتی کہ اُن میں حق بات بیان کرنے کی جرأت تو ہوتی نہیں اور نہ ہی وہ نیکی کو پھیلانے اور برائی کو ختم کرنے کی کوئی جد و جہد کرتے ہیں لہٰذا اُن کے زبانی جمع خرچ کی بھی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ بلکہ حضرت عائشہ رضؓ سے تو یہاں تک بھی روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے تو میں نے چہرہ انور پر ایک خاص اثر دیکھ کر محسوس کیا کہ کوئی اہم بات پیش آئی ہے۔ حضور اقدس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی اور وضو فرما کر مسجد میں تشریف لے گئے تو مسجد کی دیوار سے

لگ گئی تاکہ جو کچھ ارشاد ہو اُس کو سنوں۔ حضور اقدسؐ منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا: "لوگو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ بھلی باتوں کا حکم کرو اور بری باتوں سے منع کرو مبادا کہ وہ وقت آجائے کہ تم دعا مانگو اور میں اسے قبول نہ کروں اور تم مجھ سے سوال کرو میں اس کو پورا نہ کروں اور تم مجھ سے (دشمن کے مقابلہ میں) مدد چاہو میں تمہاری مدد نہ کروں"۔ حضور اقدسؐ نے صرف یہ کلمات ارشاد فرمائے اور منبر سے اُتر آئے۔

"تاریخ اقوام عالم میں جب قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی زندگی پر نظر پڑتی ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان عزت و عظمت شان و شوکت اور دبدبہ و حشمت کے تنہا مالک تھے لیکن جب ان اوراق سے نظر ہٹا کر موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی حالت کا مشاہدہ کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان نہایت ہی ذلت، خواری، افلاس، ناداری اور محتاجی میں مبتلا ہوتے ہوئے جرائم کا مرتکب ہو رہے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ نہ تو خداوندی فرمان "اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ" کے مطابق مسلمانوں میں وہ رعب داب اور شان و شوکت باقی ہے اور نہ "رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" کی قرآنی تفسیر کے مطابق اُن میں اخوت و محبت کی کوئی بو ہے۔ جہاں

قرآن نے مومنین کی تعریف " اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ "
(یعنی وہ مسلمانوں پر بڑے نرم ہوں گے) فرمایا ہے وہاں ہم
مسلمان کو مسلمان کے مقابلہ میں سخت خو پاتے ہیں۔ اور جہاں
" اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ " (یعنی کافروں کے مقابلے میں
بڑے سخت ہوں گے) فرمایا ہے وہاں ہم ان کو کفار کے مقابلے
میں بڑے نرم اور اُلٹے کفار ہی کو سخت دیکھتے ہیں۔

حالانکہ قرآن کے حکم کے بموجب مسلمان کی پہچان
یہ ہونی چاہیئے تھی کہ وہ روئے زمین کے انسانوں کو نیکی کا حکم
دینا اور برائی سے منع کرنا۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ
لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (پ آل عمران ع ۱۲) تم ہی وہ بہترین جماعت
ہو جو تمام انسانوں کی فلاح (بہبود اور اصلاح) کے لئے اٹھائے
گئے ہو کیونکہ تم لوگوں کو نیکی کا امر کرتے ہو اور برائی سے منع کرتے
ہو اور تمہارا اللہ پر ایمان بھی ہے۔

لیکن آج کے میدانِ عمل میں ہمیں کچھ اس کا الٹا ہی نظر
آرہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی دنیا انسانیت کی خدمت
اور فلاح و بہبود کے معاملہ میں زیادہ بہتر طور پر ہم سے کوسوں
دور نکل چکی ہے۔ اور ہم اُن کی نقالی کو باعث صد فخر سمجھتے ہیں
ہم میں اول تو کوئی اصلاحی جماعت ہی موجود نہیں۔ اگر شاذ و نادر

کوئی جماعت پیدا بھی ہو جائے تو اس کی اصلاحی جدوجہد بھی صرف مسلمانوں تک ہی محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ غیر مسلم منکرات میں مبتلا ہوا کریں۔ مگر ہمارے دعاۃ و واعظین مواعظ حسنہ اور اپنی دعوت و تبلیغ سے انہیں محض اس لئے مستثنیٰ قرار دیکر چھوڑ دیتے ہیں کہ ان کے زعم میں جب وہ ان کے دین سے واسطہ نہیں رکھتے تو وہ ان پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بھی حق نہیں رکھتے حالانکہ "اخرجت للناس" کا جملہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں۔ بلکہ تمام انسانیت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حکم کے بموجب برائی سے منع کرنے اور نیک کاموں پر مامور کرنے کا فریضہ مسلمان کو سونپا گیا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ مسلمان آج تک اس اہم فریضہ سے غفلت برتتے رہے۔ اور کوئی ایسی جماعت وجود میں نہ آئی جو ان کو اس عظیم غلطی کا احساس دلاکر اس کے خطرناک انجام سے آگاہ کرتی بالآخر اس کا فطری نتیجہ یہی ہونا تھا کہ کفار میں منکرات پھیل جانے کے بعد مسلمان معاشرہ بھی اس کا شکار ہو جاتا۔ کل جو برائیاں غیر مسلموں میں پائی جاتی تھیں آج وہ سب کی سب مسلمانوں میں متعدی بیماریوں کی طرح پھیل چکی ہیں۔ بلکہ ان کی رگ رگ میں سرایت کر چکی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان قوم "اخرجت للناس"

کے منصب سے ہٹ کر غیروں کی دست نگر اور مقلد بن چکی ہے

اسوہ رسول یا اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم ۱۰

اور گیارہویں بات جس نے مجھے مدت سے پریشان رکھا ہے مسلمانوں کا اسوہ رسول ؐ کو بھلا دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۲۱/۳۳) تحقیق تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں (کامل انسانیت) کا ایک نمونہ ہے:
مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (النساء ع)
جس نے رسول کی اطاعت کی۔ پس تحقیق اس نے اللہ کی اطاعت کی
قرآن کے اطیعوا اللہ کا عملی مفہوم تو فی زمانہ نظر نہیں آتا لیکن کم از کم اعتقاداً تو ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ کلام الٰہی (قرآن) میں لکھا ہوا ہے اسی کی پیروی (اطیعوا اللہ) یعنی خدا کی اطاعت ہے۔ مگر اطیعوا الرسول کو عملاً تو کیا قولاً بھی بہت کم لوگ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کسی سے بھی پوچھا جاتا ہے کہ اطیعوا الرسول سے کیا مراد ہے؟ تو ہر شخص جھٹ فوراً یہ بتلا دیتا ہے کہ یہی قرآن کی پیروی کرو۔ قرآن کے احکام پر چلو یہی اطاعت رسول ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رسول کی زندگی قرآن ہی کے مطابق تھی مگر قرآن میں بعض ایسے نکات ہیں کہ اگر رسول کی زندگی کو ان سے ایک علیحدہ رکھ دیا جائے تو وہ عمل میں نہیں آ سکتے مگر

بھی یہ شبہ رہا ہے کہ جب تک اتباعِ رسولؐ ، اسوۂ رسولؐ ، یا سنتِ رسولؐ کی پیروی نہ کی جائے تب تک قرآن پر عمل کرنا محال بلکہ ناممکن ہے۔ اور یہی مقصد خداوندی۔ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ میں مخفی ہے ورنہ حق تو یہ تھا کہ اللہ تعالےٰ مسلمانوں سے یہ فرما دیتے کہ چونکہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام تم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے لہٰذا تم میں جس نے قرآن کی اطاعت کی گویا اُس نے رسولؐ کی اطاعت کی۔ مگر تعجب ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس کے بالکل خلاف یہ فرما دیا ہے کہ جس نے رسول کی اطاعت کی گویا اُس نے اللہ کی اطاعت کی یعنی قرآن کی اطاعت کو مدغم کر دیا رسول کی اطاعت میں۔ اور پھر فرما دیا کہ مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا جو کچھ تمہیں رسول دے اُس کو اختیار کرو اُسے مضبوطی سے پکڑو اور جس چیز سے وہ منع فرمائے اُسے چھوڑ دو۔ کیونکہ یہاں تک اپنی محبت بھی رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اتباع پر موقوف کر دی اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (آل عمران ع ۴) کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالےٰ سے محبت

کرنا چاہتے ہو تو میری پیروی کرو تب اللہ تعالٰے تم سے محبت بھی کرے گا اور تمہارے گناہ بھی بخش دے گا اور اللہ تعالےٰ بڑی مغفرت والا اور خاص رحمت کا مالک ہے یعنی قرآن کی پیروی تو کیا تمہیں اللہ اور قرآن کی محبت بھی تب نصیب ہو گی جب تم میں پہلے اتباعِ رسول آ جائے اور تاریخ گواہ ہے کہ جو لوگ سنتِ رسولؐ کے پابند نہیں وہ قرآن کی ایک آیت پر بھی عمل نہیں کر سکتے چاہے وہ دن رات اُسے پڑھتے ہی کیوں رہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کسی کتاب کو پڑھنے یا راہ پر چلنے کے لیے آنکھوں کی روشنی کی ضرورت ہے۔ مگر آنکھوں کی روشنی سے انسان تب ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جب اُس کو سورج، چاند، ستاروں، یا کسی اور چیز کی روشنی کی مدد مل سکے ورنہ گھپ اندھیرے میں آنکھوں کو بھی کچھ نظر نہیں آ سکتا یعنی ایک روشنی کے لیے دوسری روشنی بھی لازم و ملزوم ہے۔ تب ہی تو قرآن کا ارشاد ہے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

تحقیق آگیا تمہارے پاس اللہ کی طرف ایک نور (پیغمبر) اور ا
کتاب واضح ہدایت دیتا ہے اللہ اس کتاب کے ذریعے
اس کو جو ان کا (پیغمبر کا) اتباع کرے اللہ کی رضا کی طرف
اور اسلام (نبی کے بتائے ہوئے راستے) کی طرف اور
نکالتا ہے اُن کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف (یعنی ذلالت
کی زندگی سے نکالکر ترقی کی طرف لے جاتا ہے) اور اس کو
سیدھا راستہ بتاتا ہے۔

یعنی خدا اُسی کو ہی سیدھا راستہ دکھائے گا جو اتباع رسول کرے۔ اور قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاءِ سابق سے بھی اللہ تعالے نے یہ عہد لے رکھا تھا کہ اگر تمہارے عہدِ نبوت میں میرا رسول آجائے تو تمہیں اُس پر ایمان لانا ہوگا اور اُس کی نصرت کرنی ہوگی۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ ط قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ ط قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ط قَالَ فَاشْھَدُوْا وَاَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰھِدِیْنَ ۝ فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (پ۳ آل عمران ع ۹)

ترجمہ :- اور جب اللہ تعالٰے نے عہد لیا انبیاءؑ سے کہ جو کچھ
میں تمہیں کتاب اور حکمت میں سے دے دوں پھر تمہارے
پاس ایک رسولؐ آئے جو تصدیق کرے اس کا جو تمہارے
پاس ہے تو تم ضرور اُس رسول پر ایمان لانا اور اس کی نصرت کرنا
فرمایا کہ آیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا وہ بولے
ہم نے اقرار کیا ارشاد فرمایا تم گواہ رہنا اور میں بھی اس پر تمہارے
ساتھ گواہ ہوں۔ سو جو شخص روگردانی کرے گا بعد اس کے
تو ایسے ہی لوگ بے حکمی کرنے والے ہیں۔

در اصل یہ عہد سابق اُمتوں سے بھی اُن کے نبیوںؑ کے
ذریعے لیا گیا تھا۔ کیونکہ جو اہل کتاب ایمان لے آئے اُن کے
متعلق ارشاد ہے :-

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ
یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ
یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ
لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ
عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ
فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ
اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (الاعراف ۱۵۷)

ترجمہ :- وہ لوگ جو اس نبی اُمّی کا اتباع کرتے ہیں۔ جن کو نوشتہ اپنے

اپنے پاس توریت اور انجیل میں (ان صفات کے ساتھ) لکھا ہوا پاتا تھا کہ وہ اُن کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دے گا اور پاکیزہ چیزوں کو حلال کرے گا اور گندی چیزوں کو (جن سے روحانی یا جسمانی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں) حرام کر دیگا اور ان لوگوں پر جو بوجھ (اُن کے خود پرست پیشواؤں اور لیڈروں کے قائم کردہ زائد رسم و رواجات کی صورت ہیں) اور طوق (غیر حق پابندیاں) ہیں گے اُن کو دور کر دیگا پس جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور اُن کی قدر کرتے ہیں اور اُن کی مدد کرتے ہیں۔ اور اُس نور کی بھی پیروی کرتے ہیں جو اُن کے ہمراہ بھیجا گیا ہے۔ تو ایسے لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

یہاں ایک بات اور عیاں ہوگئی کہ قرآن کو بھی اللہ تعالے نے نور کہا ہے۔ اُدھر کتاب واضح کے ساتھ رسول کو نور فرمایا۔ اور اُدھر رسول کے ساتھ کتاب کو نور فرمایا۔ پس اس کی مثال ایسی ہی ہوئی جیسے آنکھوں کی اور چراغ کی کہ راستہ پر چلنے کے لئے آنکھوں کی ضرورت ہے اور آنکھوں کے لئے چراغ یا سورج کی روشنی کی ضرورت ہے تب ہی تو اللہ تعالے نے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ایک جگہ سراجاً منیراً فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝ سپ ۲۲۔ اے نبی بیشک ہم نے آپ کو

اس شان کا رسول بنا کر بھیجا کہ آپ گواہ ہوں گے اور آپ بشارت
دینے والے اور ڈرانے والے ہیں اور اللہ کی طرف اُس کے
اذن سے بلانے والے ہیں اور ایک روشن چراغ ہیں۔

اور صرف یہ نہیں کہ حضور سراجاً منیرا تھے بلکہ قرآن
ہمیں بتاتا ہے کہ جو کوئی رسول کی پیروی کرے گا اُن کو بھی اللہ
تعالیٰ ایک نور عطا کر دیتا ہے جس سے وہ حق راہ پہچاننے
کی تمیز پاتا ہے۔ ارشاد ہے "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا
اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ
وَیَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَیَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ
غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" (الحدید ۴)

ترجمہ: "اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو! اللہ سے
ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ یعنی ان کا اتباع کرو
اور ان کا حکم مانو! اللہ تعالیٰ تم کو اپنی رحمت سے دو حصے
دے گا اور تم کو ایسا نور عنایت کرے گا کہ تم اس کو لئے ہوئے
چلتے پھرتے رہو گے اور جو لوگ سنتِ رسول کی پیروی نہیں
کرتے یا لوگوں کو سنتِ رسول سے ہٹانے کی سعی کرتے ہیں۔
اُن کے متعلق خود قرآن کا حکم سن لیجئے۔ ارشاد خداوندی ہے
وَیَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى یَدَیْهِ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِی اتَّخَذْتُ
مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا ○ یٰوَیْلَتٰى لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ

فُلَانًا خَلِيلًا ○ لَقَدْ اَضَلَّنِیْ عَنِ الذِّکْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِیْ ط وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا

(پ ۱۹ الفرقان ع ۳م) اور اُس دن (یعنی قیامت کو) یہ ظالم اپنے ہاتھ کو کاٹ کاٹ کھائے گا۔ کہیگا کہ ہائے افسوس! کیا اچھا ہوتا اگر میں رسول کا راستہ اختیار کرلیتا۔ ہائے میری شامت کیا اچھا ہوتا کہ میں فلاں شخص (منکرین سنت رسول) کو دوست نہ بناتا۔ تحقیق اُس نے تو مجھے نصیحت آجانے کے بعد بہکا دیا۔ اور شیطان تو انسان کو اللہ اوکرلینے سے جواب دے ہی دیتا ہے۔

اور ارشاد ہے:۔ وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَ یَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ط وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ○۔

(پ ۵ النسآء ع ۱۷) اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا (یعنی سنت رسول سے انکار کرے گا) بعد اس کے کہ اُسے راہ ہدایت دکھلادی گئی تھی اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے ہولیا تو ہم اُس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے (یعنی ڈھیل دے دیں گے) اور اُس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے جانے کی۔ اسی لئے قرآن مومنین سے خطاب فرماتا ہے۔ ارشاد ہے۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ۔ اے ایمان والو! اللہ کے احکام مانو اور اس کے رسول کے احکام مانو! اور رسول سے روگردانی مت کرو۔ حالانکہ تم اُن کے احکام سنتے ہو۔ اور اُن لوگوں کی طرح مت ہو نا جو کہتے ہیں کہ ہم رسول کا حکم سنتے ہیں حالانکہ وہ نہیں سنتے (یہاں سننے سے مراد ماننا ہے کہ وہ منہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم رسول کا حکم مانتے ہیں حالانکہ وہ مانتے نہیں کیونکہ اُس پر عمل نہیں کرتے) تحقیق اللہ تعالےٰ کے نزدیک بدترین خلائق وہ ڈھیٹ اور مچلے لوگ ہیں جو خدا اور رسول کے احکام سُنکر بھی نہیں سنتے (یعنی اس پر عمل نہیں کرتے) اور نہ اوروں کو سناتے ہیں یعنی گونگے ہیں در اصل یہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔ (یہاں عقل سے مراد عقلِ سلیم ہے یعنی حق بات کو تسلیم کرنے والی عقل) اور آخر میں ارشاد ہے۔ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَہٗ یُدْخِلْہُ نَارًا خَالِدًا فِیْھَا وَلَہٗ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ ۝ (النسآء ع ۲) اور جو شخص اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اُس کے بنائے ہوئے ضابطوں سے نکلے گا تو ہم اُسے ایسی آگ میں داخل کریں گے جس میں وہ مدتوں رہے گا

اور ہم اُسے رسوا کن سزا دیں گے۔ ۵

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ✿ اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

پس سنت رسولؐ کی پیروی ہی تزکیہ نفس اور کتاب و حکمت کے حصول کا اصل ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (پ۴ آل عمران ع ۱۷) حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا ہے جبکہ اُن میں اُن ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ اُن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور اُن لوگوں کا تزکیہ کرتے ہیں اور اُن کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں۔ اور بالیقین یہ لوگ پہلے صریح غلطی پر تھے۔

یعنی آسمانی کتابیں تو یہود و نصاریٰ کے پاس بھی تھیں مگر باوجود اس کے وہ غلط راہوں پر رواں تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ احسان فرمایا کہ اپنے رسولؐ کو بھیجا جو لوگوں کا تزکیہ نفس بھی کرتے ہیں اور ان کو کتاب و حکمت کی باتیں بھی بتاتے ہیں اور چونکہ احکامِ خداوندی پر عمل کرانے کے لئے رسول کا وجود لازمی ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اُسوۂ حسنہ کامل و اکمل طور پر احادیث کی صورت میں باقی رکھا جو نہ صرف

ایک مستند تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ سنتِ رسولؐ کا ایک
ایک نقش ہمارے سامنے اس طرح سے پیش کرتا ہے جیسے کہ وہ فعل
حال ہی میں سرزد ہوا ہو۔

لیکن افسوس صد افسوس! باوجود اس کے کہ دنیا کے تمام رہنمایانِ
قوم لیڈر حضرات اور پیغمبروں میں سے کسی فرد کا اسوہ اس طور پر کامل
مکمل اور اکمل طریقے پر موجود نہیں، جسطرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کا اسوۂ حسنہ مسلمانوں کے سامنے موجود ہے مگر پھر بھی مسلمان مدت
سے مختلف الخیال، مختلف المذاہب، مختلف العقائد اور مختلف العمل
راستوں پر گامزن ہیں اور کمال یہ ہے کہ ہر گروہ ہر فرقہ اور ہر جماعت
نے احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے لئے حجت و دلیل بنا رکھا ہے
جسکا صاف مقصد یہ ہے کہ یا تو بعض خود غرض لوگوں نے اپنی مقصد
برآری کی خاطر موضوع حدیثوں کو پُر اسرار طور پر رواج دینے کی کوشش
کی ہے اور یا یہ کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ۲۳ سالہ زندگی کے مختلف
ادوار کے افعال و اقوال کو مختلف المذاہب کے طور پر استعمال کیا گیا
ہے اور پھر اُس پر اس سختی سے اڑے رہے ہیں کہ اُس کے سوا باقی
سب کچھ کو کفر، الحاد اور ارتداد تصور کر لیا ہے۔ جس کا فطری
نتیجہ یہی ہونا تھا کہ بعض لوگ تو چند حدیثوں پر ہی اکتفا کر گئے اور
انہی کو ہی دین، مذہب یا کامل اسلام تصور کر کے باقی سب کچھ
سے بے نیاز ہو گئے۔ اور بعض لوگ چند موضوع حدیثوں اور مسلمانوں

میں غلط طور پر رائج شدہ غیر اسلامی طور طریقوں سے اکتا کر
احادیث نبویؐ ہی سے دل برداشتہ ہو گئے اس طرح مسلمان
ذہنی انتشار میں مبتلا ہو کر خود ایک دوسرے کے دشمن بن گئے
ہیں لیکن آج تک کوئی ایسا حل وجود میں نہیں آ سکا جو ہر دو فریق
کے درمیان سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہو۔ تاکہ کوئی فریق بھی
حد سے گذر نے نہ پائے اور مسلمان سنت رسول (صلی اللہ
علیہ وسلم) کو صحیح معنوں میں لائحہ عمل بنا کر صراط المستقیم پر گامزن
ہو سکیں۔

قرآن کا ناقابل عمل بن جانا: اور بارھویں بات جو باعث صد پریشانی ہے وہ قرآن کے
عمل کا مفقود ہو جانا ہے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن نے نہ صرف
عرب جیسی جاہل واجہل اور بدو قوم کو آنکھ کی جھپک میں اقوام عالم
کی امامت و قیادت کی باگ ڈور سونپ دی تھی بلکہ مشرق و مغرب
اور شمال و جنوب کی عجمی اقوام میں بھی ایک ذہنی اور روحانی انقلاب
برپا کر دیا تھا۔" ہیروز اینڈ ہیروز ورشپ" کا انگریز مصنف لکھتا ہے
کہ "قرآن ایک چنگاری تھی، اور عرب کا وہ سیاہ ریت گویا بارود
کا ڈھیر تھا جس میں چنگاری پڑتے ہی ایک طوفان برپا ہو گیا اور
صرف ایک صدی کے مختصر دور میں اسلام کا ایک ہاتھ دہلی میں تھا تو
دوسرا فرانس میں"

خود تاریخِ اسلام گواہ ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے سخت دل انسان جو حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی نیت سے شمشیر بکف نکلے تھے۔ اپنی ہمشیرہ کی زبان سے قرآن سنکر نہ صرف سرِ اطاعت خم کر کے مسلمان ہو گئے۔ بلکہ ایسے رقیق القلب انسان بن گئے کہ جب بھی قرآن کی تلاوت کرتے ...... تو آنکھوں سے بے ساختہ آنسوؤں کی لڑیاں ٹپ ٹپ گرنی شروع ہو جاتیں۔

ولید بن مغیرہ قریش کا سب سے بڑا دولتمند اور صاحبِ اثر شخص تھا۔ اس لئے جب قرآن کی آیات سنیں تو اس کا دل صداقتِ قرآنی سے لبریز ہو گیا اور مسخر ہونے لگا۔ یہ دیکھکر ابوجہل ڈر گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ولید بھی مسلمان ہو جائے اس لئے اُس نے ولید کو قرآن مجید سے متنفر کرنا شروع کر دیا اور اس بات پر آمادہ کر لیا کہ عام جہلا کی طرح یہ اعلان کر دے کہ یہ کسی شاعر کا کلام ہے یا کسی کاہن کی پیشین گوئی ہے۔ ولید نے کہا کہ تم لوگوں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو مجھ سے زیادہ سخن فہم ہو۔ قصیدہ اور غزل کے محاسن اور معائب جانتا ہو۔ زبان و بیان کی لطافتیں اور بحر و وزن کی باریکیوں سے واقف ہو میں سچ کہتا ہوں کہ قرآن میں تو ایسی ایک بات بھی نہیں ہے یہ کلام نہ کسی شاعر کی دماغی اختراع ہے۔ نہ کسی کاہن کی پیشین گوئی ہے۔ بلکہ یہ سراپا مٹھاس ہے۔ ایک لذت ایک روحانیت کا مخزن ہے۔ یہ

ایک ایسا مغز ہے جس میں چھلکا نہیں ۔ یہ ایک ایسی بلندی ہے جس میں پستی نہیں اور یہ ایک ایسی فتح ہے جس میں شکست نہیں ۔"

ابوجہل نے تیوری چڑھا کر کہا :" ولید آج تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے ۔" اس نے جواب دیا کہ :" میں خود بھی نہیں بتا سکتا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے ۔ اچھا مجھے ذرا اور غور کر لینے دو ۔ سوچ سوچ کر اس نے کہا :" قرآن ایک ایسا سحر ہے جس کا اُتار نہیں ایک ایسا منتر ہے جس کا رد نہیں ۔"

ضماد ازدیؓ ایک بڑے عامل شخص تھے وہ یہ سن کر ۔ کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی جن سوار ہے ۔ آپؐ کے علاج کی غرض سے حاضر ہوئے لیکن جونہی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے چند آیتیں سنیں تو حیران رہ گئے ۔ اور بے ساختہ سر ادب سے جھکا دیا اور کہنے لگے :" خدا کی قسم میں نے کاہنوں کی بولی بھی سنی ہے ۔ جادوگروں کے منتر اور شعرا کے شعر بھی سنے ہیں ۔ لیکن آپ جو کہتے ہیں یہ کچھ اور ہی ہے ۔ یہ تو واللہ ایک بے انتہا سمندر ہے ۔

کفار قریش نے جب اسلام کو ترقی کرتے دیکھا تو عتبہ بن ربیعہ کو جو شاعر بھی تھا اور سحر و کہانت بھی جانتا تھا ۔ منتخب کر کے دربار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں روانہ کیا ۔ تا کہ معلوم کرے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہتے ہیں اُس کی

حقیقت کیا ہے؟ اور پھر صلح و آشتی سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلائے کلمۃ الحق سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ جب اُس نے بارگاہ نبوی میں شرائطِ صلح پیش کیں تو اس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ فصلت پڑھنی شروع کی، ابھی کچھ ہی آیتیں پڑھی تھیں کہ عتبہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگا۔ خدائے کعبہ کی قسم! تم دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دو گے۔ قرابت کا واسطہ بس کرو بس، یہ کہکر عتبہ اُٹھ کھڑا ہوا اور گھر میں آکر (محو حیرت) ہو کر بیٹھ گیا۔ ابوجہل کو جب معلوم ہوا تو اُس کے گھر جا کر کہا کیوں عتبہ! محمدؐ کی دعوت کھا کر اُنہیں کے ہو گئے۔ عتبہ نے کہا ابوجہل بے ہودہ مت بکو۔ کون ہے جو میری دولت مندی میں کلام کرے۔ یا مجھے بندۂ حرص و آز ٹھہرائے میں جسطرح کا دولت مند ہوں تم خود جانتے ہو مجھے روپے پیسے اور دولت کی طمع دامنگیر نہیں ہو سکتی ہے۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ محمدؐ نے میرے سوال کے جواب میں جو کلام پیش کیا وہ نہ تو شعر تھا، اور نہ کہانت تھی۔ بلکہ فصاحت و بلاغت کا مخزن تھا ایسا فصیح اور بلیغ کلام میں نے کبھی نہیں سنا۔ اس میں عذاب الہیٰ کی دھمکی تھی مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم پر عذاب الہیٰ نہ آجائے۔ لوگوں نے جب سنا تو کہا کہ محمدؐ نے اپنی زبان سے عتبہ پر جادو کر دیا ہے۔ اسی طرح کعب بن مالکؓ، حسان بن

ثابتؓ۔ عبداللہ بن قیسؓ، نابغہ جعدیؓ، کعب بن زبیرؓ، عامر بن اکوعؓ۔ طفیل بن عمروؓ، زبرقانؓ، شماخؓ، اسود بن سریعؓ۔ عبداللہ بن رواحہؓ وغیرہ سب مشہور شعرائے عرب ہیں سے تھے جو کہ قرآن کو سنکر گرویدہ ہوگئے اور اس کے اثر سے مشرف بہ اسلام ہوئے

سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ قرآن جو بقول ولید بن مغیرہ ایک مٹھاس، ایک لذت، ایک روحانیت کا مخزن، سراسر مغز تھا جس میں چھلکے کا نام و نشان نہ تھا وہ بلندی تھی جسکی پستی نہ ہو۔ آج کیوں بے اثر ہے۔ اس کی وہ روحانیت۔ وہ مٹھاس اور وہ لذت کہاں گئی؟ کہ آج کافر تو بجائے خود رہا مسلمان پر بھی اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا؟ دنیا میں کروڑہا مسلمان موجود ہیں۔ مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکتیں بھی ہیں۔ قاری اور حفاظ بھی پہلے سے زیادہ تعداد میں ہیں۔ لیکن آج تک قرآن پر اجتماعی حیثیت سے عمل نہ ہو سکا؟ کیا خدا نخواستہ قرآن فی زمانہ ناقابل عمل ہے؟ یا مسلمان کو قرآن پر عمل کرنے کی آرزو نہیں؟ اور کیا یہ وہ قرآن نہیں۔ جس کا نام سنکر فاتحین ملک پر ایک ہیبت اور دہشت طاری ہو جایا کرتی تھی؟ کیا یہ وہی قرآن نہیں، جس کو ہاتھ میں لیکر لارڈ جیمسفورڈ نے انگلستان کی پارلیمنٹ میں تقریر

کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب تک یہ کتاب دنیا میں رہے گی۔ عیسائیت کو آرام اور چین نہیں ملے گا اگر یہ وہی قرآن ہے اور یقیناً ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ قرآن اور اس کی وہ پاکیزہ آیات جس کے متعلق خود قرآن فرماتا ہے کہ "لا یمسہ الا المطھرون" اور جس نے دنیا کو چیلنج کیا تھا کہ وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (البقرہ) کہ اگر تم کو اس میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے کچھ شک ہو تو اس کے مثل کی ایک سورۃ تو پیش کرو۔ و بلاؤ اپنے تمام فصحا اور بلغا کو جن کو اللہ کے سوا تم مانتے ہو اگر تم سچے ہو۔)

آج ملا کی جھاڑ پھونک۔ تعویذ۔ گنڈوں۔ اسقاط۔ اور یٰسین خوانی کے سوا کسی دوسرے کام کا نہیں رہا؟ کیا یہ قصور قرآن کا ہے یا ہمارا؟ اگر ہمارا ہے اور یقیناً ہمارا ہی قصور ہے۔ ہم نے قرآن سے منہ موڑا ہے۔ ہم نے ہی قرآن کو بھلا کر پس پشت ڈال دیا ہے۔ تو پھر بتاؤ کہ قیامت کے دن جب قرآن کے اس حکم کے مطابق "فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝"

(الاعراف ع)

تفسیر حسب ہا: پھر ہم اُن لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے اور ہم پیغمبروں سے بھی ضرور پوچھیں گے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہمارے متعلق پوچھا جائے گا۔ تو رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے سوا کیا جواب دیں گے

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔ اور رسولؐ کہے گا کہ میرے پروردگار تحقیق میری قوم نے ہی اس قرآن کو پس پشت ڈالدیا تھا اور پھر کیا حالت ہوگی ہماری جبکہ قرآن کے اس حکم کے مطابق ہمارے ساتھ معاملہ کیا جائے گا جیسے کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْٓ اَعْمٰی وَقَدْ کُنْتُ بَصِیْرًا ۝ قَالَ کَذٰلِکَ اَتَتْکَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا وَکَذٰلِکَ الْیَوْمَ تُنْسٰی ۝ وَکَذٰلِکَ نَجْزِیْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰی ۝ ۱۶/۱۴ طٰهٰ ع ۷۔ اور جو کوئی میری نصیحت (قرآن) سے منہ موڑے گا۔ تو اس کی معیشت تنگ ہوگی۔ اور قیامت کے روز ہم اس کو اندھا کر کے اٹھاویں گے، وہ کہے گا کہ اے میرے رب تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا ہے تو آنکھوں والا تھا۔ ارشاد ہوگا۔

جس طرح تمہارے پاس میری آیتیں پہونچی تھیں۔ مگر تو نے اُن کا کچھ خیال نہ کیا تھا۔ اسی طرح آج تیرا بھی کچھ خیال نہ کیا جائیگا اور اسی طرح ہم اُس شخص کو سزا دیں گے جو حد سے گذر جائے اور اپنے رب کی آیتوں کو نہ مانے اور واقعی آخرت کا عذاب بڑا سخت اور دیرپا ہے۔

آخر وہ کیا وجہ ہے کہ جس کے باعث مسلمان قوم قرآن پر عمل کرنے سے قاصر ہے قرآن کیوں مسلمان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ آج کیوں قرن اول کے مسلمانوں کی طرح قرآن پر عمل کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ آؤ ایک لمحہ کے لئے ہم اُن وجوہات پر بھی غور کر لیں کہ جس کے باعث آج ہم قرآن پر عمل کرنے کے جوہر سے محروم ہو گئے ہیں۔

دراصل قرآن ہر لحاظ سے ہر ایک سادہ مضامین پر مبنی چند فطری احکام لیکر آیا تھا۔ سو جب تک اُس کا مفہوم اپنی فطرتی سادگی پر قائم رہا۔ منطقی اُلجھنوں اور انسانی تخیلات اور اوہام کا اس میں آمیزش نہ ہوئی تب تک لوگ اس کی آیات کو ہدایت و عمل کے لئے پڑھتے تھے اور اس کے سادہ اور جلد سمجھ میں آجانے والے مفہوم کو اپنے ذہنوں میں بٹھا کر جلد اس پر عمل کرنے کی سعی کرتے تھے۔ مگر جب سے علم کا دور آیا ہے۔ [illegible] عمل کی بجائے [illegible] صاحب علم لوگ تفسیریں [illegible] آ گئے اور ابتدا کیسے [illegible]

"ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت" پر عمل درآمد شروع ہوا قرآن کے ہر ہر لفظ پر اختلاف و تحقیق کی نئی نئی عمارتیں کھڑی ہونے لگیں اور آیات و الفاظ کی وہ فطری سادگی اور جلد سمجھ میں آجانے والا مفہوم بھی گم ہوتا گیا۔ کسی صاحب نے ایک طرح کی تفسیر کی تو دوسرے صاحب اس کی تردید میں کچھ اور ہی گل کھلا گئے۔ تیسرا اٹھا تو اس نے اول و دوم کی تردید کرتے ہوئے ایک نئی بحث کا دروازہ کھول دیا۔

اس ردّ و کد اور بحث و تمحیص کا نتیجہ یہ ہوا کہ آیات کا مطلب عمل فوت ہو کر بحث و مناظرہ میں تبدیل ہو گیا اور بقول شاعر کے "شد پریشان خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا" جس مولانا صاحب نے بھی قلم اٹھایا۔ اس نے قرآن کے ایک ایک لفظ کی تفسیر میں صدہا صفحے لکھ ڈالے اور اس طرح ہر عالم نے اپنے آپ کو علامۂ وقت ثابت کرنے کی خاطر قرآن کی تفسیر کئی جلدوں میں لکھ ڈالی۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ مسلمان علماء نے تفاسیر کے لکھنے میں علم کے دریا بہا دیئے ہیں مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ان تعبیروں اور تفسیروں کے ہجوم ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج قرآن کے ایک ایک لفظ پر تکرار ہو رہی ہے۔ ہر آیت ایک معمہ بن گئی ہے جس کا عملی مفہوم عام اور سادہ لوگوں کی ذہنی استعداد سے بالاتر ہوتا جا رہا ہے

آج مسلمان، جب قرآن کی کسی تفسیر کو کھولتا ہے۔ تو وہ بجائے اس کے ایک سادہ اور فطری مفہوم کو ذہن میں لیکر عمل کے میدان کی طرف دوڑ پڑتا تو اپنے سامنے ایک ڈکشنری کی کتاب کھلی ہوئی پاتا ہے۔ اور پھر بحث و تمحیص کی رنگینیوں میں مبتلا ہو کر بیٹھے بیٹھے ذہنی نقشہ تو خوب لیتا ہے۔ مگر عمل کے میدان سے رک کر فکری الجھنوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ کہیں [illegible] قوم کی تفسیریں کتنیاں پر کتب لکھی جا رہی ہیں کہیں الاللہ، رحمٰن رحیم، کی تفسیر میں بحث کا دروازہ کھلا ہوتا ہے۔ تو کہیں عرش، کرسی، سما، ملائکہ اور کوثر و تسنیم پر خامہ فرسائی ہو رہی ہے۔ ہم یہاں صرف کرسی کے لفظ کی چند تفسیریں نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ ان مفسرین حضرات نے قرآن کے فطری اور سادہ مفہوم کو کتنا پیچیدہ کر دیا ہے۔

۱۔ کرسی اس جگہ کا نام ہے جہاں خدا کے پاؤں ٹکے ہیں ([illegible] الرازی)

۲۔ خدا کی کرسی اتنی بڑی ہے کہ زمین و آسمان اس کے جوف میں سما سکتے ہیں اور خدا کا عرش کرسی سے بھی بڑا ہے اور اس قدر بڑا ہے کہ جیسے ایک وسیع میدان کے بالمقابل ایک لوہے کا چھلا (عن السدی عن ابی ذر)۔ ۳۔ عرش اور کرسی دونوں ایک ہی ہیں (عن الحسن) ۴۔ خدا کی کرسی آسمان کے اوپر ہے ([illegible]) ۵۔ خدا کی کرسی عرش کے روبرو ہے

۶ ۔ خدا کرسی پر بیٹھتا ہے ۔ اور وہ اپنی کرسی میں پورا سما جاتا ہے ۔ کہیں چار انگل بھی جگہ نہیں بچتی ۔ کرسی سے چرچراہٹ کی آواز بھی آتی ہے ۔ جس طرح کہ بھاری بھرکم آدمی کے بیٹھنے سے چرچراہٹ پیدا ہوتی ہے (عن عبداللہ بن خلیفہ) (ماخوذ از ملازم مصنفہ عطا محمد)

حالانکہ قرآن کی آیت الکرسی کا ماقبل و مابعد دیکھنے سے "وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" کے صاف اور سادہ معنی یہ ہیں کہ خدا کی ملکوت و سلطنت زمین اور آسمان سب پر حاوی ہے ۔ اور یہ غیراللہ کو مدد کے لئے پکارنے والوں کیلئے کہا گیا ہے زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اُس پر حکومت تو خدا کی ہے اور خدا کے اذن کے بغیر کوئی تمہاری سفارش تک بھی نہیں کر سکتا ۔ تمہیں کچھ دینے دلانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ مگر علماء کی مختلف تعبیروں اور تفسیروں نے آیت کے اصل مقصد کو فوت کر کے پڑھنے والوں کا رجحان کرسی کی پیدائش اور بناوٹ کی طرف پھیر دیا ۔ اسی طرح ایک ایک لفظ کی مختلف تفسیروں اور تعبیروں نے مسلمانوں کو گروہ گروہ ، فرقہ فرقہ اور جماعت جماعت میں تقسیم کر کے دیوبندی ، بریلوی ، ندوی ، چکڑالوی ، اور احمدی بنا دیا ہے ۔ عبداللہ چکڑالوی نے قرآن کی تفسیر لکھی اور منکرین حدیث کا ایک فرقہ علیحدہ کھڑا کر دیا ۔ مرزا قادیانی نے براہین احمدیہ لکھی اور احمدی فرقہ کھڑا کر دیا ۔

"خاتم النبیین" کی تفسیر میں ظلی اور بروزی نبوت تک کے دروازے کھول دیئے گئے مسیح موعود اور مہدیت کے دعوے شروع ہو گئے غرض کیا کیا بتاؤں؟ اگر گنا شروع کر دوں تو مسلمانوں کا کوئی فرقہ گروہ یا جماعت ایسی نہیں ہے جو ان تفسیروں اور تعبیروں کا شکار نہ ہوئی ہو۔

۴ - قرآن کریم پر عمل نہ کر سکنے کی دوسری وجہ قراءت قرآن کا مروجہ طریقہ ہے۔ تفسیر ثعلبی میں عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالے عنہ سے منقول ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ قرآن سات حرف پر نازل ہوا ہے اور ہر ایک حرف کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ اکثر علماء نے حرف سے مراد قراءت لیا ہے۔ اور قراءت کی تفسیر لحن کی گئی ہے۔ اسی لئے شامی قرأت، مصری قرأت اور حجازی قرأت۔ باقی قرأتوں میں مشہور رہیں۔ اور اسی لئے آج مسلمان قرآن کو گیت تصور کر کے اپنے اپنے من مانے طرز پر خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ہر قاری اپنے اندر لحنِ داؤدی پیدا کر لینے کی کوشش کرتا ہے۔ در اصل اگر ذرا غور کیا جائے تو ہر زبان میں کچھ مختلف قرأتیں ہوتی ہیں۔ قرأت سے میری مراد طرزِ کلام ہے۔ بلکہ ہر مضمون میں کچھ مختلف طرزِ کلام پایا جاتا ہے۔

مثلاً آپ کوئی ناول، افسانہ، ڈرامہ یا مضمون

سے لیں۔ تو آپ دیکھیں گے کہ کبھی تو مضمون نگار کسی میدانِ جنگ کا نقشہ کھینچتا ہے۔ اور اُس میں وہ اپنی طرزِ تحریر کو ایسے انداز میں پیش کرتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والوں میں جہاد کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ پھر وہ اپنی تحریر میں کسی عاشق و معشوق کے تذکرے کو چھیڑ دیتا ہے اور اپنی طرزِ تحریر کو اس طرح بدل دیتا ہے کہ اپنے پڑھنے والوں اور سننے والوں میں عشق کے جذبات بیدار کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب کسی ظلم و معصومیت کا تذکرہ کرتا ہے۔ تو اپنے پڑھنے اور سننے والوں میں ایسا اثر پیدا کر دیتا ہے کہ اُن کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے شروع ہو جاتے ہیں اور پھر جب کوئی لطیفہ یا مذاق جیسا مضمون پیش کرتا ہے تو لوگوں کو ہنسا ہنسا کے تھکا دیتا ہے۔

بعینہٖ اسی طرح بلکہ اس سے بدرجہا بہتر درجے پر قرآن بھی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو اپنے قاری اور اپنے سننے والوں میں اثر دکھا سکتا ہے۔ بشرطیکہ قاری اس کے طرزِ قرأت سے واقف ہو جائے قرآن کے سات حرف پر اترنے سے مراد وہ سات قسم کے مضامین ہیں جن کا طرزِ کلام ایک دوسرے سے مختلف ہے اور وہ سات قسم ... کے مضامین یہ ہیں

(۱) معروف (۲) منکر (۳) بشارت (۴) نذارت (۵) مثال (۶) قصص (۷) دعاء۔

۱- معروف وہ احکام ہیں جو امر کئے جاتے ہیں
۲- منکر وہ نواہی ہیں جن سے روکنے کی تلقین کی گئی ہے۔
۳- بشارت، وہ خوشخبریاں اور انعامات جو انسان کو اطاعت کے صلے میں دیئے جائیں گے۔
۴- نذارت۔ عذاب خداوندی اور بُرے کاموں کے نتائج سے ڈرانے کا نام ہے۔
۵- مکالمہ۔ دو افراد کا ایک دوسرے سے سوال و جواب کی طرز پر گفتگو کرنا ہے۔
۶- قصص۔ کسی کہانی کا بیان کرنا ہے
۷- دعا۔ عاجزی سے کوئی چیز مانگنے کا نام۔

اب اگر ایک قاری اوامر بیان کر رہا ہو احکام خداوندی پیش کر رہا ہو۔ تو اُس کی مثال ایسی ہے جیسے آقا اپنے نوکر کو حکم دے رہا ہو یا باپ اپنے بیٹے کو کسی کام کے لئے کہہ رہا ہو۔ یا اُستاد شاگرد کو کسی کام پر مامور کر رہا ہو۔ یا کمانڈر اپنی فوج کو احکام دے رہا ہو یا کم از کم وہ کسی کہانی میں پیغام کی نشر بھی سنا رہا ہو تو ضرور اُس کے لہجے اور اُس کی تقریر اور اُس کے طرز کلام سے احکام ہی کے اثرات ظاہر ہوں ... اور پھر اگر وہ نواہی بیان کرتا ہو تو اُس کی تقریر سے منع کرنے والے اثرات ظاہر ہوں۔ اسی طرح جب وہ بشارت دے رہا ہو

تو اُس کے چہرے اور اُس کی آواز سے خوشی ظاہر ہونی چاہئیے اور اگر وہ قہر و غضب کی آیتیں پڑھ رہا ہو تو چہرے اور اُس کے طرز کلام سے بھی قہر و غضب کے اثرات نمودار ہونے چاہئیے اور جب وہ دعا پڑھ رہا ہو تو اُس کے چہرے اور اُس کی گفتار میں عاجزی نظر آنی چاہئیے غرض ایک قاری کے لئے لازم ہے کہ وہ ساتوں قرأت کے ساتھ قرآن پڑھے اگر یہ صلاحیت اُس میں نہیں تو وہ ایک راگی تو ضرور ہے مگر قاری نہیں

لیکن آج مسلمانوں کی حالت یہ ہے۔ کہ صرف الفاظ کی صحت اور خوش الحانی و ترنم سے قرآن کو پڑھنے کا نام قرأت رکھ لیا گیا ہے۔ مطالب سے کوئی غرض یا بحث باقی نہیں رہی قاری کی ساری توجہ اسی پر ہوتی ہے کہ قرأت درست ہو آواز بلند ہو۔ لحن میں لچک ہو تاکہ سب لوگ اس کے ترنم کو سن سکیں اور خوش الحانی کی داد دیں ادھر سننے والے بھی ترنم کے شوق میں جھومتے۔ سر ہلاتے واہ واہ کرتے اور داد دیتے جاتے ہیں طرفین کے اس تکلف اور تصنع میں قرأت کی اصل صورت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ مقصد و مطلب یا اُس پر عمل کرنے کا خیال مفقود ہو جاتا ہے چاہے خدا قہر و غضب اور عذاب عظیم سے ڈرانے کی دھمکیاں ہی کیوں نہ دے رہا ہو۔ مگر سننے والے قاری کی خوش الحانی اور ترنم پر جھوم رہے ہیں۔

واہ واہ کر رہے ہیں اور خوش خوش ہو کر گھروں کو واپس ہو جاتے ہیں اور دل ہی دل میں سوچتے ہیں کہ ہم نے قرآن سنکر بڑا ثواب حاصل کر لیا ہے۔ آج ہمارا قاری الحمد سے لیکر والناس تک سارا قرآن ایک ہی لے میں ترنم اور خوش الحانی سے اس طرح پڑھتا ہے جیسا کہ وہ راگ گا رہا ہے اور اس خدا کے بارے کو یہ احساس تک نہیں ہوتا۔ کہ جب وہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ دنیاوی حاکم کے سامنے جاتا ہے تو اس کا حلق خشک ہو جاتا ہے ملاقات سے پہلے ہونٹوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں۔ بیان میں کپکپی اور چہرے پر زردی چھا جاتی ہے۔ اور اس کے رعب سے اتنا دب جاتا ہے کہ منہ سے الفاظ تک نہیں نکلتے۔ مگر یہاں احکم الحاکمین اور واحد القہار خدا کے قہر و غضب کی آیتیں ترنم سے پڑھتا ہے اور اسے ذرا احساس نہیں ہوتا اور نہ کبھی یہ سوچتا ہے کہ آخر یہ خدا کا کلام ہے۔ کسی شاعر کی غزل نہیں کوئی راگ یا گیت نہیں۔ یہ اوامر و نواہی ہیں جو کسی کام کے کرنے کو کہتا ہے۔ اور کسی کام سے منع فرماتا ہے۔ یہ انسان کی زندگی کا ایک دستور العمل ہے ایک نظام حیات ہے۔ خداوندی عذاب اور برے کاموں کے نتائج سے ڈرانے والی رضائے الٰہی اور خداوندی انعامات کو حاصل کرنے کی سیدھی راہ دکھانے والی زندہ کتاب ہے۔ گذشتہ اقوام

کے قصص سنا کر آئندہ آنے والی اقوام کو زندگی عطا کر دینے والی
زادِ عمل ہے۔ کیا یہ کتاب نسیم حجازی۔ رئیس احمد جعفری۔ شوکت
تھانوی۔ نیز تھہ راحم فیروز پوری اور ایم اسلم کے ناولوں اور افسانوں
کے برابر بھی نہیں؟ کہ وہ تو اپنے پڑھنے والوں کی نیندیں حرام کر سکتی
ہیں۔ اُن کے جذبات ابھار کر عشق و جنون میں مبتلا کر سکتی ہیں جہاد پر
آمادہ کر سکتی ہیں۔ رلا سکتی ہیں ہنسا سکتی ہیں۔ مگر افسوس کہ ہمارے
قاری کی قرأت قرآن کو بین باجے کے سوا کچھ نہیں بنا سکا۔ ادھر
ہمارے علمائے حضرات نے قرأت قرآن کو ایک نزاع کی صورت
دے رکھی ہے۔ مالکِ یوم الدین کے لفظ پر جھگڑے ہو رہے
ہیں کوئی تو مَلِکِ پڑھتا ہے کوئی مالک کہتا ہے۔ ولا الضالین
کے ض پر علماؤں کے درمیان کئی مدت تک جھگڑے اور تنازعے
ہوتے رہے لاٹھیاں تک چلیں مسجدیں علیحدہ کی گئیں اور ایک دوسرے
کو کفر کے فتوؤں سے نوازا گیا۔ دور دور سے مولوی بلائے گئے جلسے
کئے گئے لمبی لمبی تقریریں جھاڑی گئیں گویا (ض) کے لفظ پر ساری
نماز اور جماعت کا انحصار اور نجات کا مدار رکھ دیا گیا مگر
کسی خدا کے بندے نے یہ نہ سوچا کہ قرآن عمل کے لئے نازل ہوا
ہے قرأت خوانی کے لئے نہیں۔

غرض اس طرح سے خود مسلمان قرآن کی قرأت کو ترنم سے گا گا کر
یا اُس کے الفاظ میں جھگڑے نکال نکال کر اصل مقصد اور دستور زادِ عمل

سے دور ہو گئے ۔

۳۔ اور تیسری وجہ قرآن پر عمل نہ کر سکنے کی قرآن کے معانی سے محرومی و ناآشنائی ہے ۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرب قوم سے تعلق رکھتے تھے اور قرآن کے نزول کا محل وقوع بھی عرب ہی تھا لہذا قرآن کا عربی زبان میں نازل ہونا بھی لازمی تھا ۔ اور عہد رسالت آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک چونکہ قرآن کی دعوت و تبلیغ اور عمل کا دائرہ عرب اقوام تک ہی محدود تھا لہذا اس کے ترجمہ کا کوئی خاص اہتمام نہ کیا گیا ۔ مگر بعد میں عرب عاملین نے اپنا سارا زور اس بات پر لگایا ۔ کہ عربی زبان ہی کو بین الاقوامی زبان کی حیثیت دی جائے ۔ تاکہ عجمی اقوام کے لئے قرآن کا سمجھنا آسان ہو جائے ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ " اموی خلافت نے تو اپنا فرض منصبی عربی زبان اور اسلام کی اشاعت ہی سمجھا ہوا تھا ۔ چنانچہ جہاں کہیں یہ گئے عربی زبان اور اسلام کی اشاعت خاطر خواہ ہوئی "۔ غرض عاملین اسلام نے اشاعت اسلام اور عربی زبان کو عام کرنے کی خاطر ہر ممکن جد و جہد کی یہاں تک کہ ہر مسجد کو عربی مدارس کی صورت دے دی گئی اور چونکہ ابتدا میں مسلمانوں کے اکثر حکمران اور عاملین عربی نسل سے تھے اور حکومت کی سرکاری زبان بھی عربی ہی تھی لہذا لوگوں میں عربی سیکھنے کا شوق روز افزوں ترقی پر تھا ۔ اور قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے والے لوگ بھی عام پائے جاتے تھے

مگر جب سے اسلامی حکومت کی باگ ڈور عجمی اقوام کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔ اور عجمی زبان حکومت کی سرکاری زبان بن گئی ہے اُس وقت سے قرآن کے معنی و مطلب سمجھنے سمجھانے سے لوگ محروم ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے امارت و امامت کا معیار قرآن رکھا تھا۔ لہذا لوگ قرآن کی طرف زیادہ راغب تھے۔ لیکن کچھ تو عجمی حکمرانوں نے اس معیار کو بدلکر دنیاوی سیاست جاگیرداری اور قومی زبان کو ترقی کا مدار بنا دیا۔ اور باقیماندہ حالت کو انگریز نے اس طرح سے بدل دیا کہ انگریزی زبان کو سرکاری ملازمتوں اور ترقیوں کا معیار مقرر کر دیا۔ چنانچہ لوگ قرآن کی طرف سے ہٹ کر دنیا کی طرف راغب ہوتے گئے اور آہستہ آہستہ انگریزی سیاست نے قرآن کا دائرہ اس قدر محدود کر دیا کہ آج قرآن کا قاری، حافظ اور عالم مسجد کی امامت کے سوا اور کہیں جگہ اپنی روزی تک پیدا کرنے کا مقدار نہیں رکھتا۔ اسی لئے آج ہر باپ اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم دلانے کا خواہشمند ہے تاکہ اُس کی اولاد کہیں سرکاری ملازمت اختیار کر کے اپنی روزی کا کفیل ہو سکے اور یہی وجہ ہے کہ آج مسلمانوں کا اکثر تعلیم یافتہ طبقہ دہریت، لامذہبیت اشتراکیت، ورنصرانیت کا شکار ہوتا جا رہا ہے اسی لئے آج ہمارا نوجوان طبقہ ناول اور افسانوں کی رنگین کہانیوں کو آدھی آدھی رات تک بڑے شوق و اہتمام کے ساتھ

پڑھتا اور مزے لیتا ہے۔ مگر قرآن کے ایک رکوع کو بھی پڑھنا گوارا نہیں کرتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ہماری نماز دل اور روزہ لیا میں ختم قرآن اور ہماری تلاوت بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ آج ہم ختم قرآن کرتے ہیں لیکن اس کے مقصد سے بے خبر ہیں نماز پڑھتے ہیں لیکن اس کے آثر سے محروم ہیں صبح و شام تلاوت قرآن کرتے ہیں لیکن اس پر عمل کرنے سے قاصر ہیں۔ غرضیکہ عربی زبان اور قرآن کے معنی اور مطلب سے بے بہرہ ہو جانے کے باعث ساری کی ساری قوم قرآن پر عمل کرنے سے محروم ہو گئی ہے۔

چوتھی وجہ قرآن پر عمل نہ کرنے کی یہ ہے کہ مسلمانوں نے تنزیل قرآن کے فطری اور خداوندی طریقہ پر عمل کرنے کی حکمت عملی کو بھلا دیا ہے اللہ تبارک و تعالے فرماتا ہے کہ:۔ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝ (پ ۱۵ سورۃ بنی اسرائیل ع ۱۲) اور ہم نے قرآن کو فصل کے ساتھ مختلف وقتوں میں تھوڑا تھوڑا کرکے اتارا، تاکہ آپ لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کے پیش کریں اور ہم نے اس کے نزول میں بڑا اہتمام رکھا ہے"

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالے عنہا فرماتی ہیں کہ سب سے پہلے قرآن پاک کی وہ آیتیں اتریں جو دلوں پیمانی، روحوں میں گرمی اور خیالات میں تبدیلی پیدا کرتی تھیں۔ جب یہ ہو چکا تو احکام کی آیتیں آئیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور پہلے ہی دن یہ حکم دیا جاتا کہ لوگو! شراب

چھوڑ دو تو کون اس کو مانتا۔

اسلام کی دعوت کی یہ ترتیب اور قرآن پر عمل کرنے کی یہ ترکیب قدرتی اور فطرت کے عین مطابق ہے۔ اور جبتک کہ اسی طرح موقعہ و محل کے مطابق ایک ایک مسئلہ قوم کے سامنے بالترتیب نہ پیش کیا جائے اور تمام کی تمام قوم اجتماعی اور انفرادی طور پر صرف اور صرف اُسی ایک مسئلہ کی آیتوں کی حامل و عامل نہ ہو جائے تب تک پورے قرآن پر عامل ہونا محال بلکہ ناممکن ہے۔

عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حکم دیتے تو ایسا حکم دیتے جو لوگوں کی طاقت کے مطابق ہوتا۔ ایک وقت لوگوں نے عرض کی کہ ہم کو زیادہ حکم دیں کیونکہ ہم تو آپ کے برابر نہیں ہیں۔ آپ کو تو خدا بخش دیگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے غضبناک ہوئے یہانتک کہ لوگوں نے آپ کے چہرہ مبارک پر غصے کے آثار دیکھے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ میں تم سے زیادہ پرہیزگار رہوں اور اللہ کی قسم میں تم سے زیادہ علم رکھتا ہوں یعنی میں وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے یعنی اگر زیادہ احکام دے دوں تو مجھے معلوم ہے کہ تم نہ کر سکوگے۔

ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ کو یمن کی طرف بھیجا اور فرمایا کہ "میں تمہیں اہل کتاب کی طرف بھیج رہا ہوں۔ پس تم پہلے اُنہیں اللہ کی

عبادت کی طرف بلاؤ پھر جب وہ اللہ کو پہچان جائیں تو پھر اُن کو
خبردار کرو کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں
دن اور رات میں۔ پس جب وہ نماز پڑھنے لگ جائیں۔ پھر اُنہیں
خبردار کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر زکوٰۃ بھی فرض کی ہے اور ان
اُن کے مال لیکر اُنہیں کے غریب لوگوں میں تقسیم کر دو۔ پھر جب
وہ اسباب کے عادی ہو جائیں تو پھر اُن سے درمیانہ درجے کا مال
لے لیا کرو۔ غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس جلیل القدر پیغمبر
(فداہ اُمی و ابی و نفسی و مالی و آلی) نے پوری حکمت عملی کے ساتھ
فطری اُصولوں کے مطابق قرآن کی ایک ایک آیت کو اپنے محل اور
موقع کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اور اس طرح متواتر
۲۳ سال تک قرآن کو مختلف وقتوں اور موقعوں کے مطابق
قوم کے سامنے پیش کرتا رہا۔ اور جاہلیت کے اعمال و مراسم
ایک ایک کر کے پاؤں تلے روندتا رہا۔ جب ساری کی ساری
قوم قرآن پر کماحقہٗ عمل کرنے کے قابل ہو گئی تو آپ نے حجۃ الوداع
کے خطبہ میں ایک لاکھ چالیس ہزار جان نثاران اسلام کے سامنے
اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ "آج جاہلیت کے سارے دستور
اور مراسم و رواج میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں۔ جاہلیت کے
تمام خون کے بدلے ختم کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے
خاندان کا خون ربیعہ بن حارث کے بیٹے سے ابتدا کی خون [illegible]

حق چھوڑتا ہوں۔ (یعنی دشمن کو معاف کرتا ہوں) جاہلیت کے تمام سود مٹا دیئے گئے۔ اور سب سے پہلا سود جس کو میں مٹاتا ہوں وہ اپنے خاندان یعنی حضرت عباس ابن عبد المطلب کا ہے "

لیکن افسوس! کہ آج مسلمانوں نے قرآن کے الفاظ کے سوا باقی تمام فطری اصولوں اور تقاضوں کو منہاجِ نبوت سے ہٹا کر خود ساختہ طور طریقوں پر ڈال دیا ہے۔ جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ یہاں علامہ جمال دین افغانیؒ کے وہ الفاظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں جو اپنے اندر ایک مذہبی انقلاب پنہاں رکھتے ہیں وہ فرماتے ہیں ترجمہ :۔ اگر ہم یورپ والوں کو دین کی طرف دعوت دینا چاہتے ہیں۔ تو ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ ہم یورپ والوں کو یقین دلا دیں۔ کہ خود ہم مسلمان نہیں ہیں کیونکہ یورپ والے قرآن کے اندر سے ہمیں یوں دیکھتے ہیں جیسے انگلیوں کے شگافوں سے چہرہ دیکھا جاتا ہے۔ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کے پیچھے ایسی قومیں موجود ہیں جن میں جہل، نا اتفاقی۔ اور سستی پھیلی ہوئی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ کتاب اصلاح کی کتاب ہوتی تو اس کے ماننے والے اس قدر ابتر و پراگندہ نہ ہوتے (ماخوذ از تاریخ افکار دستان)

غرضیکہ قرآن کی ان لمبی چوڑی تفاسیر، غیر فطری قرأت اور غیر فطری اصولِ عمل نے نہ صرف ہمکو قرآن کے عمل ہی سے محروم کر دیا ہے بلکہ ہمیں اس غلط فہمی میں بھی مبتلا کر دیا ہے کہ ہم خدا، رسولؐ اور

دین سے دور ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو خدا کی چہیتی امت تصور کرتے ہیں اور یہ احساس تک نہیں کہ ہم خدا، قرآن اور اسلام سے نافرمانی کے باعث عذابِ الٰہی کے مستحق ہو چکے ہیں۔ اور نہ ہی ہم نے عملی تجاویز اختیار کرنیکی کبھی سعی کی ہے۔ نیز یہ امر بھی قابلِ غور ہے

شریعت اسلامی کے انعقاد میں تعطل

امر یہ ہے کہ کافی مدت سے مسلمانانِ عالم (سوائے چند ایک مخصوص خطوں کے جو کہ اسلامی قانون کے نفاذ کے مدعی ہیں) قرآن و سنت کے مطابق قوانین و ضوابط کے انعقاد سے محروم رہے ہیں۔

دراصل غیر اسلامی اور طاغوتی طاقتیں اپنی مختلف صورتوں میں دنیائے اسلام پر کافی مدت سے اس بری طرح سے مسلط رہی ہیں کہ مسلمانوں کو اس کا موقع ہی میسر نہ آسکا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے مقرر کردہ اُن قوانین و ضوابط کے تحت نظامِ حیات اختیار کرتے جو کسی بھی لحاظ سے منشائے فطرت کے خلاف ثابت نہ کیا جاسکتا۔

لیکن اب جبکہ مسلمانوں کی اکثریت قانونی طور پر صرف آزادی و حریت کی بفضل تعالےٰ خود مالک ہے بلکہ اقوامِ عالم کی امامت و قیادت کے لئے بھی شاہراہ ترقی پر گامزن ہے تو ایسی حالت میں انہیں لازم ہے کہ تکوینی امور میں پابندی کی مانند تشریعی امور میں بھی خدائی احکام کا پابند ہو کر تعمیر مستقبل

مثلِ مسلم" ہونے کا ثبوت دیں۔ تاکہ وہ منشائے خداوندی کے مطابق خلیفۃ اللہ بنکر اقوامِ عالم کی امامت و قیادت کی باگ ڈور سنبھال سکیں۔

اگر ہم نظامِ کائنات کا سطحی طور پر بھی مطالعہ کریں تو ہمارے سامنے اس حقیقت کے تسلیم کئے جانے میں کوئی امر مانع نہ ہوگا کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ قوانینِ قدرت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ مثلاً یہ سورج، چاند، ستارے، ہوا، پانی، سمندر، جمادات، نباتات، حیوانات سب کے سب قدرت کے قوانین و ضوابط کے مطابق اپنے اپنے عمل میں ابتدائے آفرینش سے مصروف ہیں۔ سورج کبھی مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع نہیں ہوا۔ چاند کبھی اپنے وقت سے پس و پیش نہیں ہوتا۔ اگر انسان اپنے آپ میں ہی غور کرلے تو معلوم ہوگا کہ اُس کے تمام اعضاء بھی ایک قانون ہی کے تحت پرورش پا رہے ہیں اگر وہ اپنے اعضاء کی پرورش میں حفظانِ صحت کے اصول کی پابندی ترک کر دے تو اُس کی تندرستی فوراً بیماری میں تبدیل ہوکر اُس کی زندگی کو دوبھر کر دے گی۔ اگر انسان اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی مشین کو اپنے اصولوں کے مطابق نہ چلائے تو اُس کی وہ مشین بھی کارآمد ثابت نہیں ہوسکتی بلکہ اُس سے نقصان کا اندیشہ ہوگا۔ اگر ایک شخص اپنی موٹر یا کار

بنایا گیا ہے کہ سڑک کے بائیں اور وہ ہاتھ سے اس کے اصولوں کے مطابق
نہ چلا سکے یا ایسی شاہراہ پر جہاں بائیں ہاتھ چلنے کا قانون نافذ ہو
بائیں ہاتھ کی بجائے دائیں ہاتھ پر چلا سکے۔ تو اس کی گاڑی کسی
دوسری گاڑی یا موٹر سے ٹکرا کر نہ صرف خود پاش پاش ہو جائیگی
بلکہ دوسرے کو بھی نقصان پہونچا دیگی۔

اسیطرح اگر ہم ان حیوانات پر غور کریں جو قدرت نے
ہمارے قبضے میں دے رکھے ہیں تو وہ بھی ایک لگام، زنجیر،
یا رسی کے بغیر نہیں رکھے جا سکتے مثلاً ہم اپنے گھوڑے کو ضرور
اصطبل میں زنجیر سے بند رکھیں گے ورنہ وہ خرابی پھیلائیگا
چلانے کے وقت اس کے منہ میں لگام دیں گے تاکہ وہ ہماری مرضی
کے مطابق چلتا رہے۔ اسیطرح ایک بیل یا اونٹ جس کی ناک میں
نکیل یا نتھ۔ ہم ایک وقت پر باندھے رکھتے ہیں اور دوسرے
وقت انہیں کسی خاص اصول کے مطابق کھول دیتے ہیں۔ پس
جس طرح ایک حیوان کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لئے انسان نے
لگام، زنجیر اور رسی ایجاد کی ہے۔ اسی طرح انسان کو اپنے قبضے
میں رکھنے کے لئے اس کے بنانے والے (خالق تعالیٰ) نے کچھ
قوانین و ضوابط رکھے ہیں۔ تاکہ یہ انسان جس میں حیوانی جذبہ بھی موجود
ہے۔ حیوانیت کے اسفل سے نکل کر شرافت کی معراج تک پہنچ
سکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

آیت ۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ الخ ۔ کہ ہم نے انسان کو ایک خوبصورت انداز میں بنایا ۔ پھر اس کے اعمال بد کی بدولت اس کا رخ اسفل السافلین (حیوانیت) کی طرف پھیر دیا ۔ یعنی روح انسانی کا رخ روح حیوانی کی طرف پھیر دیا ۔

علماء روحانی نے روح انسانی سے مراد عقل اور روح حیوانی سے مراد نفس لیا ہے ۔ سید علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ "کشف المحجوب" میں فرماتے ہیں کہ انسان کے نفس کو سات شہوات دی گئی ہیں ۔ جن کے نام یہ ہیں دیکھنا ۔ سننا ۔ بولنا ۔ چھکنا ۔ چھونا ۔ سونگھنا اور سوچنا اور ان تمام شہوتوں پر ایک طرف حیوانی حرص کو مسلط کر دیا گیا ہے اور دوسری طرف عقل کو انہیں اپنی حدود میں رکھنے پر مامور کیا گیا ہے ۔

ہر شخص کی آنکھیں یہ چاہتی ہیں کہ کائنات کی تمام خوبصورتی کو دیکھتی رہیں ۔ لیکن شریعت نے ان کے لئے بعض مقامات پر حد مقرر کر دی ہے ۔ مثلاً یہ پابندی ہے کہ وہ پرائی عورتوں کو نہ دیکھا کریں ۔ کیونکہ اس میں اسکی حرص بڑھتی ہے اور آدمی کا دل اپنی بیوی سے ہٹ کر غیروں کی محبت میں مبتلا ہو کر جس سے فساد برپا ہونے کا خطرہ ہے ۔

اُس کے کان یہ چاہتے ہیں کہ وہ آواز یں سنیں لیکن شریعت کی پابندی یہ ہے کہ وہ فحش فلمی گانے یا اور بیہودہ قسم کی باتیں نہ سنیں۔ جس سے انسان کا اخلاق بگڑ کر فساد کا موجب بنتا ہے اس لئے قدرت نے اس کے لئے بھی حد مقرر کر دی ہے کہ وہ ایسی باتیں نہ سنا کرے جس سے اُس کا اخلاق خراب ہونے کا خطرہ ہو یا اُس کے گناہ میں پھنسنے کا اندیشہ ہو۔

اسی طرح زبان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بولے۔ لیکن شرعی پابندی یہ ہے کہ وہ جھوٹ نہ بولے کیونکہ اگر وہ جھوٹ بول کر اپنا مطلب نکالے تو دوسرے انسان کے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یا فضول بکواس، لغو بات، گالی گلوچ کیا کرے تو دوسروں کو آزار پہنچنے کا خطرہ ہے۔ اس لئے قدرت نے اُس کے لئے بھی حد مقرر کر دی ہے تاکہ انسان کو ایسی باتوں سے روکا جائے جس میں انسانیت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو۔

غرض یہ کہ نفسانی ہر شہوت کے ساتھ حرص لگی ہوئی ہے اس لئے قدرت نے فرمایا ہے۔ وَمَن یُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔ جو بھی نفسانی حرص یا لالچ سے بچا وہ فلاح یافتہ ہو گیا یعنی دین و دنیا میں پا گئے ؟ اور چونکہ نفس کو خشیتِ الٰہی یعنی خدا کے خوف کے بغیر حرص سے نہیں

سے رو کرنا محال ہے لہذا اللہ تعالے نے فرمادیا ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۔ اور جو کوئی بھی اپنے رب کے حضور بکثرت ہولے سے ڈرا اپنے نفس کو حد سے بڑھی ہوئی خواہشات سے روکا اس کا گھر جنت ہے۔

پس معلوم ہوا کہ انسان کا نفس بھی اس حیوان کی مانند ہے جس کے منہ میں اس نے لگام دے رکھی ہے اور چونکہ انسان چونکہ خدا کی "احسن تقویم" اور اشرف المخلوقات ہے اور اسے عقل بھی عطا کی گئی ہے۔ لہذا اس کے لئے قدرت نے لگام، زنجیر یا رسی کے بدلے قوانین و ضوابط کھینچ دیئے ہیں۔ اور فرمادیا ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ پ۴ النساء ع ۲ ۔

ترجمہ:- یہ خداوند کی حدود یعنی ضابطے ہیں۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا۔ تو اللہ تعالے اس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا۔ جن کے نیچے نہریں

جاری ہوں گی وہ ہمیشہ ہمیشہ اُن میں رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا اور اُس کے ضابطوں سے نکلے گا تو اللہ اُس کو آگ میں داخل کرے گا اس طور سے کہ وہ اُس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اُسے رسوا کن سزا دی جائے گی۔

اور انہیں قوانین وضوابط کو قرآن نے دین کے نام سے بھی موسوم کیا ہے۔ جیسے کہ ارشاد خداوندی ہے۔ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِي دِيْنِ الْمَلِكِ اس طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کے لیے تدبیر نکالی (ورنہ) اُن کو اس بادشاہ کے دین (قانون) کی رو سے یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کو پکڑ لیتا۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِي دِيْنِ اللّٰهِ۔ ترجمہ۔ زانیہ اور زانی دونوں کو سو سو کوڑے مارو اور اللہ کے دین (قانون) کے بارے میں تمہیں اُن پر رحم نہیں کرنا چاہیئے۔

جب یہ ثابت ہوا کہ دین سے مراد قوانین وضوابط اور وہ طور طریقے ہیں جن پر انسان اپنی زندگی گذارتا ہے۔ تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسانوں کے رائج کردہ تمام رسم ورواج اور خود ساختہ طور طریقوں پر خداوندی ضابطوں کو غالب کرنا

ایک مسلمان کا فرض اولین ہے۔ کیونکہ اللہ تبارک و تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ
وہ اللہ تو ایسا ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور سچا دین (یعنی فطرتِ انسانی کے مطابق قانون) دیکر اس لئے بھیجا ہے کہ وہ اس قانون کو تمام (خود ساختہ) قانون پر غالب کر دے چاہے شرک کرنے والوں کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے بلکہ قرآن نے تو ایک جگہ اُن قانون سازوں کو جو اللہ تعالےٰ کے قانون کے خلاف خود ساختہ طور طریقوں پر قوانین بناتے ہیں "شرکاء" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ارشاد ہے۔ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ ۔
کیا انہوں نے کچھ شریک ٹھہرا رکھے ہیں جو اُن کے لیئے دین کی قسم سے ایسے قوانین بناتے ہیں جن کا اللہ تعالےٰ نے اذن نہیں دیا اور ارشاد ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝ ۔
کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعوے کرتے ہیں۔ کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی ہے۔ اور

اُن کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے نازل ہو چکے ہیں اپنے مقدمے
غیر الٰہی قانون کے تحت فیصل کرنا چاہتے ہیں حالانکہ اُن کو یہ حکم
ہوا ہے کہ غیر الٰہی قانون کو نہ مانیں۔ اور شیطان اُن کو
بھٹکا کر گمراہی میں بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔ مزید ارشاد
ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ خدا کے
نزدیک قابل قبول صرف اسلامی قانون ہی ہے۔ وَمَنْ
یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ۔ جس نے
اسلامی قانون کے سوا کوئی اور قانون (دین) اختیار کیا
وہ اُس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ اور آخر میں قرآن نے
دو ٹوک فیصلہ دے دیا ہے اور فرمایا۔ فَلَا وَرَبِّکَ
لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَہُمْ
ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِہِمْ حَرَجًا مِّمَّا
قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝ پھر قسم ہے آپ کے
رب کی کہ یہ لوگ اُس وقت تک ایماندار نہ ہوں گے
جب تک یہ بات نہ ہو کہ اُن کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو
اس میں یہ لوگ آپ سے (یعنی قرآنی قانون سے) فیصلہ
کرا لیں اور پھر آپ کے فیصلہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ
پاویں اور اسے پورا پورا تسلیم کر لیں ـــ لیکن افسوس
ہے کہ ہم آج تک اپنے آپ کو اس قابل نہ بنا سکے۔ کہ اسلام

قانون کو تمام رسم و رواج اور خود ساختہ طور طریقوں اور قوانین و ضوابط پر غالب کر سکیں

موجودہ مسلمانوں کا سپاہیانہ زندگی سے غافل ہونا :-

اور چودھویں بات جس نے میرے ذہن کو پریشان کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان جو پیدائشی سپاہی تھا۔ آج سپاہیانہ زندگی سے غافل ہو کر سستی اور کاہلی کا شکار ہو گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آج کل کی جنگوں میں صرف فوجیں ہی ایک دوسرے سے لڑا کرتی ہیں۔ اور جن ممالک کے پاس زیادہ ہوائی جہاز، طیارے، توپیں، مشین گنیں ٹینک، بم، اسلحہ، بارود، ایٹم اور ہائیڈروجن بم ہوں گے۔ اور جن کے پاس ان اسلحہ کو استعمال کرنے کے لئے کافی فوجی سپاہی ہوں گے، وہ غالب و کامران ہوں گے مگر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دفاعی اور جارحانہ جنگوں میں فوجیں عوام کی امداد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ دنیا میں آج تک جتنی جنگیں لڑی جا چکی ہیں۔ اُن سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فتح کا سہرا صرف اُسی قوم کے سر ہے۔ جس کے عوام میں نہ صرف دفاعی جنگوں میں دشمن کا مقابلہ کرنے اور اس کا گوریلا لڑائی کے ذریعے ناک میں دم کر دینے اور شکست فاش

وسیلے دینے کی صلاحیت اور اہلیت موجود ہو، بلکہ
جارحانہ حملوں میں بھی دشمن کو تشویش کے بل چھٹا دینے یا
اُس کا قصہ ہی پاک کر دینے میں اپنے لشکر کی پشت پناہی کا
آہنی ہاتھ ہو۔ جرمنی اور روس کی جنگ سے یہ نہیں سمجھ
سکھا دیا ہے کہ اگر دشمن کی فوجیں کیوں نہ ماسکو اور
سٹالن گراڈ جیسے مضبوط اور مستحکم دیواروں تک ہی داخل ہو
جائیں، تو بھی اگر قوم میں دفاعی صلاحیت اور مسلسل مقابلہ
لڑنے کی موجود ہو تو شکست فتح سے تبدیل ہو سکتی ہے
لیکن یہ سب کچھ اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ قوم کو رضاکارانہ
طور پر ان جدید قسم کے آلاتِ جنگ اور جدید لشکری
تقاضوں سے بہرہ ور اور واقف کر دیا جائے۔ اگر یہ
علم وقت پر، اگر جنگ چھڑی تب آکر سکھلایا جائے تو کچھ
نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ جدید قسم کے جنگی ہتھیاروں اور
جنگ کے طریقوں سے ناواقف ہوں گے، بلکہ جو عمر بھر
رائفل اور ریوالور تک کے استعمال سے بھی محروم رہے
ہوں گے وہ موجودہ زمانے کے جدید آلاتِ جنگ
سے لیس قوموں کا مقابلہ کس طرح کر سکیں گے؟ یہی وجہ
ہے کہ خدا اور اُس کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کو یہ تعلیم
دی ہے کہ وہ ہر مسلمان کے دل میں جہاد فی سبیل اللہ کا

جذبہ پیدا کرتے جاویں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَیُدْخِلْکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَھَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ الصف ع ۲

ترجمہ:۔ اے مومنو! کیا میں تمکو ایک ایسی سوداگری بتلا دوں؟ جو تمکو ایک دردناک عذاب سے بچا لے۔ (عذاب الیم سے دنیا وی عذاب بھی مراد ہوتا ہے۔ جو فاتح اقوام کے ہاتھوں غلام قوموں کو ملا کرتا ہے) یہ بچنے کی صورت یوں ہوگی کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی بات مان لو اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو یہ تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کردیگا۔ اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور تمہیں عمدہ و پاکیزہ مکانات دے گا جو باغات عدن میں ہوں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے

اور ایک چیز تمہیں اور بھی ملیگی جس کو تم بہت پسند کرتے ہو۔ اور وہ اللہ کی مدد اور جلد ہی فتحیاب ہونا ہے۔ اور (اے پیغمبر) مومنین کو ان انعامات خداوندی کی خوش خبری سنا دیجئے "

قرآن نے بار بار مسلمانوں کو یہ تلقین کی ہے کہ وہ ہر وقت دشمنوں کے مقابلے کے لئے تیار رہیں بلکہ خدا کے ہاں ایمان اور محبت خداوندی کا صحیح معیار یہ ہے کہ اس کی راہ میں جان اور مال سے جہاد کیا جائے اور دشمن کے مقابلے میں جان پر کھیل کر اور مال کو قربان کر کے مصائب کا مقابلہ کیا جائے اسی لئے قرآن نے فرمایا کہ۔ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّۃَ ط یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط وَمَنْ اَوْفٰی بِعَہْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ ط وَذٰلِکَ ہُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (پ ۱۱ سورۂ توبہ ع ۱۴) ترجمہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے اُن کی جانیں اور مال اُن کو جنت کے عوض میں اس شرط پر خرید لیا ہے، کہ وہ اللہ کی راہ میں لڑیں۔ مخالفین کو بھی قتل کریں اور خود بھی مارے جائیں۔ ان سے سچا وعدہ کیا گیا ہے۔ توریت میں انجیل میں اور قرآن میں۔ اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اپنے وعدہ کو اور کون پورا کرنے والا ہے

پس تم اپنے اس سودا پر خوشی مناؤ اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

دیکھا آپ نے۔ قرآن کس طرح واضح دلائل کے ساتھ۔ مسلمان کو جہاد کا شوق دلاتا ہے، اور ان کے دلوں میں جہاد کا جذبہ پیدا کر کے انہیں قتال فی سبیل اللہ کے لئے تیار کرتا ہے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ جذبہ اس قدر موجزن تھا کہ تسمیہ فرمایا کرتے تھے۔ الحدیث وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلَ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلَ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلَ (بخاری۔ مسلم)

ترجمہ:۔ فرمایا رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہ مجھے اُس ذات تعالےٰ کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ میں اس بات کو محبوب رکھتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں۔ پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا پھر قتل کیا جاؤں۔

علامہ ابوالاعلےٰ مودودی صاحب اپنی تصنیف "الجہاد فی الاسلام" میں لکھتے ہیں "حفاظت دین اور مدافعت دیارِ اسلام کا حکم ایسا سخت ہے کہ جب کوئی قوت اسلام کو مٹانے اور اسلامی نظام کو فنا کرنے کے لئے حملہ آور ہو تو تمام مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ کہ سب کام چھوڑ کر اس کے مقابلہ پر نکل آئیں اور جب تک اسلام اور اسلامی نظام کو اس خطرہ سے محفوظ

نہ کرلیں اس وقت تک جہاد نہ کریں۔

چنانچہ فقہ کی تمام کتابوں میں یہ حکم موجود ہے کہ جب دشمن دار الاسلام پر حملہ کرے تو ہر مسلمان پر فرداً فرداً دفاع کا فریضہ ایسی قطعیت کے ساتھ عائد ہو جاتا ہے، جیسے نماز، روزہ۔ فقہ کی مشہور کتاب "بدائع الصنائع" میں لکھا ہے۔ ترجمہ "مگر جب اعلان عام ہو جائے کہ دشمن نے اسلامی ملک پر حملہ کیا ہے تو پھر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ اور ہر مسلمان پر جو جہاد کی قدرت رکھتا ہو فرداً فرداً اس کی فرضیت عائد ہو جاتی ہے۔ ۔۔۔ نفیر عام ہو جانے کے بعد تو اس فرض کا حق بغیر اس کے پورا ہی نہیں ہوتا کہ سب کے سب جہاد کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ اس وقت وہ سب مسلمانوں پر اس طرح فرض عین ہو جاتا ہے، جیسے روزہ اور نماز، لہٰذا غلام کو بغیر آقا کی اجازت کے اور عورت کو بغیر اپنے شوہر کی اجازت کے نکلنا چاہئے کیونکہ ان عبادات میں جو فرض عین ہیں غلام اور عورت کی خدمات آقا اور شوہر کی ملک سے مستثنیٰ ہیں جیسے نماز اور روزہ۔ اسی طرح بیٹے کے لئے مباح ہو جاتا ہے کہ وہ بغیر والدین کی اجازت کے نکل کھڑا ہو کیونکہ روزہ، نماز جیسے فرائض اعیان میں والدین کا حق استثنائی نہیں ہو سکتا۔"

علامہ موصوف آگے لکھتے ہیں "یا ان تجمم العدو علی البلد" کے الفاظ صاف طور پر بتلا رہے ہیں کہ یہ فرضیت کسی ایک طرف اس

صورت پر موقوف نہیں ہے کہ خاص مذہبی جذبہ سے متاثر ہو کر کوئی قوم اسلام کو مٹا دینے پر آمادہ ہو جائے بلکہ حکومت اسلامیہ اور دیار اسلام پر ہر قاصبانہ حملہ کے مقابلہ میں مدافعت اسی قطعیت کے ساتھ فرض ہے۔ اسلام میں مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے حریت و استقلال سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔ اپنی آزادی کو کھو دینے کے بعد صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں میں انسانیت کی اس اعلیٰ خدمت کو ادا کرنے کی قوت باقی نہیں رہتی جسے ادا کرنے کے لئے وہ پیدا کئے گئے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے شرعی نظام کو قائم رکھنے کے قابل بھی نہیں رہتے جس پر ان کی مذہبی زندگی کا دارومدار ہے۔ اس لئے اسلامی حکومت اور اسلامی قومیت پر حملہ کرنا در اصل اسلام پر حملہ کرنا ہے اور خواہ کسی دشمن کا مقصد اسلام کا مٹانا نہ ہو بلکہ محض مسلمانوں کی سیاسی قوت ہی کو مٹانا ہو تب بھی اس سے جنگ کرنا مسلمانوں کے لئے ویسا ہی فرض ہوگا۔ جیسا اسلام کو مٹانے والے سے جنگ کرنا ہے"

اب یہ بات تو محقق ہو چکی کہ جب کوئی دشمن اسلامی مملکت پر حملہ آور ہو جائے تو قرآن و سنت اور فقہ اسلامیہ کی رو سے ہر مسلمان پر فرداً فرداً جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ آیا اس وقت جبکہ دشمن کی فوجیں ہماری سرحدات کے اندر گھس آئیں جس کے باعث مسلمان مرد و زن پر فرداً فرداً جہا

لوگ جن کی توند نکلی ہوئی۔ تلی بڑھی ہوئی اور چہرے زرد ہوں۔ عین
وقت پر ایسی جنگوں میں کیا حصہ لے سکیں گے اور دوسرے عوام بھی
تنگ وقت میں کیا تربیت حاصل کر سکیں گے۔

اسی لئے تو قرآن ایسے لوگوں کے متعلق جو پہلے از وقت تیاری
نہیں کرتے فرماتا ہے " وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً " ۔
اگر یہ لوگ نکلنے کا ارادہ رکھتے تو کم از کم اس کے لئے کچھ تیاری
تو کر لیتے۔

اور اسی خطرے کے پیش نظر قرآن نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے
وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ
تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن
دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنفِقُوا
مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ
(سورۃ الانفال ع ۸) اور ان کافروں کے مقابلے کے لئے اپنی پوری
طاقت (یعنی سامان حرب) اور گھوڑوں کے رسالے تیار رکھو
یعنی اپنے فوجی نظام اور دفاع پر اپنی پوری قوت خرچ کر کے اس
ٹھاٹ سے رہو کہ تمہاری شمشیر خارا شگاف سے نہ صرف اللہ
کے دشمن اور تمہارے دشمن اپنے فولادی قلعوں میں دہشت زدہ
ہوں بلکہ وہ لوگ بھی تم سے مرعوب ہو جائیں جو بظاہر تو تمہارے
دشمن معلوم نہیں ہوتے لیکن باطن تخریبی کارروائیاں کر کر کے تمہارا

بخشی کرتے ہیں اور جن کی دشمنی کا تمہیں علم نہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کو خوب جانتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں تم جو کچھ خرچ کرو گے وہ تم کو پورا پورا دیا جائے گا اور اس بارے میں تمہاری کوئی حق تلفی نہ کی جا سکے گی۔

تاریخ گواہ ہے۔ کہ جب تک قرون اول میں بھی مسلمان زبانی دعوت و تبلیغ پر اکتفا کئے بیٹھے تھے اُس وقت تک اُن کی حالت یہ تھی کہ کفار مکہ نے متواتر ۱۳ سال تک اُن کی زندگیاں تلخ کر دی تھیں اور آخر نوبت یہاں تک پہونچی کہ گھروں سے بھی نکل جانے پر مجبور کئے گئے۔ لیکن جوں ہی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جہاد کا دروازہ کھولا اُسی وقت سے اشاعت اسلام میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہونی شروع ہو گئی۔ خود اللہ تعالیٰ نے جہاد فرض کرتے وقت ایک عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (البقرہ ع ۲۶)

ترجمہ (اے مسلمانو!) تم پر جہاد فرض کر دیا گیا ہے۔ اور تم اُس کو گراں سمجھتے ہو حالانکہ یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو۔ اور ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خرابی ہو اور اللہ تعالیٰ

جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔

دراصل اللہ تعالیٰ کو چونکہ انسان کی فطرت کا علم ہے وہ جانتا ہے کہ مردہ قوموں کو زندگی بخشنے۔ گری ہوئی اقوام کو بام عروج پر پہنچا لینے، مفلوج و مفتوح اقوام کو غالب اور فاتح بنا لینے۔ اور فطرت انسانی کے تقاضوں سے غافل اور کمزور ترین اقوام کی مردہ رگوں میں گرم خون کی لہر دوڑا دینے کے لئے جہاد ہی سب سے بڑی اکسیر ہے۔ نہیں بلکہ خدا پرستی سے انکار کرنے والے سرکشوں کی "گردنوں کو توڑ کر رکھ دینے" کے لئے جہاد ہی سب سے بڑا اقدام ہے۔ جہاد فطرت انسانی کا وہ گوہر نایاب ہے جسے کسی حالت میں بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا تھا اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ اگر ایک طرف ظالم، باغی و جابر اقوام کے خلاف تلوار اٹھانا، اور اعدائے انسانیت پر برق کی طرح چمکنا اور رعد کی طرح کڑکنا اور ظلمت کی تاریکیوں کو شمشیر خارا شگاف کی چمک سے پارہ پارہ کر دینا ضروری ہے۔ تو دوسری طرف شکست اقوام کی رفتار کو تیز کر لینے انہیں منفید خلائق بنانے اُن کی مُردہ رگوں میں خون کی ایک برقی لہر دوڑا دینے کے لئے بھی مجاہدانہ سپرٹ کی نہایت ضرورت ہے مسلمانوں کے ضعف کو قوت سے بدل دینے کے لئے بھی تلوار کو اٹھانا ضروری تھا۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر کے متعلق فرمایا ہے۔ وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ

وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ

(پ ۹ الانفال ع ۱) ترجمہ:- اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب کہ اللہ تعالیٰ تم سے اُن دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کرتے تھے۔ کہ وہ تمہارے ہاتھ آجاوے گی اور تم اس تمنا میں تھے کہ غیر مسلح جماعت تمہارے ہاتھ آجاوے اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اپنے احکام سے حق کا حق ہونا ثابت کر دے اور ان کافروں کی بنیاد کو قطع کر دے۔ تاکہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت کر دے چاہے یہ مجرم لوگ ناپسند ہی کریں۔

واقعہ یوں ہوا کہ مدینہ منورہ سے آنحضرتؐ اور بھی بزرگان یہ خبر سنکر نکلے تھے کہ ابوسفیان کا قافلہ شام سے کچھ مال لیکر ادھر سے گذرے گا۔ اسی دوران میں اُدھر مکہ سے کفار کے ہزار آدمیوں کی جمعیت ابوسفیان کی مدد کے لئے آگئی۔ تو بعض آدمیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ ہم تو فقط ابوسفیان کا قافلہ لوٹنے کی نیت سے نکلے تھے۔ لڑائی کی حسب دلخواہ ہمیں اس وقت طاقت نہیں ہے۔ تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ قافلہ یا نصرت الٰہی ہمارے ہاتھ لگنے کی لوٹ چاہنے لگے

کہ قافلہ ہاتھ لگے۔ مگر چونکہ بہتر یہی تھا کہ کفر کا زور ٹوٹ جائے اسی لئے
اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "تم تو اس تمنا میں تھے کہ غیر مسلح قافلہ تمہارے
ہاتھ آجاوے مگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ کفر کا زور ٹوٹے اور
حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا بھی ثابت ہو جائے" لہذا یہاں
یاد دلایا کہ وہ وقت قابل ذکر ہے جب تم خالص لوٹ مار کا مال چاہتے
تھے مگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں جہاد کے ذریعے فاتح بھی بنایا اور
مال غنیمت بھی تمہارے ہاتھ دے دیا۔

یہاں جو نکتہ واضح کر دینا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ گو جہاد
کرنا یا اس کی تیاری میں قبل از وقت جان کھپانا کا دگران ہے
مگر اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ قوموں کے
عروج کا دار و مدار کبھی سپاہیانہ زندگی پر ہی ہے۔ اگر کوئی قوم
اپنے دشمن کو گھٹنوں کے بل جھکا دینے یا اس کا قصہ ختم کر دینے
کی صلاحیت و اہلیت نہیں رکھتی تو اسے اس دنیا میں زندہ رہنے
کا کوئی حق نہیں۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام
کو یہ تاکید فرمائی ہے کہ: یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی
الْقِتَالِ ۔ اے نبیؐ! مسلمانوں میں ولولۂ جنگ (جہاد)
پیدا کرو! حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ: جہاد
جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ
نے اپنے خاص دوستوں کے لئے کھول رکھا ہے۔ جہاد لباس تقویٰ ہے

جہاد اللہ کی زرہ محکم اور سپر قوی ہے۔ پس جو اسے ترک کرے خدائے بزرگ و برتر اسے جامۂ ذلت و خواری اور ردائے بلا و گرفتاری پہنا دیتا ہے۔ پس وہ اپنی پستی و حقارت کے باعث زبون بن کر رہ جائے گا۔ اور اس کے دل پر بے عقلی کے پردے ڈال دیئے جاویں گے۔ پھر وہ جہاد نہ کرنے اور اس امر مہم کی اہمیت نہ سمجھنے کے باعث راہ حق سے دور ہو جائیگا اور راہِ باطل پر چلنے لگیگا۔ اور نکبت و بے چارگی میں مبتلا ہو جائے گا۔ عدل و انصاف سے محروم ہو جائے گا۔ (نہج البلاغ)

لیکن افسوس ہے کہ آج کا مسلمان سپاہیانہ زندگی سے قطعی طور پر غافل ہو چکا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ اس کے اندر سے مفقود ہو چکا ہے اس کی رگوں میں وہ گرم خون جو قوموں کو زندگی عطا کرتا ہے "سرد ہو چکا ہے۔ اس کے حق میں "اشدّاء علی الکفار رحماء بینہم" کی قرآنی تفسیر الٹی ہو چکی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج وہ دوسروں کا دست نگر ہے۔ بلکہ دوسروں کے رحم و کرم پر جی رہا ہے افسوس کہ آج کل کوئی ایسا "مرد قلندر" بھی نظر نہیں آتا۔ جس کی آواز میں مردہ قوموں کو زندہ کر دینے والی مسیحائی ہو۔ یا جس کی للکار میں قوم کے نوجوانوں کی رگوں میں بجلی دوڑا دینے والی تاثیر ہو جو عصائے موسیٰ کی طرح عدو انسانیت پر اژدھا کی طرح نمودار ہو۔ اور جو پہاڑوں کو چیر دینے والی قوتِ ایمانی کا مالک ہو۔ اور نہ ہی کوئی

ایسی جماعت نظر آتی ہے کہ جس کی قوت اور ہیبت سے دشمنانِ اسلام ایک ماہ کی مسافت پر اپنی فولادی قلعوں میں بھی لرزہ براندام ہوں

اقتصادی بدحالی اور لادینی کا تسلّط

پندرھواں غور طلب امر یہ ہے کہ مسلمان عوام اقتصادی بدحالی کا شکار ہیں جس کے باعث یہ خطرہ ہے کہیں ان پر اشتراکیت کا لادینی اقتصادی فلسفہ اثر انداز نہ ہو جائے۔

آج کی دنیا کے سامنے انسانیت کی فلاح و بہبود کے مسائل ہیں سب سے اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ عام انسانوں کو معاشی بدحالی سے کیسے بچایا جائے۔ ادھر مغربی سرمایہ دارانہ نظام انسان کے معاشی مسائل کو ایک طریقے سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ادھر روسی اشتراکی نظام ان مسائل کو دوسرے طریقے سے حل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ دونوں نظام اس مسئلہ کے حل میں بالکل متضاد نظریات رکھتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سارے جہان میں اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظاموں کے حامی ممالک کے مابین ایک عالمگیر ٹکراؤ کی صورت ہر وقت اور ہر جگہ موجود رہتی ہے گو اقوامِ متحدہ کے تمام ممبر ممالک اس بات میں کوشاں ہیں کہ ہر ممکن طریقہ سے اس آنے والی عالمگیر جنگ کو روکا جائے۔ جس کی آتش مذکورہ بالا ملکوں کے اندر ہر وقت سلگتی رہتی ہے۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ خود تمام ممبر ممالک اپنی اپنی جگہ پر ظاہر و مخفی طور پر اس متوقع عالمگیر جنگ کے لئے پوری طاقت کے ساتھ مسلح ہو رہے ہیں

کمیونسٹ اور سرمایہ دار ممالک اس وقت نہ صرف اپنی جنگی تیاریوں میں ہی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں دن رات ایک کر رہے ہیں۔ بلکہ دوسری ممالک کی حکومتوں کو بھی اپنے اپنے گروپ میں شامل کرنے کے لیئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور اس مقصد پر اربوں روپیہ صرف کئے جا رہے ہیں۔

اشتراکیت اور سرمایہ داری کی ان اضطرابی کوششوں اور بے تحاشا دوڑ دھوپ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل بات نہیں اور نہ ہی بعید از قیاس ہے کہ زمانہ قریب میں یہ دونوں طاقتیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر نہ صرف خود ہی پاش پاش ہو جائیں گی بلکہ باقی دنیا کو بھی اپنے ہمراہ ہلاکت کے جہنم میں جھونک دیں گی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ ایک عظیم الشان عالمگیر جنگ ہو بھی جائے تو کیا وہ تصورات مٹ جائیں گے جن پر اشتراکیت اور سرمایہ داری کے نظام موجود و قائم ہیں تو یہ کہوں گا کہ اس حالت میں یہ دونوں نظام باہمی تصادم میں مہلک بیماری کی طرح اور شدید صورت اختیار کر جاویں گے اور انسانیت کو مزید پریشانیوں کا شکار کر دیں گے۔ یعنی باہمی ٹکراؤ کی دائمی صورت قائم رہنے کا امکان ہے۔ پس ہمارے نزدیک اشتراکیت اور سرمایہ داری کی کشمکش کی اس آگ کو جس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، ٹھنڈا کرنے کا علاج جنگ نہیں۔

کیونکہ اشتراکی انقلاب جو کارل مارکس اور لینن کے فلسفہ اور نظریہ کو مزدوروں، کسانوں، اور محنت کشوں کے ہاتھوں عملی جامہ پہنا کر برپا کیا گیا تھا۔

آج کئی ایک ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لیکر ایک طوفانِ عظیم کی صورت اختیار کر چکا ہے اور جو ممالک آج تک بچے ہوئے ہیں وہ بھی اس سیلاب کے ریلے سے زیادہ عرصہ تک محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ اس کی وجہ معلوم کرنے میں تاریخ ہماری مدد کرتی ہے سرمایہ دار گروہ اور برسرِ اقتدار طبقہ نے مدتوں سے غریب عوام کو ہر ممکن طریقوں سے دبائے رکھنے کی کوشش کی۔ سرمایہ دار اور برسرِ اقتدار گروہ چونکہ قوت و اقبال کا مالک تھا۔ لہٰذا

لہٰذا غریب مزدور اور کسان طبقے کی ایک بڑی تعداد تو اپنا خون پسینہ ایک کر کے کماتے رہتے اور یہ اوپر کا مختصر گروہ اُن کی کمائی کو اپنا حق سمجھ کر بے ڈکار ہضم کرتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمانے والے محنت کش تو ذلیل و پسماندہ ہوتے گئے۔ اور ان کی کمائی کو بے ڈکار ہضم کرنے والے دولت و اقتدار کے نشہ میں انسانی اخلاق سے گذر کر کلبوں، ناچ گھروں، اور قحبہ خانوں میں اپنی رنگ رلیاں مناتے گئے۔ غضب بالائے غضب یہ کہ اُس دور میں۔ علم۔ کلچر اور مذہب کی فوقیت کا جو معیار پیش کیا گیا تھا وہ بھی برسرِ اقتدار مختصر طبقے نے اپنی خوشنودی کی خاطر اپنی مرضی اور

اور خواہشات کے مطابق خود ساختہ طور طریقوں سے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے استعمال کیا۔

لہذا اس سے اگر کوئی سکون اور اطمینان حاصل ہوتا تھا تو اوپر کے طبقے ہی کو حاصل ہوتا تھا علم و عقل کی بلندی اور ذہن کی جلا ہوتی تو اوپر کے طبقے کی ہوتی ۔تمدن و تہذیب کی برکتیں پھیلتی ہیں تو صرف اُن کے گھروں اور محلوں تک ہی محدود رہتی ہیں۔ زمینیں، جاگیریں۔ جائدادیں اور عہدے تقسیم ہوتے تو صرف انہی لوگوں تک محدود رہتے اس کے برعکس محکوموں یعنی غریب مزدوروں، کسانوں، اور محنت کشوں کو اتنی مشقت کرنی پڑتی کہ انہیں کسی بات کا ہوش تک بھی نہ رہتا اور اگر کبھی کبھار اُن کے شعور کی آنکھیں کھل بھی جاتیں تو انہیں پھر سلا دینے کی خواب آور دواؤں کی کمی نہ تھی اور بقول شاعر ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اور اس طرح جب غریب عوام پر ظلم کی انتہا ہو گئی، تو ظلم کو ظلم سے توڑنے کا ردعمل کمیونزم کی شکل میں کریملن کی بلندیوں سے نمودار ہوا۔ اُس نے انسانیت کے پسماندہ طبقوں کو للکارا! اور انقلاب کا نعرہ ان الفاظ سے بلند کیا۔

کہ "اے غریب مزدورو! کسانو! اور محنت کشو! مستقبل تمہارا ہے، سربفلک عمارتیں اور رزق کی یہ فراوانی، آرام و آسائش کے یہ ذرائع تمہاری محنت اور تمہارے خون پسینہ ایک کرنے کا ہی نتیجہ ہیں۔ دنیا کی ساری ثروت اور دولت تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہے! اٹھو! اپنے آپ کو منظم کرو! آگے بڑھو! اور ان غاصبوں سے اپنا حق بزور چھینو! یہ ساری متاع تمہاری ہے، اس پر قبضہ کرو! اور جو شخص تمہارے آڑے آئے اُسے ختم کر دو! جو علم، کلچر، مذہب اور اخلاق تمہارے سدِ راہ ہو اُس کا انکار کر دو! وہ علم ناقابلِ اعتبار ہے، وہ کلچر بے کار ہے، وہ مذہب فرسودہ ہے اور اخلاق کا وہ نظام بے معنی ہے جو سرمایہ کے سہارے زندہ ہو اور غریب کو اُس کے حق سے محروم کرتا ہو" اور ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی پیش کر دیا کہ "اشتراکیت ہی ایک ایسا فلسفہ ہے کہ جس پر عمل کرنے سے ساری کی ساری خلقِ خدا بغیر کسی رنگ نسل، ملک، یا مذہب کی تمیز کے آزادی، مساوات، اور اقتصادی خوشحالی کی نعمتوں سے فیضیاب ہو گی،

اس آواز میں عام زندگی کی ساری خوبصورتیاں، مستقبل کی اُمیدوں کی رعنائیاں اور سرمایہ دارانہ سامراج کے بوجھ تلے کراہتے ہوئے انسانوں کے لئے آگے بڑھنے کی ولولہ انگیز بار

پنہاں تھیں۔ غریبوں کی اُمیدیں بندھ گئیں ذلیل و پسماندہ انسان عزت و اقبال کے خواب دیکھنے لگے، کم ہمتوں میں جرأت اور حوصلہ پیدا ہوا اور اتفاق سے اُس وقت غریبوں، پسماندوں اور کم ہمتوں کی کثرت تھی۔ خدا کی بیشتر مخلوق دکھوں اور دردوں میں گرفتار تھی۔ چنانچہ سرمایہ داروں کی چکی میں پسے ہوئے محنت کشوں، مزدوروں اور سرمایہ دارانہ سامراج کے ظلم و ستم کی آگ سے جھلسے ہوئے انسانوں نے انقلاب کی آواز سنتے ہی نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اندھا دھند اُس کی طرف دوڑ پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج یہ عالمگیر انقلاب نہ صرف یورپ کے ایک بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لا چکا ہے۔ بلکہ ایشیائی ممالک میں سے چین جیسی عظیم مملکت کے علاوہ کئی اور ملکوں کو بھی اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔ اور بعض کو لینے کے لیے کوشاں ہے

بلکہ واقعات کی رفتار کو دیکھ کر یہ کہنا پڑے گا کہ اگر حالات یہی رہے تو یہ انقلاب یہیں تک محدود نہیں رہے گا۔ بلکہ یہ ایسا عالمگیر انقلاب ہوگا جس کا روئے زمین پر پھیل جانا ایک حقیقت بن چکا ہے۔ کمیونسٹ ممالک کی دن دگنی رات چوگنی ترقی اور معاشی خوشحالی کو چھپانا سورج کو دو انگلیوں میں چھپانا ہے۔ کمیونزم نے مزدوروں، محنت کشوں

اور غریبوں کے لئے جو معیاری کام کئے ہیں اُن کو سرمایہ دار
امپیریلزم کے جھوٹے اور نام نہاد پروپاگنڈے سے جھٹلایا نہیں
سکتا ہے۔ اگر ہم امپیریلزم کے اس جھوٹے اور نام نہاد پروپاگنڈے
میں آکر کمیونزم کے اس آنے والے عظیم انقلاب سے غافل رہے
تو ہمارے مزدور، محنت کش اور غریب عوام ہی ان کے شکار
ہوں گے۔ بلکہ ہمارے کالجوں اور مدرسوں کے طالب علم اور
دفتروں کے کلرک بھی اس ریلے میں بہہ جائیں گے اور دیکھتے دیکھتے
مذہب اور دین ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔

آپ لوگوں کو میری اس حق گوئی کا اُس وقت یقین آئے گا
یہ لوگ اپنے دجل (کمیونزم) کو دلفریب جنت اور سرمایہ دار
کی غاصبانہ اور ظالمانہ حرکتوں کو تمہارے غریبوں، محنت کش
اور مزدوروں کے سامنے جہنم کی شکل میں پیش کر کے اُن کو اپنے
لپیٹ میں لے لیں گے اور ان کا اصل عروج اُس وقت سے شروع
ہوگا جب یہ لوگ ظاہری طور پر دکھاوے یا دھوکہ دینے کی خاطر
خدا کے وجود کے قائل ہو جائیں گے اور اسلامی دنیا کی حمایت
کر دیں گے اور سرکاری طور پر مذہب کی آزادی کا اعلان کر دیں
حالانکہ یہ ان کا سب سے بڑا دجل ہوگا جو اسلامی حکومتوں کو اپنے
میں پھنسانے اور ان کے ملکوں میں پھیل جانے کی خاطر برپا کیا جا
ہی دنیائے جہان کے امن پسند انسانوں سے یہ کہوں گا۔ کہ

ں آنے والے عالمگیر انقلاب کی قوت، وسعت، شدت اور رسوائی کا
پورا اندازہ نہیں، لیکن میں تمہیں بتلائے دیتا ہوں کہ اس انقلاب
قیامت صغرا سے کم نہ سمجھو۔ یقیناً یہ حشر برپا کر کے رہے گا۔ اگر
نے اپنے ملک کے تباہ حال اور بے کس طبقوں کی خبر نہ لی۔ اگر
نے سرمایہ داروں اور برسر اقتدار طبقے کی ساحری کو توڑ کر غریبوں
مدد نہ کی۔ اپنے ملک کے باشندوں سے اقتصادی بدحالی دور نہ کی
انہیں اس حال میں رہنے دیا۔ جس میں وہ صدیوں سے جان توڑ رہے
۔ اگر تم نے اپنے اوپر کے لوگوں سے غریبوں، مزدوروں اور
نت کشوں کا غصب شدہ حق واپس نہ دلا دیا۔ اور وہ حسب سابق
لکہ ان کے غریب عوام کا خون چوستے رہے۔ اگر تم نے اپنے ملک کے
ندوں کو اچھی خوراک۔ اچھی پوشاک۔ اور
چھے مکانات۔ بآسانی مہیا کرنے میں ناکام رہے اور ان
بس و تباہ حال لوگوں کو بھوک، جہالت، ذلت، عفونت اور
ری کی دلدلوں میں بدستور پھنسے رہنے دیا۔ تو یاد رکھو کہ
تراکی سامراج کا یہ لادینی فلسفہ جو آگ کی طرح ساری دنیا میں پھیل
رہا ہے، تمہارے ملک کے تمام مزدوروں، کسانوں، مزارعوں، دکانداروں
نت کاروں، کلرکوں، دفاتر کے ادنیٰ ملازموں، غریبوں،
نت کشوں، سکول اور کالج کے طالب علموں بلکہ تمام سیاسی جماعتوں
بیوں کے مفاد سے دلچسپی رکھنے والے اداروں، انجمنوں، کمیٹیوں

بہم پہنچا کر دیں اور نہ صرف غریبوں، محنت کشوں اور مزدوروں کی اقتصادی
بدحالی کو دور کر دیں۔ بلکہ ان کو وہ مراعات بھی دے دیں جو کمیونزم
اور امپریلزم نہ دے سکتے ہوں تاکہ معاشی خوشحالی کے ساتھ ساتھ
دین اور مذہب بھی برقرار رہے اور "رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً
وَّفِی الْآخِرَةِ حَسَنَةً" (اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا
کے حسنات بھی عطا کر آخرت کے حسنات بھی) کے حکم خداوندی
کے موجب دنیا و آخرت دونوں جہان کی نعمتوں کے مالک بن
سکیں اور انسانیت کے اصل نصب العین کو پا کر رضائے الٰہی
کے صحیح حقدار بن جائیں۔

اور اس میں ہمیں نہ صرف امت اسلامیہ کو ہی کمیونسٹ سامراج کے اس
لادینی فلسفہ اور سرمایہ دارانہ سامراج کی ساحری دونوں سے محفوظ رکھنا
یا مسلم ممالک کے مسلمان کسانوں، مزدوروں، محنت کشوں اور مسلم [illegible]
کو ان سیلابوں سے بچانا ہوگا بلکہ تمام بنی نوع انسان کو بھی کمیونزم اور
سرمایہ داری کے آہنی پنجوں سے نجات دلانی ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ ملت اسلامیہ اور عالم انسانیت کو اتنے بہت خطرات
درپیش ہونے کے باوصف مسلمانوں کی کسی جماعت یا مملکت نے ان کا مقابلہ کرنے
کیلئے کوئی عملی تجاویز اختیار نہیں کیں اور نہ ہی آج تک مسلمانوں کی طرف
سے اسلامی طرز پر معاشی انقلاب برپا کرنے کا کوئی ٹھوس عملی اقدام وجود
میں آ سکا ہے۔

سولھویں بات

مسلمانوں میں منافقوں کا خلط ملط ہو جانا: مسلمانوں میں منافقت کے عادات وخصائل کا عام ہو جانا ہے

قرنِ اول میں بعض لوگ صرف اس غرض سے اسلام میں آئے تھے۔ کہ اسلام میں تخریبی کارروائیاں کر کر کے یا غلط افواہیں پھیلا پھیلا کر مسلمانوں کی جمعیت کو پارہ پارہ کر دیں۔ وہ دل سے اسلامی مملکت کے دشمن تھے۔ اور مسلمانوں سے بغض و حسد رکھتے تھے۔ مگر بظاہر اسلام لا چکے تھے۔ اور مسلمانوں کے اندر نشست و برخاست رکھتے تھے۔

قرآن ہمیں ایسے لوگوں کے متعلق یوں آگاہ کرتا ہے۔
وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ ۖ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ سَنُعَذِّبُهُمْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ ۝ پ ۱۱ التوبہ ع ۱۳ (ترجمہ) اور کچھ تمہارے گرد و پیش والوں (اعراب) میں اور کچھ مدینے والوں میں ایسے منافق ہیں۔ کہ نفاق کی حد کمال پر پہنچے ہوئے ہیں۔ آپ ان کو نہیں جانتے۔ ہم ان کو جانتے ہیں۔ سو عنقریب ہم انہیں دہری سزا دیں گے پھر وہ بڑے بھاری عذاب کی طرف بھیجے جا دیں گے۔ ایک اور جگہ قرآن ہمیں ان کی خصلتوں سے یوں آگاہ کرتا ہے۔ لَئِنْ لَمْ

کی اشیاء کو افواہوں سے مہنگا کرنے، سمگلنگ، گراں فروشی اور قحط پیدا کرنے
کے ذریعے اپنے ملک کے استعمال کی ضروری اشیاء کو غیر ممالک میں
پہنچانے، حکومت کے خلاف غلط افواہیں پھیلانے، اخبارات
کے ذریعے عوام الناس میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کرنے
اسمبلیوں میں پہنچ کر یا اسمبلی کے بعض ممبروں کو غلط راستوں پر ڈال کر
ملک کی سیاسیات کو درہم برہم کر دینے، حکومت کے کارکنوں کے
سامنے مختلف قسم کے روڑے پیدا کرنے، حکومت کے طے شدہ
منصوبوں میں طرح طرح سے رکاوٹیں پیدا کرنے، مختلف الخیال
مختلف العقائد اور مختلف المذاہب لوگوں کو ایک دوسرے سے
بھڑانے اور ان کے اندر نفاق اور ایک دوسرے کے خلاف
بغض و عداوت کی آگ کو تیز کرنے، فوج میں انتشار پھیلانے
اور اس کے بڑے بڑے افسروں میں اختلافات پیدا کر کے
ان کی آپس کی دشمنی کے باعث کسی اہم فوجی محاذ یا فوجی منصوبے
کو ناکام بنانے کے قسم کی وارداتیں تو ہمارے سامنے ہی ہو رہی
ہیں۔ اور بیشتر انہی لوگوں کے ذریعے ہو رہی ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان
کہلواتے ہیں۔ اب ہم ذرا قرآن میں سے ان کی چند مثالیں اختصار
کے ساتھ پیش کریں گے۔

ہجرت سے چوتھے برس یہود بنو نضیر مدینہ منورہ سے
نکالے گئے چنانچہ وہ ہر قوم میں بکھرے اور منتشر ہو۔ مخلطاً نہ

اور بنی قریظہ کو جو مدینہ کے پاس تھے۔ جمع کر کے مسلمانوں پر چڑھائی
پہ اُبھارا۔ شوال ۵ھ میں بارہ ہزار آدمی جس میں دس ہزار
فوج کفار کی تھی مدینہ منورہ پر چڑھائی کرنے کو روانہ ہوئے مسلمانوں
کے پاس فوج کم تھی۔ صرف تین ہزار مسلمان تھے۔ لہذا رسولؐ نے
اپنے دفاع کے لئے خندق کھودنے کا حکم دیا۔ کفار کی فوجیں خندق
کے قریب آگئیں اور دور دور سے تیروں کی جنگ بھی شروع ہو گئی
اور اس طرح متواتر ایک مہینہ تک مسلمان محاصرہ میں رہے اُس
وقت منافقین نے مسلمانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالنے اور
ان کی جمعیت کو توڑنے کے لئے غلط افواہیں پھیلانی شروع کردیں
چونکہ جاڑے کا موسم تھا اور اناج کی بھی تنگی تھی۔ لہذا منافقین
مسلمانوں سے کہتے پھرتے تھے۔ کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے
تمہیں یہ کہہ کر دھوکا دے رکھا ہے کہ میرا دین مشرق سے مغرب
تک پھیلیگا اور قیصر و کسریٰ کی حکومتیں مسلمانوں کے ہاتھ آ دیں گی
حالانکہ یہاں حالت یہ ہے کہ ایک مہینے سے دشمنوں کے نرغے
میں گھرے ہوئے ہیں۔ حاجتِ ضرورت تک کو تو باہر نکل نہیں سکتے
اور دنیا پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ مگر خدا کی قدرت
ایک رات اللہ تعالیٰ نے تند ہوا بھیجی جس سے کافروں کی ہانڈیاں
اُلٹ گئیں خیمے گر گئے اور گھوڑے چھوٹ گئے تمام لشکر میں بھگدڑ
مچ گئی اور کفار محاصرہ چھوڑ کر گھروں کی طرف بھاگ گئے۔ تب

اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیتیں نازل فرمائیں۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوا اذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَآءَتْکُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْ
سَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَکَانَ اللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا ۝ اِذْ جَآءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ
مِنْکُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ
وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ
وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا ۝ وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ
الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ
اِلَّا غُرُوْرًا ۝ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ یٰاَهْلَ یَثْرِبَ
لَا مُقَامَ لَکُمْ فَارْجِعُوْا وَیَسْتَاْذِنُ فَرِیْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِیَّ
یَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِیَ بِعَوْرَةٍ اِنْ یُّرِیْدُوْنَ
اِلَّا فِرَارًا ۝ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَیْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ
سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا یَسِیْرًا ۝
وَلَقَدْ کَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا یُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ
وَکَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ۝ (ر ۲/۱۸ الاحزاب ع ۳۳)

ترجمہ:- اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو
جب تم پر بہت سے لشکر چڑھ آئے پھر ہم نے ان پر ایک آندھی بھیجی اور ایسی فوج بھیجی —
جو تم کو دکھائی نہ دیتی تھی اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھتے
تھے۔ یاد کرو وہ وقت جب وہ لوگ تم پر آ چڑھے تھے اوپر کی طرف

سے بھی اور نیچے کی طرف سے بھی اور جب آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں
اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح
کے گمان کر رہے تھے۔ اس موقع پر مسلمانوں کا امتحان کیا گیا اور وہ
سخت زلزلے میں ڈالے گئے۔ اور جب منافقین اور وہ لوگ جن کے
دلوں میں مرض تھا۔ یوں کہہ رہے تھے کہ ہم سے تو اللہ نے اور اس کے
رسول نے محض دھوکہ ہی کا وعدہ کر رکھا ہے اور جب ان میں سے
ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب کے لوگو! ٹھہرنے کا موقع نہیں،
لوٹ چلو! اور ایک فریق ان میں سے نبی سے اجازت مانگتا تھا
اور کہتا تھا۔ کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں۔ حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں
تھے۔ یہ محض بھاگنا ہی چاہتے ہیں۔ اور اگر مدینہ میں اس کے اطراف سے
ان پر کوئی لشکر گھس آتا پھر ان سے فساد کے لئے کہا جاتا تو یہ اس بات
کو فوراً منظور کر لیتے اور ان گھروں میں بہت ہی کم ٹھہرتے۔ حالانکہ
یہی لوگ پہلے خدا سے عہد کر چکے تھے کہ پیٹھ نہ پھیریں گے اور اللہ سے
جو عہد کیا جاتا ہے اس کی بازپرس ہوتی ہے۔

یہاں ثابت ہوا کہ وہ ایسے لوگ تھے جو خدا کے لئے جہاد کرنے
اور پیٹھ نہ پھیرنے کا عہد بھی کر چکے تھے۔ مگر ان کی طبیعت فساد پر اتنی
مائل تھی کہ اگر ان کو موقع ملتا اور دشمن ان کو فساد کی رغبت پر آمادہ کرتے
تو وہ فساد کی خاطر گھروں کو بھی چھوڑ دیتے۔ لہذا ایسے منافقین کے متعلق
قرآن کا حکم یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آیا جائے۔

ان کی ایک ایک بات اور ایک ایک عمل کی سخت نگرانی رکھی جائے اور ان کے خلاف باقاعدہ آئینی جہاد لڑا جائے۔
رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس بارے میں سخت تاکید کی گئی ہے ارشاد ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ۝ اے نبیؐ ان کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چار تلواروں کے ساتھ بھیجے گئے ہیں۔ ایک مشرکوں کے لئے وہ اس آیت میں مذکور ہے "فاقتلوا المشرکین" دوسری کفار اہل کتاب کے لئے وہ اس آیت میں مذکور ہے "قاتلوا الذین ..... اوتوا الکتٰب" اور تیسری کفار اور منافقوں کے لئے ہے اور وہ اس آیت میں مذکور ہے۔ "جاھد الکفار والمنافقین" اور چوتھی باغیوں کے لئے ہے جو اس آیت میں مذکور ہے "فقاتلوا التی تبغی" الایۃ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب منافق اظہار نفاق کریں (یعنی ان پر یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ اسلامی مملکت کے غدار ہیں اور تخریبی کاروائیوں اور نفاق پھیلانے کی خاطر غیر ممالک سے ساز باز رکھتے ہیں) تو ان کے ساتھ تلوار سے جہاد کیا جائے اسی کو ابن جریرؒ نے اختیار

گیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ منافقین پر بڑے سخت تھے۔ چنانچہ جب وہ منصب خلافت پر فائز ہوئے تو منافقین عرب کے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی اور جب اُن کے عہد خلافت میں منافقوں کا کوئی لیس نہ چل سکا تو وہ اکثر عجم کی طرف فرار ہو گئے۔ اور وہاں جا کر اپنی سازشوں کو خفیہ طور پر چلاتے رہے۔ لیکن فاروقی عہد خلافت کے ختم ہوتے ہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اُس پیشنگوئی کے مطابق، کہ میرے بعد فتنوں کا دروازہ اسلام کی طرف کھل جائے گا، منافقین عرب و عجم نے بیک وقت تمام اسلامی ممالک میں فتور پھیلانے شروع کر دیئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ سوئم کو شہید کر دیا گیا۔ پھر ایک طرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرات طلحہؓ و زبیرؓ اور بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے درمیان جنگ کرا دی گئی اور دوسری طرف حضرت علی علیہ السلام اور امیر معاویہ کے درمیان جنگ صفین کا میدان گرم کرایا گیا اور عین نازک وقت پر حضرت علی علیہ السلام سے علیحدگی اختیار کر کے بعض تو امیر معاویہؓ سے جا ملے اور بعضوں نے خوارج کا نام اختیار کر کے علیحدہ گروہ بنا لیا۔ اور اس طرح ۳۶ھ سے لیکر ۱۲۶ھ تک مسلمانوں میں وہ ہنگامے کرائی گئیں اور وہ کشت و خون کرایا گیا جس کی مثال تاریخ اسلام میں ملنی محال ہے۔

۳۶ھ میں جنگ جمل کرانے کے بعد اور مسلمانوں میں باہمی فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا کر منافقین کا ایک گروہ حسکہ بن عتاب کی قیادت میں خراسان کی طرف فرار ہوا۔ چونکہ خراسان، سیستان اور بلوچستان کے سادہ لوح مسلمانوں کو اسلام کی خاطر عربوں سے بڑی انس اور محبت تھی۔ لہذا انہوں نے حسکہ کی بڑی خاطر تواضع کی۔ حسکہ نے بھی موقع سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اعلان کر دیا۔ کہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے سیستان کا حاکم مقرر ہوا ہوں۔ لہذا وہ بلا تامل سیستان، خراسان اور مکران کا حاکم بن گیا۔ حتیٰ کہ ۳۹ھ میں پھر حضرت علی علیہ السلام کو حسکہ کی سرکوبی کے لیے چار ہزار فوج بھیجنی پڑی۔ ۳۹ھ تا بابت ۵۳ھ بصرہ سے خراسان تک زیاد کی حکومت تھی۔ جو پہلے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طرفدار تھا۔ بعد میں باغی ہو گیا۔ اسی طرح ۵۴ھ سے ۶۴ھ تک عبیداللہ ابن زیاد بصرہ کا حاکم رہا۔ جو ۶۰ھ کے اواخر میں یزید کے حکم سے کوفہ کا حاکم مقرر ہوا جس نے کربلا کا قیامت خیز میدان گرم کر کے جگر گوشۂ رسول ﷺ کو شہید کر دیا۔ عبیداللہ ابن زیاد نے کوفہ جانے سے پیشتر اپنے بھائی مسلم ابن زیاد کو سیستان اور خراسان کا حاکم مقرر کر دیا تھا چنانچہ اس نے ۶۱ھ میں سرحدی علاقوں کے لوگوں سے ملکر آزاد رہنے کا اعلان کر دیا اور اس بہانے سے کہ جب تک اسلامی ممالک آپس میں متفق نہیں ہوتے ہم

آزاد بن گیا خود مختار حکمران بن گیا۔ اور اپنی من مانی کرتا رہا۔

۶۵ھ تا ۸۶ھ عبد الملک ابن مروان شام سے خراسان تک حکمران رہا۔ کہا جاتا ہے کہ مروان وہ شخص تھا جس کے باعث حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ بعد میں یہ یزید کے خاص حاکموں میں سے ہو گیا۔ مگر اس نے خود یزید کے بیٹوں سے بھی غداری کی۔ اور پھر یزید کی موت کے بعد خود تخت کا مالک بن گیا۔ اور اس طرح بادشاہی کو اپنے خاندان کی میراث بنا گیا۔

۷۵ھ سے لیکر ۹۳ھ تک حجاج ابن یوسف ایران و خراسان کا حاکم رہا گو اس کی گورنری میں فتوحات زیادہ ہوئیں۔ لیکن حجاج ابن یوسف بذات خود وہ شخص تھا جس نے عبد الملک کے حکم سے مکہ معظمہ پر حملہ کیا تھا۔ مکے کے شہر کو آگ لگا دی تھی۔ اور مکہ معظمہ پر اتنا بارود برسایا کہ اس کی دیواریں سیاہ ہو گئیں۔

غرضیکہ یہ ہے کہ اس انقلابی اور آزاد کشی دور میں منافقین اسلام نے مسلمانوں کے خون سے خوب ہاتھ رنگ لئے انہوں نے اپنے آپ کو علما اور پیشوایان دین کے رنگ میں بھی پیش کیا انہوں نے دینی کتب اور احادیث میں بھی زہر ملایا اور امام مالکؒ امام اعظمؒ۔ امام یوسفؒ۔ امام محمدؒ امام احمد حنبلؒ اور آئمہ اثنا عشرہ سے وہ وہ اقوال و افعال منسوب کئے جن سے ان حضرات کے فرشتے بھی بے خبر تھے اور اس طرح مسلم معاشرے کو ٹکڑے ٹکڑے

کر کے نہ صرف ایک دوسرے سے علیحدہ ہی کر دیا بلکہ انہیں ایک دوسرے کے خلاف اس قدر بھڑکایا کہ وہ ایک مدت تک باقاعدہ طور پر ایک دوسرے کے خلاف لڑتے رہے اور ان کے دلوں میں بغض و عداوت کی وہ آگ بھڑکا دی کہ آج تک وہ ایک دوسرے کے خلاف اپنی اپنی سٹیجوں سے زہر افشانی فرمانے سے باز نہیں آتے ۔

بعینہ یہی نقشہ آج مسلمانوں میں قومی، صوبائی اور لسانی تعصبات کی شکل میں بنتا جا رہا ہے ۔ نہیں بلکہ مذہبی اور سیاسی اکھاڑہ بندی بھی اسی منافقت ہی کا نتیجہ ہے ۔ آج بھی دشمنوں کے ایجنٹ ہمارے ملک میں نفاق پھیلانے میں کوئی کمی نہیں کرتے

آخر یہ نسلی، لسانی، صوبائی اور مذہبی جھگڑوں کو پھیلانے والے کون ہیں ؟ یہ قومی اور مذہبی عصبیت کو ابھارنے والے کون ہیں ؟ کیا ان لوگوں میں دشمنوں کے ایجنٹ نہیں ؟ کیا یہ تخریبی کارروائی کرنے والے اور لوگوں میں حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے والوں میں دشمنوں کے تنخواہ خور اور نظر منافق ایجنٹ موجود نہیں ہیں ؟ اگر ہماری پولیس بھی دشمنوں کے ایجنٹوں سے خالی نہیں تو کیا ہماری فوج، ہماری تجارتی منڈیاں ہمارے کارخانے، اور خود ہماری اسمبلیاں اور ہماری سیاسی و مذہبی جماعتیں دشمنوں کے ایجنٹوں سے بھرپور نہ ہوں گی ؟ کیا

ہماری کسی جماعت بلکہ خود حکومت کے پاس اس کا کوئی صحیح حل ہے؟ کیا اس کے لیئے کوئی عملی اقدام کیا گیا ہے؟ کیا کسی جماعت یا خود حکومت کے پاس آئندہ کے لیئے اس منافقت کو ختم کرنے کے لیئے کوئی پروگرام ہے؟

اطاعت امیر کا فقدان: اس حقیقت سے انکار نہیں کہ آجکل جنگوں کی جیت اور ہار کا دارومدار جدید اسلحہ پر ہے۔ لیکن ماہرین جنگ کا یہ بھی متفقہ اور متحدہ فیصلہ ہے، کہ فتح و نصرت کا اصلی دارومدار فوجوں کے استقلال اور اپنے سپہ سالار کی بلاچون وچرا اطاعت پر ہے۔

قرون اول کے مسلمانوں کی فتح و ظفر کا راز بھی "بلا چون و چرا اطاعت امیر" میں ہی مضمر تھا۔ قرآن نے جو تعلیم دی تھی اس کا مقصد ہی یہی تھا۔ کہ ہر مسلمان اپنا مال اور اپنی جان خدا کی امانت سمجھتے ہوئے خدا کی راہ میں یعنی خدا اور رسول کی زبان بردار یعنی اپنے امیر کے حکم کی موجب قربان کردیں وہ لوگ خود غرضی اور نفس پرستی کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دیتے تھے اُن کے "قلوب میں بال بچوں اور مال و زر کی محبت کے بجائے خدا اور اس کے رسول کی محبت تھی۔

یہی وجہ تھی کہ میدان بدر میں ۳۱۳ نہتے مسلمانوں نے ہزار ہا طاقتور کے معرکہ میں اپنا دیا اور اپنی ہتھیلیوں پر رکھکر نیرہ

سامان جنگ سے لیس سپاہیوں کا مقابلہ کیا اور فتح پائی۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب طارقؒ نے اندلس کے کنارے اپنی کشتیوں کو جلا کر مجاہدین اسلام کو لکھو کھا ہسپانوی سپاہیوں کے مقابلے میں جنگ کرنے کا حکم دیا۔ تو مسلمان سپاہیوں نے اطاعت امیر کا پاس رکھتے ہوئے سر دھڑ کی بازی لگا دی جس کے نتیجے میں قدرت نے انہیں نہ صرف عارضی فتح ہی دی بلکہ ایک عظیم مملکت کی بادشاہت بھی عطا فرمائی۔

در اصل اسلام میں جس طرح اللہ کی اطاعت کے لئے رسول کی اطاعت لازمی ہے۔ بلکہ رسولؐ کی اطاعت ہی در اصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ (جس نے رسول کی اطاعت کی تحقیق اس نے اللہ کی ہی اطاعت کر لی) اسی طرح رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ جس نے امام کی اطاعت کی تحقیق اس نے میری اطاعت کی۔ پوری حدیث شریف ملاحظہ ہو۔ عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من اطاعنی فقد اطاع اللّٰہ ومن اطاع الامام فقد اطاعنی ومن عصانی فقد عصی اللّٰہ ومن عصی الامام فقد عصانی (بخاری کتاب الاحکام) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے امام کی اطاعت کی اس

میری اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی
کی اور جس نے امام کی نافرمانی کی اُس نے میری نافرمانی کی۔ یعنی جس طرح
اللہ کی اطاعت کے لیئے رسولؐ کی اطاعت لازم ہے اسی طرح رسولؐ کی
اطاعت کے لیئے امام کی اطاعت لازم ہے۔ اگر کوئی شخص اولی الامر کی
اطاعت کے بغیر یہ سمجھ بیٹھے کہ اُس نے اللہ یا اُس کے رسول کی اطاعت
کی ہے یا اُس نے اللہ تعالےٰ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کا حق ادا کر دیا ہے
وہ صریح غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ کیونکہ اللہ، رسولؐ اور اولو الامر کی اطاعت
ایک دوسرے کے لیئے لازم و ملزوم ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی
دوسرے سے علیحدہ کرنے سے تینوں کے تینوں ٹوٹ جاتے ہیں۔ بلکہ اسلامی نظام
کی پوری زنجیر ٹوٹ کر فرقہ بندی اور گروہ بندی کی ہمہ گیر [illegible] ہو جاتی ہے۔ دورِ اول
میں آج تک جتنے اختلافات رونما ہوئے ہیں اور یہ جتنے فرقے، مذاہب
اور علیحدہ علیحدہ جماعتیں آج نظر آ رہی ہیں یہ سب کے سب اولی الامر
کی اطاعت میں اختلافات کے باعث وجود میں آئی ہیں۔ ورنہ خدا اور
رسول کی اطاعت سے تو بظاہر کوئی مسلمان انکار نہیں کرتا۔ مگر جب
وہ امیر کی اطاعت سے منحرف ہو جاتے ہیں تو قدرتی طور پر اُس سے ایسے کام
سرزد ہوتے ہیں جو اسے خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کی طرف لے جاتے ہیں
اسی حقیقت کے پیش نظر قرآن نے فرمایا: وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا
تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ
مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ○ (پ ۱۰ الانفال ع ۷) اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی

اطاعت کرو اور (اطاعت میں) نزاع مت پیدا کرو ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جاوے گی اور صبر کرو بیشک اللہ تعالےٰ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہیں اور قرآن نے مسلمانوں کو اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ ساتھ امیر کی اطاعت کی بھی تاکید فرمائی ہے۔ ارشاد ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (النساء ۵۹) اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اطاعت کرو اور تم میں سے جو اولوالامر ہیں ان کی اطاعت کرو۔ اگر ہم اسلام کی تاریخ پر غور کریں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائیگی کہ مسلمانوں میں جتنے فتنے اور فسادات رونما ہوئے ہیں اُن میں سے اکثر اطاعت امیر سے منہ موڑنے کے باعث رونما ہوئے ہیں

خود عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں جب کبھی مسلمانوں نے اطاعت امیر سے منہ موڑا ہے تو اسی وقت اُن کی فتح شکست میں تبدیل ہو گئی تھی اور وہ طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے تھے جنگ اُحد کا واقعہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے عبداللہ بن جبیرؓ کی سرداری میں پچاس تیراندازوں کا دستہ جبل اُحد کے درے پر بٹھا دیا تاکہ مشرکین پشت پر سے حملہ نہ کر سکیں یہ جنگ بہت سخت تھی۔ مگر پھر بھی مشرکین کے پاؤں میدان جنگ سے اکھڑ گئے اور وہ مسلمانوں کے حملہ سے منہ چھپا کر بھاگنے لگے جب جبل اُحد کے تیراندازوں نے یہ دیکھا کہ مشرکین کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگنے لگے ہیں۔ تو انہوں نے فتح کی خوشی میں یا بروایت دیگر مالِ غنیمت کے حصول کیلئے اطراف میں منتشر ہو گیا

چھوڑا اور کفار کی تاک میں آگے بڑھے۔ حالانکہ انہیں یہ تاکید کی گئی تھی کہ اس
مرکز کو ہرگز نہ چھوڑنا ہوگا یا یہ کہ اُن کو ان کے سالار نے منع کیا کہ تم مرکز
نہ چھوڑنا۔ مگر انہوں نے فتح کی خوشی میں اطاعتِ امیر کا کوئی خاص
خیال نہ رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے مرکز کو چھوڑنا تھا کہ مشرکین کے ایک
دستے نے "جو اس تاک میں بیٹھا تھا کہ ان کی پشت پر سے حملہ کریں" انہیں پیچھے
سے مارنا شروع کر دیا۔ اُن کے اس حملے سے مسلمانوں کی صفوف درہم برہم
ہوگئیں۔

گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خاص نظرِ رحمت کے باعث خدا نے
اس جنگ میں بھی فتح تو ہوئی لیکن مسلمانوں کو اطاعتِ امیر سے غفلت کے
باعث اس جنگ میں بہت زیادہ نقصان اُٹھانا پڑا۔

مگر افسوس! کہ ان حقائق کے باوجود آج کا مسلمان ابھی تک
اطاعتِ امیر کی اہمیت کو نہ سمجھ سکا یہی وجہ ہے۔ کہ آج تک مسلمانوں
کی عظیم سلطنتیں تباہ ہوئیں وہ خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں تباہ ہوئی
ہیں۔ دنیا میں شاذ و نادر ہی کوئی قوم ایسی ہوگی جو اپنی حکومت کو غیر
اقوام کے ہاتھوں چند ذاتی اغراض کی بنا پر یا چند ٹکوں کی خاطر
فروخت کر دیتی ہے۔ مسلمانوں کی درخشاں تاریخ میں اگر کوئی بدنما دھبہ
ہے تو یہی ہے کہ ان کو اپنوں ہی نے شکست دی ہے ورنہ شاید ہی کوئی ایسا موقعہ
ہو جس میں مسلمانوں نے من حیث القوم شکست کھائی ہو۔ آج اگر مسلمانوں
میں اتفاق و اتحاد کی بو باقی نہیں رہی تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ

مسلمانوں میں اطاعت امیر کا مادہ مفقود ہو چکا ہے۔ آج کوئی قاضی، کوئی مفتی
کوئی عالم، کوئی خلیفہ، کوئی صدر، کوئی امیر ایسا نہیں جس پر تمام مسلمان
متفق و متحد ہو کر "واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا"
کا عملی نمونہ پیش کر سکیں۔ کوئی جماعت، کوئی فرقہ، کوئی گروہ ایسا نہیں جس پر
مسلمان "امنا وصدقنا" کہہ کر کامل اعتماد کر سکیں۔ کوئی پیر، کوئی ولی
اور کوئی امام ایسا نہیں جس پر تمام مسلمانوں کا بالاتفاق اعتماد حاصل ہو۔ اور
پھر طرہ یہ کہ ان کوتاہیوں کو رفع کرنے کے لئے آج کل کسی جماعت یا ملت
نے پوری گرمجوشی سے کام نہیں کیا۔

اس بارے میں یہ بات بتانا بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں میں جذبۂ اطاعت مفقود
ہے جس کے باعث ان کو کوئی امیر نصیب نہیں ہوا۔ اور ہمارا سب امیر
اس لئے نصیب نہیں ہوا کہ ان میں اطاعت امیر الامراء یعنی رسول خدا
کا جذبہ موجود نہیں۔ چونکہ اطاعت رسول اس لئے نہیں کہ اطاعت خداوندی
کا جذبہ بھی مدت سے کمزور ہو چکا ہے۔ در حقیقت یہ کڑیاں ایسی ہیں
کہ دائیں یا بائیں کسی طرف سے بھی ملائی جا سکتی ہیں۔ اطاعت خداوندی
سے اطاعت رسول (خدا) اطاعت رسول سے اطاعت امیر پیدا
ہوتی ہے۔ اور اسی طرح اس کا عکس بھی درست ہے۔

اس بحث سے صاف ظاہر ہے کہ جب تک "جذبہ اطاعت
امیر" موجود نہ ہو۔ کوئی جماعت نہ بن سکتی ہے اور نہ کامیاب ہو سکتی ہے
کیونکہ یہی جذبہ کسی چھوٹی یا بڑی تنظیم کی اصل قوت محرکہ ہے جس کا آج مسلمانوں میں فقدان ہے

۱۸- مغربی جمہوریت اور اسکے برے نتائج

موجودہ زمانہ کی "مغربی جمہوریت" بھی جس کو ہمارے بیشتر مسلمان اسلام کا لبادہ پہناتے ہیں۔ میری ذہنی پریشانیوں کا ایک اہم سبب ہے۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ قسم کی جمہوریت عوام الناس کی بناتی ہوئی حکومت کا دوسرا نام ہے۔ اس میں فرد کو آزادی رائے حاصل ہے۔ چاہے وہ تحریر و تقریر کے ذریعے ہو یا کسی اور ذریعے سے ہر شخص اپنے خیالات کا اظہار ضرور کر سکتا ہے۔ ہر جماعت، فرقہ، یا گروہ کو اپنے اپنے عقیدے، خیال اور مذہب کے مطابق زندگی بسر کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ تنقید و تنقیص، بحث و تمحیص اور نداہی، یا جماعتی دعوت و تبلیغ پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔ اخبار، رسالے اور ہر قسم کی تحریر و تقریر کو پوری آزادی حاصل ہے۔ جلسے، جلوسوں پر کوئی گرفت نہیں۔ حزب مخالف حکومت وقت پر نہ صرف تنقید و تنقیص کھلے بندوں کر سکتی ہے۔ بلکہ بعض اختلافی مسائل میں حکومت کو چیلنج بھی کر سکتی ہے اور اگر وہ عوام کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو جائے تو حکومت کو بھی بدل سکتی ہے۔

غرض یہ کہ موجودہ جمہوریت کے سائے میں ہر مرد و زن، چھوٹا۔ بڑا مادر پدر آزاد ہے۔ جس کی جو مرضی ہو وہ کرے جیسی زندگی بسر کرنا چاہے کر سکتا ہے کوئی اسے اپنے خیال سے باز نہیں رکھ سکتا۔ ہر کسی کو مذہبی آزادی حاصل ہے اور لطف یہ ہے کہ کوئی کسی کو مذہبی پابندیوں کے لئے مجبور بھی نہیں کر سکتا۔ گو یہ بہت بڑی آزادی ہے۔ کسی مذہب یا حکومت میں اس سے بڑھ کر آزادی ممکن نہیں۔ مگر چونکہ ان جمہوریتوں کی ابتداء فرانس، امریکہ، اور روس سے ہوئی ہے۔ ان ہرسہ ممالک میں عوام نے امراء و رؤسا کی حق تلفیوں، مذہبی پیشواؤں کی بے حد پابندیوں، اور زار شاہی جیسی حکومتوں کے مظالم سے تنگ آکر بغاوت کی صورت میں ایسی خود ساختہ حکومتیں بنائیں جن کو عوام کی حکومت یا جمہوریت کا نام دیا گیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ان بغاوتوں کو وقتی تقاضوں کی بناء پر برپا کرنے کے لئے انقلابی لحاظ سے قابل ترین لیڈر مہیا ہوئے تھے۔ مگر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی پیغمبر نہ تھا۔ کہ وہ عوام کے جوش و جذبہ کے غضبناک سمندر کی پر شور لہروں پر قابو پا سکتا۔ اور نہ ہی ان حضرات نے منہاج النبوۃ کے مطابق ابتداء ہی سے عوام الناس کو اخلاقی معیار پر تیار کرنے کی سعی کی تاکہ

وہ دہشت و درندگی کے بغیر اس قافلے کو منزل مقصود تک پہنچا سکتے۔

اگر انقلاب فرانس، یا انقلاب روس کے سالارانِ قافلہ میں کوئی ایک ہستی بھی "پیغمبرانہ" دل و دماغ کی مالک ہوتی تو بلاشبہ "انقلاب اسلام" کی طرح اس کی تاریخ بھی دہشت انگیزی، انتقام پروری۔ نفس پرستی، خود غرضی، شہوت رانی اور غنڈہ گردی کے ہر داغ سے سراسر مبرا ہوتی۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ حضرات اس نعمت عظمیٰ سے محروم تھے۔

یہی وجہ ہے۔ کہ ان انقلابات نے زار شاہی ظلم و استبداد کی آہنی زنجیروں سے ستم رسیدہ انسانیت کو نجات تو دلائی مگر اسے مذہبی بندھنوں سے آزادی دلاکر اخلاقی معیار سے اس قدر گرا دیا کہ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی ہزاروں سال کی جان کاہ محنتوں پر پانی پھر گیا۔ اور اس کا نتیجہ یہی ہوتا تھا۔ کہ انسان کے اندر وہ سفاکی اور فسادی مادہ جو اس کے خمیر میں ابتدائے آفرینش سے موجود تھا، وحشت و درندگی کی صورت میں ابھر آتا۔ اور کبھی انتقام کے جذبے میں دہشت انگیزی، قتل و غارتگری، شہوت رانی اور غنڈہ گردی کا وہ مظاہرہ کیا جاتا۔ جس کی مثال تاریخ میں ملنی محال ہے۔ آؤ ہم ذرا تاریخ کی روشنی میں اس کا کچھ جائزہ لیں۔

جمہوریت کی ابتداء

سعید بزمی اپنی تصنیف "تاریخ انقلاباتِ عالم" حصہ اول باب ۱۳ میں لکھتے ہیں:

۱۳۰۲ء میں یورپ کے سب سے مہذب و متمدن ملک فرانس میں ایک جمعیت طبقات ([illegible]) بنائی گئی تھی۔ جس میں انسانوں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا تھا (۱) امراء و رؤسا (۲) پادری (۳) عوام۔ مگر یہ تقسیم برائے نام تھی۔ ساری طاقت صرف امراء و رؤسا ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اگرچہ اس دربار میں عوام کے نمائندے ایک نہایت ناقص انتخاب کے ذریعے جمع کئے گئے تھے۔ مگر ان کی کوئی مؤثر آواز اس میں نہ تھی بلکہ ان کی حیثیت صرف تماشہ بینوں کی سی تھی۔ عوام اس کو غنیمت سمجھتے تھے کہ امراء و رؤساء کے ساتھ ایک جگہ بیٹھنے کا موقع انہیں عطا کر دیا گیا ہے۔ ۱۳۰۲ء کے بعد سے یہ جماعت متعدد بار طلب کی گئی۔ مگر ہمیشہ ایسے ہی مواقع پر جب روپیہ یا آدمیوں کی ضرورت بادشاہ کو ہوتی تھی۔ لیکن ۱۶۱۴ء کے بعد سے چونکہ اس قسم کی کوئی ضرورت پیش نہ آئی۔ لہٰذا پورے دو سو سال تک اس کا کوئی اجلاس طلب نہ کیا گیا۔

مگر جب اصلاحِ مذہب، احیائے علوم، پریس کی ایجاد اور قومیت کے جذبے نے عوام میں زبردست بیداری کی لہر

وہ پادری تو قدرتاً ان کا خیال اس جماعت کی طرف مبذول ہوا
اور انہوں نے کوشش کر کے پورے ۱۷۵ سال کے بعد
۵ مئی ۱۷۸۹ء کو ورسیلز میں اس کا اجلاس طلب کر لیا
اس اجلاس میں امراء و رؤسا کے ممبروں کی تعداد ۲۸۵
تھی، پادریوں کی ۳۰۸ اور عوام کی ۶۲۱۔ لیکن اگرچہ عوام
کے نمائندوں کی تعداد امراء اور پادریوں دونوں سے زیادہ تھی۔
مگر پھر بھی اس اسمبلی میں ان کی رائے کو فوقیت حاصل نہ تھی۔ اس
لئے کہ فیصلہ افراد کی کثرت پر نہیں بلکہ طبقات کی اکثریت پر
رکھا گیا تھا۔ یعنی جس فیصلے کو کوئی دو طبقے منظور کر لیں
وہی فیصلہ قابل قبول سمجھا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ
عوام اکثریت میں ہونے کے باوجود اقلیت میں آجاتے تھے، کیونکہ
پادری ہمیشہ امراء ہی کا ساتھ دیتے تھے۔ چنانچہ سب سے
پہلا جھگڑا اسی بات پر شروع ہوا۔ اور بالآخر عوام نے امراء
و رؤساء اور پادریوں کی ملی بھگت سے تنگ آکر (تنگ
آمد بجنگ آمد کے مصداق) اپنا فیصلہ جبر و طاقت سے منوا
لیا۔ اور یہیں سے انقلاب کا آغاز ہوا۔ عوام نے سٹیٹس جنرل
(جمعیت طبقات) کے بجائے "قومی اسمبلی" کے نام سے عوام
کے نمائندوں کا اجتماع طلب کیا۔ اور اس طرح ۱۴ جولائی ۱۷۸۹ء
کا آفتاب جب طلوع ہوا تو دنیا کی تاریخ کا رخ بالکل دوسری

طرف پھرا ہوا نظر آیا۔ اس قومی اسمبلی نے حکومت کا ایک نیا آئین مرتب کیا جس کی رو سے ۱۷۹۳ء میں شاہی کو ختم کر کے عوام کی حکومت یا جمہوریت قائم کی گئی۔" موصوف آگے لکھتا ہے کہ "اس میں شک نہیں کہ انقلاب اسلام کے بعد دنیا کی تاریخ میں یہ دوسرا انقلاب تھا جو انسانیت نے اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لئے پیدا کیا۔ لیکن اس انقلاب کی تیرہ بختی یہ تھی کہ اسے کوئی ایسا قائد و رہنما نہ مل سکا، جو غصے، نفرت اور انتقام کے تمام جذبات سے بلند ہو کر صرف انسانی فلاح و بہبود کے مقصد کو پیش نظر رکھتا۔ عوام میں جوش تھا۔ ان کے سامنے مقصد تھا، مقصد تک پہنچنے کی راہ بھی متعین ہو گئی تھی۔ مگر "پیغمبرانہ" کردار کا مالک ان میں کوئی نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منزل مقصود تک پہنچنے میں جو رکاوٹیں حائل تھیں۔ ان کو دور کرنے میں عوام کا جوش و جذبہ حدود سے متجاوز ہو گیا۔ لوئس شانزدہم شہنشاہ فرانس کو سزائے موت دی گئی، امیروں، رئیسوں اور پادریوں کے نہ صرف حقوق ہی منسوخ کر دئے گئے، بلکہ جبر و ظلم اور قتل و غارتگری کے ہتھیاروں کو بیدریغ ان پر استعمال کیا گیا۔ تمام غیر ممالک سے جو معاہدے شاہی حکومت نے کر رکھے تھے ان سب پر خط تنسیخ پھیر دیا گیا۔ انقلاب کی اندرونی مخالفت کو دبانے

کے لئے " تحفظ عامہ " کے نام سے ایک کمیٹی بنائی گئی - اس کمیٹی نے ملک میں دہشت و ہراس کا ایک سناٹا طاری کر دیا - ذرا ذرا سے شبہ پہ لوگ بلا تامل تہ تیغ کر دئے جاتے - ہر طرف غیظ وغضب اور نفرت و انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے شاہی خاندان کے افراد، رؤسا، و امرا اور ارباب کلیسا بلا امتیاز ان شعلوں کی لپیٹ میں آرہے تھے - پھر یہ شعلے اتنے بڑھے کہ خود انقلاب کے لیڈر بھی ان کی لپیٹ میں آنے لگے کل تک جو لیڈر تھا - آج اس پہ شبہ کیا گیا اور شبہ کے ساتھ ہی ان شعلوں نے لپک کر اس کا دامن پکڑ لیا - ڈین ٹن (Danton) اس انقلاب کا سب سے بڑا لیڈر تھا - ہر طرف سے ڈین ٹن زندہ باد کی صدائیں آرہی تھیں - مگر دفعتہً کیا دیکھتے ہیں کہ ایک دن اسی ڈین ٹن کو لوگ کشاں کشاں قتل گاہ کی طرف لے جا رہے ہیں - اور رابس پیر (Robespierre) کے حکم سے اسے " مفاد عامہ " کی خلاف ورزی کرنے پہ قتل کیا جا رہا ہے - لیکن اس واقعہ کو ابھی چند دن ہی گذرنے پائے تھے کہ شور اٹھا کہ رابس پیر بھی گردن زدنی ہے - ابھی ڈین ٹن کے خون سے زمین لالہ زار ہی تھی کہ رابس پیر کا خون بھی بہا دیا گیا -

غرض اس طرح سے سب سے مہذب اور متمدن ملک فرانس میں مغربی جمہوریت کی بنیاد دہشت انگیزی، انتقام

پروری، غنڈہ گردی اور قتل و غارتگری پر رکھی گئی۔ اور بقول شاعر ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

جس طرح فرانس نے جمہوریت کی اینٹ انتقام پروری غنڈہ گردی اور قتل و غارتگری پر رکھی اسی طرح امریکہ اور روس نے بھی جو جمہوریتیں بنائیں وہ قتل و غارتگری اور انتقام پروری کے جذبات سے خالی نہ رہ سکیں۔ روس میں سٹالن نے اپنے تمام مخالفین کو "جون پچ یگودا" (Genrich Yagoda) کے ہاتھوں نیست و نابود کرا دیا ۱۹۳۶ء تک یاگودا سٹالن کا دست راست تھا۔ لیکن وہ خود بھی اس خطرناک انجام سے بچ نہ سکا اس پر بھی بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ اور آخرکار اسے بھی موت کا مزہ چکھنا پڑا، اس کے جانشین "یے ژوئے" (Yezhov) کا بھی یہی حشر ہوا۔

روس کے اندر ہر وہ شخص جس کا سٹالن سے اختلاف ہو جاتا یا جو سٹالن کا منظور نظر نہ ہوتا رجعت پسند سمجھا جاتا تھا۔ ۶ دسمبر ۱۹۳۶ء میں سوویٹ کے نئے دستور پر ۲۰ روسی زعماء نے دستخط کئے، جن میں سٹالن، مولوٹوف، لٹوینو شامل تھے۔ ۱۹۳۹ء تک ان میں سے پندرہ کو ختم کر دیا گیا اور بیشتر

گولی کا نشانہ بنے۔ ظلم کا تختۂ مشق بننے والوں میں مارشل بلوہر (Mossral Blooher) بھی تھا جو فار ایسٹرن ریڈ آرمی کا کمانڈر ان چیف تھا۔ ان میں "راسٹے خیریازو (Rasty Khealyapou) یوکرین کی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ جی پی یو کا آفیسر اگلی اور یوکرین کا وزیر اگلی بھی ان مقتولین میں شامل تھا۔

۱۹۲۵ء میں جب اس امر کا احساس کیا گیا کہ بن کا زر دو کو ان کی خدمات کا معاوضہ جنس میں دیا جاتا ہے۔ ان کی ضروریات زندگی پوری نہیں ہوتی۔ تاہم فاریٹ (Mosco) نے روسی حکومت کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرائی چاہی لیکن اسے دار پر لٹکا دیا گیا۔ کیونکہ حکومت کے نزدیک انقلاب کے وقت کئے ہوئے عہد و پیمان کی یاد دہانی بدترین جرم تھا۔

یاد رہے کہ انقلاب روس کے وقت لینن نے عوام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ روس میں سکے کے استعمال کو ختم کیا جائے گا۔ اور اس عہد و پیمان کو قانونی شکل بھی دی گئی تھی۔

"بوچرین" (Bucharin) نے نئی زر کے استعمال کے خلاف آواز اٹھائی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ

جس سماج کا معبود زر ہو وہاں معاشی مساوات کا حصول ناممکنات میں سے ہے۔ کریسنتشی (Maesdanone) نے بھی یہی نعرہ بلند کیا اور اسے بھی آخرکار اس افسوسناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔

اور اس طرح سٹالن کے ہر مخالف پر تخریب وطن کا الزام لگایا جاتا تھا۔ اور نہایت ہی افسوسناک بات تو یہ ہے کہ وہ ہزاروں اشخاص جو دوسروں کی موت میں سٹالن کے ممد و معاون ثابت ہوتے تھے اور جنہوں نے سٹالن کے آہنی ہاتھ بن کر اس کے راستے سے مخالفت کے تمام کانٹوں کو صاف کر دیا تھا خود اپنی جانوں کو سٹالن کے خونی پنجوں سے نہ بچا سکے۔

موجودہ جمہوریت اور قانون

دراصل موجودہ جمہوریت کی طرح اس کا قانون بھی برسر اقتدار طبقے کا خود ساختہ ہے۔ کیونکہ خداوندی ضابطوں اور پیغمبرانہ اسوۂ حسنہ کا تو اس سے دور تک کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ لہٰذا جو پارٹی بھی برسراقتدار آجائے وہ اپنی مرضی کے مطابق قانون کی دفعات میں ردو بدل کر سکتی ہے۔ قانون میں نئی دفعات ملا سکتی ہے اور پرانی دفعات میں سے جس دفعہ کو چاہے ختم کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ سٹالن کی جنبش لب بلکہ تیوری روس کا قانون تھا۔ وہ جب چاہتا بغیر کسی مشاورت کے اس میں ردوبدل کر سکتا تھا۔ یا جو معانی اسکو پہنانا چاہتا پہنا سکتا تھا۔

عبدالحمید بی اے اپنے ایک مضمون میں جو "اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں" نامی کتاب میں چھپا تھا۔ لکھتے ہیں کہ "سنہ ۱۹۳۶ء کے دستور دفعہ نمبر ۱۲۱ کے مطابق سوویٹ یونین کے ہر شہری کو تعلیم حاصل کر لینے کا پورا پورا استحقاق تھا۔ اور ابتدائی لازمی تعلیم ہر شہری کو میسر تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے بیشمار وظائف دئے جاتے تھے تاکہ ہر خاص و عام زیور تعلیم سے آراستہ ہو سکے۔ لیکن ۱۲ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء کو ایک جنبش قلم نے سارا قانون بدل کر رکھ دیا۔ مفت ثانوی تعلیم ختم کر دی گئی۔ اب بغیر جنس کی ادائیگی کے کوئی شخص بھی ہائی سکولز، کالجوں، یونیورسٹیوں یا فنی اداروں میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتا تھا اس اقدام کے لئے دستور میں کسی تبدیلی کی ضرورت بھی پیش نہ آئی اور نہ ہی کسی شہری کو جرأت ہو سکی کہ وہ حکومت کے خلاف کوئی آواز اٹھا سکے یا کوئی لفظ کہہ سکے۔ اس قانون کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ غرباء کے بچوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کا حاصل کرنا خون جگر پینے کے مترادف ہوا، انہوں نے ہزاروں کی تعداد میں یونیورسٹیوں کو خیر باد کہنا شروع کیا۔ اور امراء کے بچوں کے لئے درس گاہ کھلا

کو خالی کر دیا۔ امراء کے یہی بچے بڑے ہو کر مفاد پرست طبقہ کے داعی بنے۔ رؤساء کے بچے بڑے ہو کر سائنس دان، انجینیرز، پروفیسرز اور مصنفین بنے، اور غربا کے لعل باوجود اعلیٰ ذہنی استعداد کے مالک ہونے کے غریب مزدور بن کر رہ گئے اس طبقہ کی اچھی خاصی تعداد تیار کر چکنے کے بعد اور اس کو زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی دے چکنے کے بعد پھر سٹالن کی محبت جوش میں آئی اور ۱۹۴۴ء میں دفعہ ۱۲۱ پر عمل درآمد ہونا شروع ہوا۔ غربا کو ساری مراعات پھر دے دی گئیں کیونکہ مفاد پرست طبقہ اور گروہ کو رہوار کی گرد کی طرح زندگی کے ہر میدان میں اب بہت پیچھے چھوڑ چکا تھا۔

یہی حالت فرانس اور امریکہ کے دستور کی ہے۔ جو پارٹی یا جو شخص برسراقتدار آتا ہے وہ اپنی مرضی کے مطابق قانون میں رد و بدل کر جاتا ہے، جسکی وجہ صرف یہی ہے کہ خدائی قانون یا ضابطۂ تو ان کے سامنے ہوتا نہیں جس میں رد و بدل کا امکان نہ ہو انکا قانون تو عوام کا خود ساختہ ہوتا ہے لہذا ان کی مرضی ہے جس طرف بھی اس کو موڑنا چاہیں یا جو نئی دفعہ بنانا چاہیں بنا سکتے ہیں۔

یا بہ معنی دیگر موجودہ جمہوریت کے اصول کے مطابق قانون سازی کا اختیار اکثریت کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔ یعنی گمنام لوگوں کی ایک کثیر تعداد مسند حکومت پہ بٹھا دی جاتی ہے

جن کے انتخاب میں کوئی علمی اور عقلی معیار سامنے نہیں رکھا جاتا۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ ایسے لوگ جو ووٹ خرید کر یعنی اخلاقی قانون کو توڑ کر اسمبلی تک پہنچے ہوں۔ اخلاقی لحاظ سے اس قابل نہیں کہ کوئی معیاری قانون بنا سکیں۔ شاعر مشرق نے کیا خوب فرمایا ہے کہ ؎

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

قانون بنانے والے لوگوں کے لئے ایک خاص معیار ہونا چاہیئے اور ان لوگوں کے لئے فقیہہ، قاضی، مفتی، وکیل بیرسٹر، جج، جسٹس یا قانون کا عالم ہونا لازمی ہے۔ انہیں چاہیئے کہ ایک طرف تو اسلامی قانون سے پوری طرح واقف ہوں۔ اور دوسری طرف اقوام عالم کی سیاسی، معاشرتی اور مذہبی تاریخ سے بھی پوری طرح آشنا ہوں۔ تاکہ قانون ساز اسمبلی میں پیش کردہ ہدایات پر صحیح رائے دے سکیں۔ لیکن یہاں معاملہ اسکے برعکس ہے۔ عام انتخابات کے بعد بالعموم ایسا ہوتا ہے کہ علمی، عقلی، اخلاقی اور قانونی لحاظ سے گونگوں، بہروں اور اندھوں کی ایک بہت بڑی تعداد اسمبلی میں پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ جو قانون کی الف ب تک سے واقف نہیں ہوتے۔

اور اس طرح نہ صرف قانون حفظ مراتب کی صریحاً خلاف ورزی

کی جاتی ہے، بلکہ اس میں امام، مجدد، نبی اور مرسلین کی شخصیتوں
کی بھی توہین ہوتی ہے۔ کیونکہ خدا نے ابتدائے آفرینش سے الٰہی قانون
کی تشریح کا اختیار صرف نبیوں اور ان کے متبعین ہی کو دیا ہے جو
فضیلت اور علم میں سربراہِ حکومت سے کم نہیں ہوتے اور جن
کے بنائے ہوئے قانون کا سربراہِ حکومت کو بھی احترام ہوتا ہے
بلکہ وہ بھی ان کے بنائے ہوئے کا تابع ہوتا ہے۔

پس ظاہر ہے کہ جس عدلیہ کے تحت حکمران کو اپنا نظام حکومت چلانا
ہوگا۔ اس عدلیہ کے بنانے والے بھی معمولی حیثیت کے لوگ نہیں ہونگے
وہ علمی لحاظ سے بہت اونچے ہونے چاہیں۔

مگر افسوس ہے! کہ موجودہ جمہوری نظام میں ہر لحاظ میں ہر
کس و ناکس جو چند ٹکوں سے غریبوں کا ووٹ خرید خرید کر اسمبلی
کا ممبر بن جاتا ہے۔ مذکورہ صدر فضیلت کا ٹھیکیدار اور مالک
بن جاتا ہے۔ بقول شاعر ملت :-

"چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"

موجودہ جمہوریت اور قومیت

انقلاب فرانس سے پہلے انسانوں کی تقسیم عموماً
شریف و کمین یا امیر و غریب کے دو حصوں میں تھی۔ یا پھر مذہبی
عقائد کے لحاظ سے کئی مذہبوں میں۔ نسل یا قوم کے اعتبار
سے جو انسانی تقسیمیں تھیں۔ ان کا تصور بہت دھندلا تھا۔ لیکن

انقلاب فرانس کے بعد قومی تقسیم کا تصور ابھرنا شروع ہوا۔ ہر وہ انسانی گروہ جو رنگ، نسل، زبان، تاریخ، جغرافیہ، عقائد، روایات اور تہذیب، معاشرت کے لحاظ سے یکساں تھا۔ اس نے خود کو ایک قوم یا نیشن کہنا شروع کیا۔ جس طرح مذاہب کے ماننے والے اپنے مذہب ہی کو حق سمجھ کر دوسرے تمام مذاہب پر اسے فوقیت دیتے ہیں اسی طرح قومیت یا نیشنل ازم کے جذبہ کے تحت ہر قوم اپنے آپ کو دنیا کی ساری اقوام پر فوقیت دیتی ہے۔ اور اپنی نسل زبان، تاریخ اور تہذیب و معاشرت کو ساری دنیا سے افضل و اعلیٰ سمجھتی ہے۔

قومیت کا یہ تصور دراصل انفرادی آزادی اور موجودہ جمہوریت کی براہ راست پیداوار ہے۔ انقلاب فرانس سے پہلے تک کی دنیا اس تصور سے قطعاً ناآشنا تھی۔ تاریخ اقوام عالم کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب فرانس سے قبل پورا یورپ ایک مرکزی کلیسا کے تحت تھا۔ یعنی آج کل کی اصطلاح میں دنیا بین الاقوامی اصول سیاست پر قائم تھی۔ یہی اصول کرۂ دنیا کے دوسرے علاقوں میں کارفرما تھا۔ لیکن جمہوریت نے چونکہ افراد کی آزادی پر زور دیا اور شاہی اختیارات ایک فرد سے لے کر عوام کو سونپنے

کا اصول طے کیا۔ اس لئے اس خیال سے کہ کہیں زیادہ آبادی والے ملک، کم آبادی والے ممالک پر ظلم نہ کرنے لگیں۔ قومی گروہ بندی کا تصور پیدا ہوا اور چونکہ جمہوری انقلاب کا گہوارہ یورپ ہی تھا۔ لہٰذا قوم پرستی کے جذبات بھی سب سے پہلے وہیں شدت کے ساتھ پیدا ہوئے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ جذبات اپنے پورے شباب پر پہنچ چکے تھے اور مقابلہ و مسابقت کی دوڑ دھوپ یورپی قوموں کے درمیان بڑی تیزی کے ساتھ شروع ہو گئی تھی۔ بعدازاں انہی اثرات کے تحت امریکہ اور روس میں قوم پرستی کے جذبات مدتوں تک کشت و خون کا بازار گرم ہونے کا باعث بنے رہے۔ امریکہ میں آج تک سفید فام امریکنوں اور سیاہ فام امریکنوں (حبشیوں) اور سرخ فام امریکنوں (ریڈ انڈین جو امریکہ کے اصل باشندے تھے) کے درمیان جنگیں اور تنازعے ہوتے رہے ہیں۔ کنیڈا میں بھی ریڈ انڈین اور یورپی نسل کے گروہوں کے درمیان جنگیں اور روس میں سرخ روسی اور سفید روس کی قومی مخالفتوں سے کون واقف نہیں ؟

دراصل قومی ہمدردی اور اشتراک عمل بجائے خود بری چیز نہیں۔ ہر قوم کو اپنی مشترک لسانی تہذیبی، جغرافیائی اور مذہبی اتحاد کی وجہ سے اپنی تنظیم آپ کرنے میں بہت آسانی ہوتی

ہے۔ اور اس لئے اپنے سیاسی، معیشی اور معاشرتی مسائل کو حل کرنے میں ہر قوم کو خود مختار ہونا چاہیے۔ جس طرح ہر گھر اپنے خانگی معاملات کو خود ہی بخوبی طے کر سکتا ہے۔ اور کسی غیر کو اس میں مداخلت کا حق نہیں ہے۔ اسی طرح دنیا کی وسیع تر ہیئت اجتماعیہ میں ہر قوم کی مثال ایک گھر کی سی ہے۔ اس لئے ہر قوم کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے۔ کہ وہ اپنے (خاندان اور قبیلوں) کے معاملات کو خود ہی طے کر لے اور کوئی دوسری قوم اس کے اندرونی مسائل میں دست اندازی نہ کرے۔ پھر جس طرح کسی قوم کی آزادی و خوشحالی کا دارومدار اس کے خوشحال و آزاد گھرانوں پر ہے۔ اسی طرح کل دنیائے انسانیت کی خوشی و آزادی کا انحصار مختلف قوموں کی شادمانی و حریت پر ہے۔

اور یہی وہ فطری جذبہ تھا جس کو لیکر تمام پیغمبر اپنی اپنی قوم کی فلاح و بہبود اور اصلاح کی خاطر بھیجے جاتے تھے۔ اور وہ یہی فطری حق اور قومی جذبہ تھا جس کی بناء پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے فرعون سے کہا:۔ فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ۵ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۵ (طٰہٰ ع ۲) ترجمہ:۔ (سو تم اس کے (فرعون کے) پاس جاؤ اور کہو، کہ ہم دونوں

تیرے رب کے فرستادے ہیں، سو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو اور ان کو تکلیف مت پہنچا) چونکہ اپنی مشترک لسانی، تہذیبی اور مذہبی آزادی ہر قوم کا فطری حق ہے۔ اور ہر قوم کو اپنی فلاح و بہبود اور اصلاح کرنے کا حق دینا چاہیئے۔ اس لئے قرآن نے بھی ہر قوم کے پاس انہی میں کے فرستادے بھیجے چنانچہ نوح علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ الخ (نوح ۱) ترجمہ:۔ "ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کے پاس بھیجا تھا۔ کہ تم اپنی قوم کو ڈراؤ، قبل اس کے کہ ان پر دردناک عذاب آوے۔ انہوں نے کہا اے میری قوم میں تمہارے لئے صاف صاف ڈرانے والا ہوں"

اور آگے خود نوح علیہ السلام تبلیغ و دعوت کے بعد اپنے رب سے یوں دعا کرتے ہیں:۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا " ترجمہ:۔ "اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کو رات اور دن (حق کی طرف) دعوت دی" —— اسی طرح ہود علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے:۔ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ الخ (ہود ۵)

ترجمہ:۔ "اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ انہوں نے فرمایا۔ اے میری قوم تم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں۔"

اور ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے:۔

وَإِبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ ۖ

(العنکبوت ع ۲) "اور ابراہیم نے) ابراہیم ؑ (کو اپنی قوم کی طرف بھیجا) جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا۔ کہ تم اللہ کی بندگی کرو، اور اس سے ڈرو۔"

اور اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے کہ ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم تم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں۔"

اور یہی شعیب علیہ السلام اپنی قوم سے آگے یوں فرماتے ہیں:

وَيَا قَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ ۚ وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِنْكُمْ بِبَعِيدٍ ○ (ہود ع ۸) ترجمہ:۔

"اور اے میری قوم میرے ساتھ ضد تمہارے لئے اس کا باعث نہ ہو جائے کہ تم پر بھی اسی طرح مصیبتیں آپڑیں جیسی قوم نوحؑ یا قوم ہودؑ یا قوم صالحؑ پر پڑیں تھیں۔ اور قوم لوط

تو تم سے دور نہیں۔"
بلکہ قرآن مجید نے تو صاف فرمایا ہے کہ :۔ "لِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ"
"ہر قوم کے لئے اپنا ایک مصلح ہوتا ہے"۔ یعنی اکثر علماء، مبلغین اور مصلحین تو ان اقوام کے اپنے ہی افراد میں سے ہوتے ہیں۔ نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ہر قوم کے لئے علیحدہ علیحدہ پیغمبر بھیجے جاتے تھے۔ تاکہ وہ اپنی قوم کے قومی احساسات و جذبات، تہذیب و کلچر، رسم و رواج اور نفسیات کا پوری طرح لحاظ رکھ کر اُن کو اُن کے مزاج کے مطابق حق کی طرف دعوت دے سکیں۔

غرض قوموں کی اصلاح کا تصور یقیناً انسانی فلاح کا موجب ہے۔ لیکن جب اس تصور میں فوقیت طلبی کا جذبہ بھی شامل ہو جاتا ہے اور ہر قوم خود کو ساری دنیا سے بہتر سمجھنے لگے۔ اور اس میں برہمن ازم یا نازی ازم جیسے جذبات پیدا ہو جائیں تو لامحالہ دوسری اقوام کو نیچ اور کمتر سمجھنے کا تصور بھی اس میں آجاتا ہے۔ تب یہ تصور قوموں کے باہمی تعلقات کو خراب کر کے دنیا کے امن کے لئے خطرہ بن جاتا ہے اور قومی ضِد اضدی میں تعصب کا یہ جذبہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ خدا، رسول ؐ اور دین سے بھی مقدم ہو جاتا ہے۔ اسی خطرہ کے پیش نظر قرآن مجید ہمیں یوں آگاہ کرتا ہے

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:۔

"قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۝ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ۝ (ھود ع ۸)

ترجمہ:۔ "شعیبؑ نے فرمایا، اے میری قوم کیا میرا خاندان تمہارے نزدیک اللہ سے بھی زیادہ با توقیر ہے، اور اس کو (اللہ تعالیٰ) تم نے پس پشت ڈال دیا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کو قومی تعصب کے خاطر ترک کر دیا ہے، یا قوم کی محبت تم پر اس قدر غالب ہوگئی ہے کہ تم نے قومی رسم و رواج کی خاطر اللہ تعالیٰ کے احکام کو ترک کر دیا) یقیناً میرا رب تمہارے سب اعمال کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور اے میری قوم تم اپنی جگہ عمل کرتے جاؤ اور میں اپنا عمل کرتا رہوں گا۔ بہت جلد تم کو معلوم ہو جائے کہ وہ کون

شخص ہے جس پر ایسا عذاب آیا چاہتا ہے۔ جو اس کو رسوا کر دے گا۔ اور کون شخص ہے جو جھوٹا تھا؟ اور تم بھی منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ اور (خدا فرماتا ہے) جب ہمارا حکم آ پہنچا، تو ہم نے شعیبؑ کو اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے اپنی (خاص) رحمت سے بچا لیا اور ان ظالموں کو ایک سخت آواز نے آ پکڑا۔ سو اپنے گھروں کے اندر اوندھے گرے رہ گئے۔ جیسے کبھی اُن گھروں میں بسے ہی نہ تھے۔ خوب سن لو! مدین کو رحمت سے دوری ہوئی جیسے ثمود رحمت سے دور ہوئے تھے۔"

پس ظاہر ہے کہ شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے دشمنی اس لئے اختیار کی تھی کہ وہ قومی تعصب میں دین کو چھوڑ گئے تھے۔ یا قومی رسم و رواج اور قومی تفاخر ان کو اتنا عزیز تھا۔ کہ خدا کے احکام کو قوم کی خاطر ترک کر گئے تھے۔ اور اسی لئے تباہ ہوئے کہ قوم پرستی میں وہ حد سے گذر گئے تھے۔

غرض اگر شخصی حکومتوں میں افراد کی ذاتی امنگیں اور حوصلے دنیا کے لئے خطرہ تھیں تو انقلاب فرانس اور انقلاب روس کی پیدا کردہ جمہوریت اور کمیونزم کی بدولت قوم پرستی کے وجود نے افراد کی امنگیں قوموں میں منتقل کر دی ہیں۔ اور اب افراد کی بجائے قومیں، دنیا کے امن کے لئے خطرہ بن گئی ہیں۔ کل تک

چنگیز خان و ہلاکو خان، تیمور و سکندر اور سیزر اپنی شان و شوکت بڑھانے اور دوستوں اور رفیقوں کو خوش کرنے کے لئے دنیا بھر کو قبضہ میں لانے کی کوشش کرتے تھے۔ اب چنگیز و ہلاکو۔ سیزر و سکندر نہیں رہے مگر ہر قوم بحیثیت مجموعی چنگیز و ہلاکو اور سیزر و سکندر بن گئی ہے۔ سابقہ عالمگیر جنگوں میں پورا جرمنی سکندر تھا۔ پورا انگلستان سیزر اور پورا روس چنگیز و ہلاکو، بالفاظ دیگر انفرادی شہنشاہیت ختم ہوئی۔ مگر اب اس کی جگہ قومی شہنشاہیت نے لے لی۔

چنانچہ انیسویں صدی کے آغاز سے یورپ کی تمام جنگیں اسی قومی شہنشاہیت کو منوانے کے لئے لڑی گئیں۔ اور قومی جمہوریت کے تصور میں جارحانہ اور حملہ آورانہ شان پیدا ہوگئی۔ بدقسمتی سے قومیت کا یہ جارحانہ تصور آج بھی دنیا میں ابتری پھیلا رہا ہے۔ اسی قومی ملوکیت پر تبصرہ کرتے ہوئے۔ اخبار "سٹیٹسمین" اپنے ایک افتتاحیہ میں لکھتا ہے:۔ "تاریخ و عمرانیات کے فاضل اہل اس پر متفق ہیں کہ انیسویں صدی میں سائنس نے جو شاندار کامیابی حاصل کی اس کا صحیح ثمرہ دنیا کو نہ مل سکا۔ اس لئے کہ نیشنل ازم (قومیت) کا جو تصور گذشتہ صدی میں پیدا ہوا۔ قوموں نے سائنس کے انکشافات سے بھائی بندوں کی طرح مل جل کر فائدہ نہیں اٹھایا، بلکہ ان

انکشافات کو قومی مسابقت و مقابلے کے لئے استعمال کیا۔ جس نے جنگ کو روز بروز یقینی اور تباہ کن بنا دیا۔ نیشنل ازم کا فلسفہ انسانی آزادی کو قائم رکھنے کے لئے وضع ہوا تھا۔ مگر جلد ہی یہ فلسفہ "قومی ملوکیت" میں تبدیل ہوگیا۔ اور اس طرح عوامی آزادی کے جس مقصد کو لے کر قومیت کی تحریک نے جنم لیا تھا "قومی ملوکیت" نے اس آزادی ہی کی نفی کرنی شروع کردی انسانی زندگی میں جو متناقص بالذات کیفیتیں پائی جاتی ہیں "قومی ملوکیت" اس کی ایک مثال ہے۔ انسان کی انفرادی آزادی کی خواہش کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ دنیا نے قوم کے نام سے گروہ بندی کرنا ضروری سمجھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ قومی گروہ بندیاں آپس میں ٹکرانے لگیں۔ اس طرح ہر قوم انسانی برادری کا ایک جارحانہ عنصر بن گئی۔ آخر کار نسل ونسب کی اس کھینچا تانی بندی کے نام پر جو "قومی ملوکیت" پیدا ہوئی۔ اس نے وہ تمام مطلق العنانی حاصل کرلی۔ جو کسی زمانے میں صرف بادشاہوں کے لئے مخصوص تھی۔ اصل یہ ہے کہ نوآبادیاں قائم کرنے کے غیر مساوی مواقع ہی گزشتہ ایک صدی میں دنیا کی بیسیوں جنگوں کا باعث ہوتی ہیں [۹]"

---

[۹] سٹیٹسمین ۱۲ دسمبر ۱۹۴۵ء (دہلی ڈاک ایڈیشن)
ماخوذ از تاریخ انقلاب عالم حصہ اول از بزمی

پس جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اگر انقلاب فرانس اور انقلاب روس کے سالارانِ قافلہ میں کوئی ایک بھی "پیغمبرانہ" دل و دماغ کی مالک ہوتی تو بلا شبہ انقلاب اسلام کی طرح اس کی تاریخ بھی دہشت انگیزی، قوم پرستی، انتقام پروری اور غنڈہ گردی کے ہر داغ سے سراسر مبرّا ہوتی۔

جہاں تک اسلامی شورائی نظام اور مغربی جمہوری نظام کی موافقت (جس کا اکثر دعویٰ کیا جاتا ہے) کا تعلق ہے اس کا صحیح اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس نے اسلام کے قرونِ اول کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا ہو۔ یا کم از کم خلافتِ راشدہ کی تاریخ سے بخوبی واقف ہو۔ وہی شخص سمجھ سکتا ہے کہ پیغمبرانہ جمہوریت اور خدام الناس کی خود ساختہ جمہوریت میں کیا فرق ہے، اور انسانوں کو انسانوں کا پرستار بنانے کی "فرعونی" رسم پر انقلاب اسلام نے کیسی کاری ضرب لگائی تھی۔ اگر داعی اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی ہدایات و "اسوۂ حسنہ" پر صحیح سپرٹ میں عمل کیا جاتا تو انفرادی یا قومی ملوکیت کا غیر انسانی رواج اپنی موت مر جاتا، اور عوام کو امراء و رؤسا کی زیادتیوں سے تنگ آ کر بہ جبر و طاقت خود ساختہ جمہوریت اور کمیونزم بنانے کی ضرورت نہ ہوتی۔

لیکن افسوس! کہ بعد کے مسلمانوں کے شہنشاہیت پسند رجحانات نے انہیں اس طرف متوجہ ہونے کی بہت کم فرصت دی

خلافت راشدہ کے آخری دور میں امیر معاویہؓ کا خلیفۂ چہارم (حضرت علیؓ) سے اختلاف اسلام کے اس اصول کی تکمیل کے راستے میں حائل ہو گیا تھا، کہ حکومت و فرمانروائی اللہ کے احکام کے مطابق عوام کے مفاد اور عوام ہی کی مرضی سے ہونی چاہیئے نہ کہ چند مخصوص افراد کے مفاد میں ان کی من مانی خواہشوں کے مطابق۔

امیر معاویہ کا اپنے بیٹے یزید کو خلافت کے لئے نامزد کرنا تاریخ اسلام میں شہنشاہیت کی بنیاد رکھنے کے مترادف تھا۔ اُن کے بعد اُن کے بیٹے یزید نے اس بنیاد کی تکمیل کر دی۔ اس دور میں اور اس کے بعد معاویہؓ کے خاندان کے خلاف بغاوتیں ہوئیں۔ وہ تباہ ہوا۔ اُس کی جگہ عباسی فرمانروا آئے۔ مصر میں فاطمی سلاطین نے بساطِ حکومت بچھائی۔ ایران میں مسلمان بادشاہتیں قائم ہوئیں۔ ہندوستان میں ترکوں، پٹھانوں، لودھیوں، اور مغلوں کا ڈنکا بجا۔ اسپین میں عربوں کے سطوت و جلال نے یورپ کی آنکھیں خیرہ کیں۔ غرض کیا کیا نہ ہوا۔ لیکن داعی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سیاست و فرمانروائی کا جو پودا لگایا تھا۔ اور خلفائے راشدین نے جس کی آبیاری کی تھی۔ وہ پودا برگ و بار نہ لا سکا۔ بعد کے مسلمان خلافت راشدہ کے طرز حکومت کو تاریخ کے اوراق میں پڑھتے

رہے مگر اُسے زیرِ عمل لانے کا تصور نہ کر سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام نے جس مساویانہ انسانی معاشرت کی داغ بیل ڈالی تھی اس کو بار آور کرنے کی سعادت دوسروں کے حصے میں آئی۔ مگر "پیغمبرانہ" کردار سے خالی ہونے کے باعث ناکمل ہی رہی۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ قسم کی اسمبلی یا پارلیمنٹ "جمہوریت" کا ایک نمونہ تو ہے، لیکن یہ اجتماعی مجلس جو دراصل یورپ کی پارلیمنٹ کا چربہ ہے۔ اسلامی شوریٰ ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس نے نہ صرف نیشنل ازم (قومیت) کے جذبات کو حد سے زیادہ ابھار کر دیا ہے۔ بلکہ حزبِ مخالف کا وجود بھی اسی کا ہی پیدا کردہ ہے جو مذہب اور حکومت ہر دو کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

موجودہ جمہوریت اور حزبِ مخالف

موجودہ جمہوری حکومتوں کا طریق کار یہ تسلیم کیا گیا ہے۔ کہ منتخبہ مجلس یعنی پارلیمنٹ یا اسمبلی میں جس پارٹی کے ممبروں کی اکثریت ہو وہ حکومت (وزارت) کے شعبوں پر قابض ہو کر حکمرانی کرے۔ اور جس پارٹی کے ممبروں کی تعداد کم ہو وہ وزارت کے عہدوں سے محروم رہ کر حزبِ مخالف کی بنچوں پر بیٹھے۔ حزب الاختلاف میں چاہے کیسی ہی قابل

ترین ہستیاں کیوں نہ موجود ہوں۔ لیکن چونکہ وہ اقلیت کی پارٹی کے ممبر ہیں۔ لہذا وہ وزارت سے محروم رہیں گے۔ اس کے برعکس اکثریت والی پارٹی میں چاہے کتنے ہی نااہل لوگ کیوں نہ موجود ہوں لیکن چونکہ وہ اکثریت میں ہوں گے لہذا وزارت کی کرسیاں ان کے ہی سپرد کی جاویں گی۔ الغرض وزارت سازی میں قابلیت کا نہیں بلکہ صرف پارٹی کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

ایسی حالت میں حزب مخالف کا کام صرف یہ رہ جاتا ہے، کہ حکمران جماعت کی طرف سے جو قوانین یا تجاویز پیش کی جائیں ان پر نکتہ چینی کی جائے یا ہر ممکن مخالفت کی جائے۔ اگر اس نکتہ چینی یا مخالفت کے اثر سے یا کسی اور وجہ سے حکمران جماعت کے ممبر ٹوٹ کر حزب مخالف میں آملیں۔ اور حکمران پارٹی اقلیت میں رہ جائے تو پھر حزب مخالف کی طرف سے حکمران جماعت کے لیڈر (یعنی وزیر اعظم) پر عدم اعتماد کا ووٹ لیا جاتا ہے۔ اور اس کی وزارت کو توڑ کر نئی پارٹی وزارت سنبھال لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حزب مخالف کے ہر فرد کے دماغ میں مخالفت ہی کا سودا ہوتا ہے۔ اس کے سینے میں مخالفت کی بھٹی ہر وقت سلگتی رہتی ہے۔ چونکہ اس کا کام ہی مخالفت کر کے اپنے مد مقابل کی تجویز کو گرانا ہوتا ہے۔ لہذا وہ ہر حق و ناحق اچھے اور برے پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرتا رہتا ہے۔

اور لبسا اوقات تو حزب مخالف کے بعض افراد نفسانی حرص، ذاتی مفاد، ضد یا ہٹ دھرمی کی بناء پر پانچویں کالم کے طور پر بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ تخریبی کارروائیوں پر اتر آتے ہیں اور اپنی سیاسی چالبازیوں کے ذریعے بعض فلاح و بہبود کے منصوبوں کو بھی ناکام بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض اوقات اس شخص کے خلاف بھی ریشہ دوانیاں کر کے اسے بدنام کرتے ہیں جو ملک اور قوم کی صحیح خدمت انجام دے رہا ہو۔

اگر آپ ان کے ایوانوں (اسمبلیوں) میں داخل ہو کر ان کے مباحثوں کو عملی اور عقلی معیار پر پرکھیں تو آپ حیران ہو جائیں گے۔ کہ کس طرح حکومت اور قوم کا پیسہ خرچ کر کے ایسے نااہل لوگوں کو عوام کا نمائندہ چنا گیا ہے۔ کئی دفعہ تو آپ کو یہ بھی پتہ نہ چل سکے گا۔ کہ بحث میں حصہ لینے والے حضرات کہنا کیا چاہتے ہیں۔ ایک پر شور ہجوم ہوتا ہے۔ جس میں سب لوگ عجیب عجیب طریقوں سے ہاتھ مار مار کر اور منہ بنا بنا کر ایک دوسرے کے خلاف گلا پھاڑ پھاڑ کر بولتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ لبسا اوقات بعض ممبر غیر ذمہ دارانہ طور پر کسی تجویز یا منصوبے کے منظور کر لینے یا رد کر دینے کی رائے دے دیتے ہیں۔ ان میں اکثر ممبر حضرات تو ایسے بھی ہوتے ہیں۔

جو اصل تجویز سے بھی واقف نہیں ہوتے بلکہ بعض حضرات پر تو اس وقت اونگھ طاری رہتی ہے اور بعض اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں۔ لیکن جب ان کی پارٹی کے لوگ ہاتھ اٹھا لیتے ہیں اور ایک شور برپا ہو جاتا ہے۔ تو یہ بھی چونک جاتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو دیکھتے ہی فوراً ہاتھ کھڑا کر لیتے ہیں اور اس طرح اکثر ایسی تجاویز بھی منظور ہو جاتی ہیں۔ جن میں چند سرکردہ افراد کے ذاتی مفاد تو پنہاں ہوتے ہیں۔ مگر ان میں قومی تعمیر کا کوئی منصوبہ شامل نہیں ہوتا۔

اسلامی شوریٰ اور حزب مخالف

اسلام حزب مخالف کا قائل نہیں ہے۔ اسلام میں اگر کوئی شخص احکام خداوندی میں مخالفت پیدا کر کے اسلامی جماعت میں انتشار ڈالتا ہے تو ایسے شخص کو قرآن نے فاسق کے نام سے خطاب کیا ہے۔ خود قرآن کے احکام کو ماننے یا اس میں مخالفت کی راہ ڈھونڈنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کی ۲۶ آیت میں تمثیلی رنگ میں اس طرح سمجھایا ہے کہ :۔ "اللہ تعالیٰ تو مثال بیان کرنے میں اس بات سے نہیں شرماتے کہ وہ مچھر کی ہو یا اس سے بڑھی ہوئی کسی چیز کی۔ جو لوگ ماننے والے (مومن) ہیں وہ تو یہی یقین کریں گے کہ بیشک یہ مثال بہت ہی موقع کی ہے ان کے رب

کی جانب سے اور جو لوگ منکر ہیں وہ کہیں گے کہ یہ کیا حقیر سی چیز ہے جس کی مثال اللہ تعالیٰ نے دی۔ (اسی طرح اس معمولی مخالفتوں کی بناء پر) بہت سے لوگ گمراہ کئے جاتے ہیں اور بہت سے لوگ راہ پا جاتے ہیں۔"

اور آگے ارشاد ہے:۔ وَمَا یُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ ۪ وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ٥ (البقرہ ع ۳)

ترجمہ:۔ "اور گمراہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ کسی کو مگر صرف فاسقین (نافرمانوں) کو جو کہ اس عہد کو توڑتے ہیں جو وہ اللہ تعالیٰ سے کر چکے تھے اس کے استحکام کے بعد، اور قطع کرتے ہیں ان تعلقات کو جن کی وابستگی کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے (یعنی اسلام کی وحدت ملی میں انتشار ڈال کر علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں) اور زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ پس ایسے ہی لوگ پورے خسارے میں پڑنے والے ہیں۔"

جب مسلمانی کا مطلب ہی اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار ہو جانا ہے۔ تو پھر مخالفت کے کیا معنی؟ تاریخ گواہ ہے کہ عہد رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) میں کوئی [illegible]

مخالف موجود نہ تھا۔ بلکہ جن لوگوں نے مخالفت اختیار کی یا اپنی مخالفت پر اڑے رہے ان کو قرآن مجید نے منافقین کے نام سے موسوم کیا ہے۔ حالانکہ شوریٰ (یعنی اسمبلی) اس وقت بھی موجود تھی قرآن مجید ہمیں بتلاتا ہے کہ:-
"اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" (ان کے تمام امور شوریٰ سے طے کئے جاتے تھے) خود رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قرآن نے حکم دیا ہے۔ "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ" آپؐ ان سے ہر امر میں مشورہ کیا کیجئے۔ عہد خلافت راشدہ میں بھی ہمیں کوئی حزب مخالف نظر نہیں آتا، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد ہی جبکہ انتخاب خلیفہ کا مسئلہ امت کے سامنے رہا۔ تو مسلمانوں میں نہ صرف منافقوں کی ایک ایسی جماعت موجود تھی۔ جس کا کام مسلمانوں میں انتشار پھیلا کر فساد برپا کرنا تھا۔ بلکہ خود ان میں سے کچھ افراد ایسے تھے کہ جو یہ سمجھتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص بھی آپؐ کا جانشین ہوگا۔ وہی تمام عرب کا بادشاہ ہوگا۔ ابھی تک کوئی نقشہ خلافت ان کے دماغوں میں نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز وتکفین بھی مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ انصار کی ایک

جماعت سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئی اور سب نے سعد بن عبادہ کو اپنا امیر منتخب کرنے کا اعلان کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب یہ اطلاع پہنچی تو آپؓ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکان سے ساتھ لیا، راستے میں ابوعبیدہ بھی ساتھ ہو لئے۔ ان حضرات کے دلائل نے انصار کو اس مفسدانہ عمل سے باز رکھا اور وہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتخاب عمل میں آیا۔ گو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت زبیرؓ حضرت طلحہؓ، حضرت ابوسفیانؓ اور بہت سے دوسرے بنوہاشم نے ابتداء میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت نہیں کی لیکن ان حضرات نے کوئی عملی مخالفت بھی نہیں کی۔ بلکہ خاموشی اختیار کی۔ بعض روایات کی رو سے حضرت علی علیہ السلام کو یہ شکایت تھی کہ انتخاب کے وقت اُن کو شامل نہیں کیا گیا لیکن جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا۔ کہ ان کے شریک نہ کئے جانے کی وجہ یہ تھی کہ انتخاب کے وقت آپؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز وتکفین میں مصروف تھے اس لئے موقع پر آپ کو نہیں بلایا گیا۔ تو آپ مطمئن ہو گئے۔ حالانکہ اگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ حزب مخالف بن کر اپنی خلافت کا دعویٰ کرتے یا کم از کم دوبارہ انتخاب، مطالبہ کرتے اور

عوام کے سامنے یہ دلیل پیش کرتے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی وارث اور وصی ہوں اور الحدیث " اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا " (میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے) کے مطابق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بڑا عالم ہوں۔ چونکہ عوام الناس میں بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ بہت زیادہ مقبول تھے۔ اس لئے وہ بڑی آسانی سے حزب مخالف کی پوزیشن اختیار کر سکتے تھے، چاہے وہ حکومت تشکیل دینے میں ناکام ہی ہو جاتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اسلام میں حزب مخالف بنانا ایک عظیم فتنہ کھڑا کرنا ہے جس کا نتیجہ انتشار اور خانہ جنگی کے سوا کچھ نہیں۔

چنانچہ نہج البلاغہ نامی کتاب (جو حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے خطبات و کلمات کا مجموعہ گردانی جاتی ہے) میں خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا وہ خطبہ درج ہے جو انہوں نے اس موقعہ پر دیا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں جب انصار و مہاجرین نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ تو ابو سفیان نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ ابن عبدالمطلب کو ابھارا کہ خلافت بنو ہاشم سے نکل کر بنی تیم میں جا رہی ہے۔ آیئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس چلیں اور ان کی بیعت کر لیں، آپ چونکہ عم رسول ہیں۔

اور قریش میری بات مانتے ہیں۔ لہذا خلافت علی رضؓ کے بعد مخالفین کو ہم کچل دیں گے جو سر اٹھائے گا قتل کر دیں گے۔ مگر حضرت علی علیہ السلام مسلمانوں میں فتنہ و فساد نہیں چاہتے تھے۔ لہذا انہوں نے ان کے جواب میں فرمایا کہ " میں مسلمانوں میں فتنہ و آشوب پسند نہیں کرتا، بہتر یہی ہے کہ میں الگ رہوں اور افتراق پسندی سے اپنا دامن بچائے رکھوں۔ پھر انہوں نے عوام کے سامنے بھی یہ خطبہ دیا جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

" اے لوگو! فتنوں کی موجوں کو نجات کی کشتیوں سے چیر کر پار ہو جاؤ، منافرت کی راہ چھوڑ دو اور منافرت اور بڑائی کے تاج سر سے اتار کر زمین پر پھینک دو، جو پر و بال (یا رو یاور) کے ساتھ اٹھا وہ کامیاب ہوا جس نے حالات کو ان کے حال پر چھوڑا، اس نے راحت پائی، یہ (ذمہ داری) تو ایک گندہ پانی ہے۔ وہ لقمہ ہے کہ جس کے کھانے سے اچھو ہو جاتا ہے۔ جو خلافت کی میوہ چینی کرتا ہے وہ غیر کی زمین پر زراعت کرتا ہے۔ میں اگر اب خلافت کے بارے میں کچھ کہوں تو لوگوں کو کہنے کا موقع ملے گا۔ کہ یہ امامت کی حرص ہے۔ اور اگر خاموش رہتا ہوں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ کہیں گے کہ مرنے سے اور جان دینے سے ڈرتا ہے۔ ہیہات! میں چھوٹے بڑے ہر طرح کے مصائب جھیل چکا ہوں ــــ خدا کی قسم ابوطالب

کا بیٹا موت سے اتنا ہی مانوس ہے جتنا ایک طفل شیر خوار پستان مادر سے انس رکھتا ہے۔ نہیں یہ بات نہیں میرے سکوت اور خاموشی کا راز وہ اسرار ہیں کہ جو کچھ میں جانتا ہوں، اگر اسے افشا کر دوں، تو تم یوں لرزنے اور کانپنے لگو گے جس طرح گہرے کنوؤں میں رسیاں لرزتی اور کانپتی ہیں"

نہج البلاغہ کے اردو مترجم (جناب رئیس احمد جعفری ندوی) لکھتے ہیں "(سقیفہ بنی ساعدہ میں جب انصار و مہاجرین نے حضرت ابوبکر صدیق رض کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو) قدرتاً یہ بات بنو ہاشم کو ناگوار گذری، ابوسفیان نے عم رسول ص حضرت عباس ابن عبد المطلب کو راضی کیا کہ وہ حضرت علی رض کو آمادہ کریں کہ وہ امارت قبول کر لیں یہ اطمینان بھی دلایا کہ میں قریش پر اثر رکھتا ہوں ان سے کام لوں گا، جو سر اٹھائے گا کچل دیا جائے گا۔ حضرت علی رض کو اگر امارت کی طمع ہوتی تو بیشک وہ تیار ہو جاتے اور بڑی آسانی سے خلافت کا مطالبہ کرتے ایک جنگ مسلمانوں میں چھیڑ دیتے لیکن انہوں اپنی (خداداد) قوت ایمانی اور بصیرت سے اندازہ کر لیا کہ اگر یہ بات مان لی گئی تو اس کے اثرات و نتائج کیا ہوں گے؟ چنانچہ ہر قسم کی پشت پناہی کے وعدوں کے باوجود، آپ نے یہ استدعا قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا، اور کسی قیمت پر بھی تفریق

بین المسلمین پر راضی نہ ہوئے۔ یہ حضرت علیؓ کا اتنا بڑا کارنامہ ہے۔ جسے اسلام کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔"

یہی رویہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے وقت اختیار کیا حالانکہ بعض روایات میں ذکر ہے کہ اس مرتبہ حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ کے انتخاب خلافت پر خاص طور پر قلق ہوا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ حضرت عثمان اس ذمہ داری کو باحسن وجوہ نہیں نبھا سکیں گے۔ (الغرض اگر حضرت علیؓ کا انتخاب اس موقع پر ہو جاتا تو ہمارا اندازہ یہ ہے کہ بنو امیہ حضرت عثمانؓ کی نرم طبعی سے فائدہ اٹھا کر برسر اقتدار نہ آ سکتے اور نہ ہی خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوتی۔ بلکہ یوں کہئے کہ نہ تو یزید، عبیداللہ ابن زیاد اور شمر جیسے ظالم فاسق و فاجر لوگ مسلمانوں کے حاکم بنتے اور نہ ہی مسلمانوں میں گروہ بندی اور افتراق کا موقع آتا)۔ لیکن جب چار مسلمانوں نے حضرت عثمانؓ کی بیعت کر لی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان کی مخالفت یا ان سے علیحدگی کو امت میں تفرقہ ڈالنے کا موجب سمجھتے ہوئے خود بھی بیعت کر لی۔

پس ظاہر ہے کہ اگر اسلام حزب مخالف کی اجازت دیتا تو سب سے پہلے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتے کی وجہ سے حضرت علی علیہ السلام کو یہ حق پہنچتا تھا۔ کہ وہ اپنی

خلافت کے لئے آواز اٹھاتے یا کوئی علیحدہ جماعت یا گروہ بنا کر حزب مخالف کے بنچوں پر بیٹھتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اسلام اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دیتا کہ کوئی شخص نظام جماعت سے علیحدہ رہ کر اسلام کے ساتھ اپنی وابستگی قائم رکھ سکے اور انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان خوب یاد تھا کہ: "عن ابی ذر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من فارق الجماعۃ شبراً فقد ربقۃ الاسلام من عنقہ" (ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا "کہ جو نظام جماعت سے بالشت بھر بھی ہٹا اس نے درحقیقت اپنی گردن سے اسلام کا حلقہ اطاعت نکال پھینکا)

تاریخ گواہ ہے کہ جب تک مسلمانوں نے مخالفت پھیلانے والوں کا ساتھ نہیں دیا اور ان کی افواہوں کو اسلامی جماعت میں منافقت اور منافرت پھیلانے کا موجب سمجھتے رہے یا یوں کہیئے کہ جب تک انہوں نے حزب مخالف کی حیثیت میں دوسرا فرقہ کھڑا نہیں کیا تھا۔ تب تک فتنوں کے دروازے بھی بند رہے۔ اور جوں ہی انہوں نے مخالفت پھیلانے والوں کی افواہوں پر کان دھرنا شروع کیا تو عبداللّٰہ ابن سبا جیسے

منافقوں نے موقع پاکر سب سے پہلے تو بنوامیہ کے عمال (گورنر) کے خلاف عوام الناس کو اکسانا شروع کیا۔ اور جب لوگوں میں ان عمال کے خلاف شکایت عام ہوگئی تو عبداللہ ابن سبا نے اس کی وجہ حضرت عثمانؓ کی قوم پرستی اور عوام سے لاپرواہی بتلا کر عوام الناس کو خلیفہ سے متنفر کرنا شروع کر دیا۔ اور جب عوام کا رخ خلیفہ کی طرف ہوا تو منافقوں نے موقع سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عوام کو حضرت عثمانؓ کے خلاف اور زیادہ بھڑکانا شروع کیا اس طرح جب عوام الناس میں خلیفہ کے خلاف ایک عام ہیجان پیدا ہو گیا۔ تو عبداللہ ابن سبا نے دو ہزار بلوائیوں کو مدینہ منورہ میں جمع کر کے بنوامیہ کے عمال کو ہٹانے کا مطالبہ پیش کیا۔ اور اس طرح اس فساد کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلیفہ سوم (حضرت عثمانؓ) کی شہادت واقع ہوگئی۔

آپ کی شہادت کے بعد اصحاب بدر اور دیگر معززین حضرات نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا خلیفہ منتخب کیا۔ بدقسمتی سے اس انتخاب میں حضرت عثمانؓ کے قتل کے ذمہ داروں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ اور ان بلوائیوں سے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو سخت نفرت تھی۔ مگر بلوائیوں نے انہیں بھی نہ چھوڑا اور جس طرح حضرت علی علیہ السلام کو منصب خلافت قبول کرنے پر مجبور کیا اسی طرح ان دو حضرات کو بیعت کرنے پر بھی مجبور کیا گیا۔

چنانچہ اِن ہر دو حضرات نے بادلِ ناخواستہ حضرت علیؑ کی بیعت تو کر لی۔ مگر دوسرے ہی دن مکہ معظمہ کی راہ لی۔ وہاں جا کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضرت عثمانؓ کے خون کا قصاص لینے پر آمادہ کیا جس کا نتیجہ جنگ جمل (جمادی الاول ۳۶ھ) کی شکل میں ظاہر ہوا جس میں حضرت علی علیہ السلام کو فتح ہوئی۔ حالانکہ بعض روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جنگ بھی منافقوں نے ہی کرائی تھی واقعہ یوں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی فوجوں کو یہ حکم دیا تھا۔ کہ کسی صورت میں بھی پہل تمہاری طرف سے نہ ہو۔ چنانچہ جب میدان میں پہنچے تو حضرت علیؓ نے حضرت طلحہؓ، زبیر اور حضرت عائشہؓ سے خود بات چیت کی۔ اور ان سے گھر سے نکلنے اور اس بغاوت کی وجوہات پوچھیں جس کے جواب میں انہوں نے حضرت عثمانؓ کے قتل کے قصاص کا مطالبہ کیا حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں قاتلینِ حضرت عثمانؓ سے ضرور قصاص لونگا جس پر ان کے درمیان صلح ہوئی اور وہ اپنی اپنی فوجوں میں واپس چلے گئے۔ مگر رات کو منافقین اور قاتلینِ عثمانؓ نے آپس میں مشورہ کیا کہ اگر یہ جنگ نہ ہوئی تو ہماری خیر نہیں لہذا وہ رات کے اندھیرے میں آدھے تو حضرت عائشہؓ کی فوج میں گئے۔ اور آدھے حضرت علیؓ کی فوج میں گھس گئے اور مچھڑے شدہ

پروگرام کے مطابق ایک دوسرے کی فوجوں پر حملہ آور ہوئے پس جو لوگ حضرت عائشہ کی فوجوں میں گھسے تھے انہوں نے یہ شور مچایا کہ حضرت علی رضؓ اپنے وعدے سے پھر گئے اور ان کی فوجوں نے رات ہی رات کو حملہ کر دیا اور جو منافق حضرت علی علیہ السلام کی فوجوں میں گھسے تھے انہوں نے شور مچایا کہ حضرت عائشہ نے وعدہ خلافی کی اور رات ہی رات کو حملہ کر دیا اور اس طرح جنگ کی بنیاد رکھ دی گئی

ادھر امیر معاویہ جن کو حضرت علی علیہ السلام نے امارت سے معزول کر دیا تھا۔ تقریباً سات ماہ تک تو خاموش رہے۔ لیکن جنگ جمل کے فوراً بعد حضرت عثمانؓ کے خون کے قصاص کا اعلان کر دیا جس کے لئے زمین وہ پہلے ہی تیار کر چکے تھے۔

دراصل جب عوام الناس بنو امیہ کے عمال سے تنگ آئے اور انہوں نے خلیفہ سوم سے احتجاج کیا جس کی نوبت بغاوت اور خلیفہ کی شہادت تک پہنچی۔ تو حضرت علی علیہ السلام نے عوام الناس کے مطالبات کا پاس رکھتے ہوئے باقی عمال کے ساتھ امیر معاویہؓ کو بھی برطرف کر دیا۔ لیکن امیر معاویہ نے نہ اس حکم کی فوراً اطاعت کی اور نہ ہی مخالفت کا اعلان کیا۔ بلکہ در پردہ حضرت عثمانؓ کے خون کا احساس

ولا دلا کر شامیوں میں ایک جوش پیدا کرتے رہے یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ آپ نے حضرت علی علیہ السلام کے انتخاب خلافت کی کوئی مخالفت نہ کی اور نہ ہی خود کو امیدوار کی حیثیت سے پیش کیا۔ بلکہ ان کا مطالبہ صرف ایک تھا یعنی حضرت عثمانؓ کے خون کا قصاص، ظاہر ہے کہ اس طریقۂ کار کی کوئی مخالفت نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن اس واقعہ کو امیر معاویہ نے جس طرح خلیفۂ وقت کی مخالفت کا بہانہ بنایا۔ یقیناً جماعتی نظم اور اطاعت امیر کی اسلامی تعلیمات کے خلاف تھا۔ (اور خلیفہ بھی وہ جن کے انتخاب کو وہ عملی حیثیت سے جائز تسلیم کر چکے تھے کیونکہ انتخاب خلیفہ کا وجود میں آجانے کے ساتھ ماہ بعد تک خاموش رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں انتخاب خلافت میں کوئی مخالفت نہ تھی)

حق تو یہ تھا کہ جس وقت امیر معاویہ کے پاس عزل کا پروانہ حضرت علی علیہ السلام (جو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین مانے گئے تھے) کی طرف سے پہنچا تو وہ وہی راستہ اختیار کرتے جو حضرت خالدؓ ابن ولید نے حضرت عمرؓ کا حکم پاتے ہی اختیار کر لیا تھا۔ اور اگر وہ حضرت علیؓ کو مستحق خلافت نہ بھی سمجھتے ہوتے، تب بھی انتخاب کے

عمل میں آجاتے اور حرمین شریفین، بصرہ اور کوفہ کے مسلمانوں کی بیعت اور خاص کر اصحاب بدر اور بیعتِ رضوان کے صحابہ کی متفقہ بیعت کے بعد امت کے اتحاد کی خاطر ان کو اسی طرح اطاعت کرنی چاہیئے تھی جس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے سے پیشتر تین خلفاء کی کی تھی۔

انتخاب خلیفہ کے بعد ایک عامل کی حیثیت سے ان کے سامنے صرف ایک راہ تھی وہ یہ کہ خلیفۂ وقت کے حکم کی اطاعت میں اپنے عہدہ کا چارج نئے مقرر شدہ عامل کو دے کر قاتلانِ عثمانؓ کے قصاص کا سوال خلیفہ سے کرتے اور اس کے لئے وہی راستہ اختیار کرتے جو اسلام نے مقرر کیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا بلکہ امیر معاویہ نے خلیفۂ وقت کے خلاف ایک باقاعدہ محاذ قائم کیا۔

غرض اس طرح امیر معاویہ نے پہلی بار اسلامی جمہوریت میں حزب مخالف کی بنیاد رکھی اور آہستہ آہستہ اس حزب مخالف نے بہت بڑی پوزیشن اختیار کی جو بعد میں جاکر نہ صرف "ملوکیت" پر منتج ہوئی بلکہ اس کے باعث مسلمانوں میں باہم کشت وخون کا دروازہ بھی کھل گیا۔ اور اس

قدر خونریزیاں ہوئیں کہ جس کی مثال تاریخ میں ملنی محال ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ مسلم مجاہدین کی ایک بہت بڑی تعداد آپس میں جنگ کرتی ہوئی ختم ہو گئی، بلکہ مسلمان، شیعان علی، خوارج، اور شیعان معاویہ میں تقسیم ہو گئے اور بعد میں اس مخالفت کی بناء پر امت مسلمہ میں شیعہ اور سنی کا ایک عظیم فتنہ پیدا ہو گیا اور مسلمانوں میں ایک ایسا تفرقہ پڑ گیا جس کی اصلاح آج تک نہ ہو سکی۔ یہی ہے وہ حکمت جو اسلام کے حزب مخالف کو تسلیم نہ کرنے میں پوشیدہ ہے۔

اسلام کبھی کسی علیحدہ جماعت، گروہ یا فرقہ بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام تو سراپا تسلیم کا دوسرا نام ہے۔ جو کامل اتحاد، یقین محکم، اخوت و مساوات اور بلاچون و چرا اطاعتِ امیر کا حکم دیتا ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے:۔ عن ابن عباس رضؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ مَنْ کَرِہَ مِنْ اَمِیْرِہٖ شَیْئًا، فَلْیَصْبِرْ، فَاِنَّہٗ مَنْ خَرَجَ مِنَ السُّلْطَانِ شِبْرًا مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً" (بخاری کتاب الفتن)

ترجمہ:۔ ابن عباس رضؓ سے روایت ہے۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا:" کہ جس شخص کو اپنے امیر کی کوئی بات ناگوار گذرے تو اس کو چاہیئے کہ صبر کرے۔

کیونکہ جو شخص سلطان کی اطاعت سے بالشت بھر بھی باہر ہؤا وہ جاہلیت کی موت مرا "

البتہ اگر نظام حکومت فساق کے ہاتھوں میں آجائے اور وہ لوگ قرآن و سنت سے ہٹ کر حکم دیں۔ اور قرآن مجید کے حکم کے بموجب فاسق و فاجر اور ظالم بن جائیں تو ایسی حالت میں داعیانِ حق پر لازم ہے کہ وہ صالحین کی ایک ایسی باعمل جماعت بنالیں جو لوگوں کو خیر کی طرف بلایا کریں نیکی پر امر کریں اور منکرات سے روکا کریں۔ کیونکہ قرآن مجید کا ارشاد ہے :" وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ " ٥ (آل عمران)

" اور تم میں کا ایک ایسا گروہ ضرور ہونا چاہیئے جو لوگوں کو خیر کے کاموں کی طرف دعوت دیا کرے ، لوگوں کو نیکی پر امر کیا کرے اور برائی سے منع کیا کرے ۔ اور ایسے ہی لوگ فلاح یافتہ ہیں "

دراصل " امر بالمعروف " اور " نہی عن المنکر " کی ذمہ داری قوم اور ملک کے سربراہ لوگوں (حکام) پر ہے ۔ بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ قرآن و سنت کے احکام کو نافذ کرنا ، معروف کا حکم دینا ، منکر سے روکنا ، نماز اور دوسرے ارکان و شعائر اسلامی کو برپا

کرنا ایک اسلامی حکومت کا فرض ہے۔ اگر اسلامی حکومت کے حکام ان اوصاف سے خالی ہوں تو ان کی اطاعت بھی لازم نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:۔

"وعند ابن ابی شیبة من حدیث عبادة سیکون علیکم امراء یامرونکم بما لا تعرفون ویفعلون ما تنکرون فلیس لاولئکم طاعة"

مسند ابن ابی شیبہ میں عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عنقریب تم پر ایسے امراء مسلط ہوں گے جو تم کو ایسی باتوں کا حکم دیں گے جو تمہارے معروف نہیں ہوں گی اور ایسی باتیں کریں گے جن کو تم منکر قرار دو گے، تو ایسے امراء کی اطاعت تم پر لازم نہیں۔"

اور ارشاد ہے:۔ "وللطبرانی عن عبادة سیلی امورکم من بعدی رجال یعرفونکم ما تنکرون وینکرون علیکم ما تعرفون فلا طاعة لمن عصی اللہ" ترجمہ:۔ (طبرانی میں عبادہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد تمہارے معاملات کے سربراہ ایسے لوگ ہوں گے جو تمہارے سامنے ان باتوں کو معروف کی حیثیت پیش کریں گے جن کو تم منکر سمجھتے ہو اور وہ ان باتوں کو منکر قرار دیں گے جن

کہ تم معروف مانتے ہو۔ سو جان لو کہ تم پر ان کی اطاعت لازم نہیں ہے۔ جو اللہ کی نافرمانی کریں۔) (ماخوذ از "اسلامی ریاست" (۱) از مولانا امین احسن اصلاحی)

" فَلَا طَاعَةَ لِمَنْ عَصَى اللّٰه " کا جملہ قابل غور ہے۔ ایک اور بھی متفق علیہ حدیث شریف جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ " اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ " (اطاعت صرف معروف میں ہے) اور یہاں فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کریں ان کی اطاعت تم پر لازم نہیں۔ یعنی اگر تمہارے حکام تم پر ایسے احکام مسلط کرنا چاہیں جو قرآن و سنت کے خلاف ہوں یا وہ کھلم کھلا قرآن و سنت کی خلاف ورزی کرنا شروع کر دیں تو تم پر ان کی اطاعت لازم نہیں کیونکہ اطاعت صرف معروف میں ہے۔ پس ایسی حالت میں داعیانِ حق پر لازم ہے کہ وہ خود ایک ایسی جماعت بنائیں جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائیں، انہیں نیکی پر آمادہ کریں اور برائی سے روکیں۔ ایسی جماعت حزب مخالف نہیں بلکہ اصل اسلامی جماعت تصور کی جائے گی، البتہ مخالف اسلام جماعتیں جو اس کے خلاف ہوں گی وہ از روئے اسلام حزب مخالف تصور کی جائیں گی۔

ترکی میں جمہوریت کی ابتداء اور حزب مخالف

مغربی دنیا نے جس جمہوریت کی داغ بیل ڈالی اسلامی دنیا بھی اس کے اثر سے خالی نہ رہ سکی۔ چنانچہ سب سے پہلے ترکی (جو اس وقت کی سب سے بڑی اسلامی مملکت تھی) میں اس جمہوریت کی ابتداء ہوئی۔ یورپین اقوام کے ترکی کے خلاف متحدہ جنگ لڑنے اور ترک قوم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کے ناپاک منصوبوں سے کون واقف نہیں۔ لیکن جب ترک قوم کو مصطفےٰ کمال اور عصمت انونو جیسے قومی جرنیل نصیب ہوئے۔ تو ترکوں کی شکست بھی فتح میں تبدیل ہوئی۔ یورپین اقوام کو شکست ہو جانے کے بعد انہیں ترک قوم کے تمام مطالبات بھی مان لینے پڑے چنانچہ ۱۹۲۳ء میں صلحنامہ لوزن پر دستخط ہو گئے جس میں ترک قوم کے تمام پیش کردہ مطالبات تسلیم کر لئے گئے۔

یہ صلحنامہ ترک قوم کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ ترک مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے تھے۔ پورے ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک مسرت و شادمانی کے شادیانے بج رہے تھے۔ اس لئے کہ اب دنیا نے یہ تسلیم کر لیا تھا۔ کہ معاہدہ سیورے (جس میں ترکی فوج پر سخت پابندی لگائی گئی تھی۔ ترکی کے کچھ علاقے تو اتحادی کمیشن کے ماتحت رکھے گئے تھے اور

کچھ یونان اور اٹلی میں تقسیم کئے گئے تھے) ہمیشہ کے لئے منسوخ
ہو کر ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گیا۔ آرمینیا کی عیسائی قوم کو
جو خود مختاری دی گئی تھی وہ منسوخ ہو گئی۔ یورپی طاقتوں
نے ترکی تجارت و مالیات پر جو پہرے بٹھا رکھے تھے وہ منسوخ۔
قسطنطنیہ اور اس کے اطراف سے اتحادی کمیشن واپس، تھریس
واپس، اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ دس لاکھ یونانی جو اناطولیہ
میں بستے تھے۔ ان کی بابت طے ہوا، کہ وہ مشترکہ مصارف پر
یونان واپس کئے جائیں گے۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ حکومت کس قسم کی بنائی جائے؟
کچھ لوگوں کی رائے ہوئی کہ خلافت کو دوبارہ قائم کیا
جائے، بعض نے کہا۔ کہ روس کی اشتراکی حکومت سے اتحاد
کیا جائے۔ کچھ نے یہ رائے دی کہ یورپی انداز پر آئینی و
دستوری شاہی قائم کی جائے مگر مصطفیٰ کمال نے اپنی
شخصیت کے اثر و رسوخ اور حاضر [illegible] سے ان تینوں
تجویزوں کو ٹھکرا دیا اور بالآخر [illegible] وطن" نے زبردست
اکثریت سے [illegible] کے [illegible] دیکھا [illegible] کی جگہ
"جمہوریت" کو نافذ کر دیا۔

چنانچہ عصمت اور کمال دونوں نے مل کر ایک دستور
اساسی کا مسودہ تیار کیا جسے کچھ تو حکمت عملی سے اور کچھ

تخویف و دہشت انگیزی سے قومی مجلس سے پاس کرا لیا گیا۔ اس دستور اساسی کی بنیاد جمہوریت پر قائم کی گئی تھی۔ سلطنت وشہنشاہیت کے تصور کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا اور حکومت کو مغربی جمہوریت کی طرز پر قائم کر دیا گیا۔

حکومت کے نظم و نسق کو مغربی جمہوریت کی طرز پر قائم کر دینے کے بعد یہ بات ضروری ہوگئی تھی، کہ معاشرتی امور میں بھی مغرب ہی کی تقلید کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مصطفیٰ کمال نے آنکھیں بند کر کے مغرب کی تقلید کی۔ اس کے دماغ میں یہ بیٹھ گیا تھا۔ کہ ترک جب تک پوری طرح یورپ کے رنگ میں نہ رنگ جائیں یورپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور نہ ہی ترقی کر سکتے ہیں۔ گو اسلامی تعلیمات اور مشرقی تہذیب کا اثر ابتدائی عمر میں اس کے دل و دماغ پر کچھ کم نہ تھا۔ لیکن عربوں کی بغاوت سے ترکی کو جو نقصان پہنچا، اور خلافت اسلامیہ کے نام پر سلاطین عثمانیہ نے اور شیخ الاسلام کے نام پر علماء نے ترکی نے ترقی پسندی کی راہ میں جو رکاوٹیں پیدا کیں ان کی بنا پر اس کا دل مشرقیت اور اسلامیت دونوں سے بیزار ہو گیا تھا۔ وہ ترقی کے انقلابی عہد کی پیداوار تھا۔ اور جرمنی کی نیشنلزم کی طاقت و قوت کے کھلے مظاہرے اس کے سامنے تھے۔ اس نے

اس نے ترکی میں جو اصطلاحات نافذ کیں ان میں ماضی سے
وابستگی، مشرق سے وابستگی اور اسلام سے وابستگی کا کوئی خیال
نہ کیا گیا۔ وہ ظاہری و باطنی اور اندرونی و بیرونی ہر
طریقے سے ترکی کو مغربی وضع کی "قومیت" کے قالب میں
ڈال کر اسے ایک طاقتور مغربی قوم بنا دینے کا آرزومند
تھا۔ مگر چونکہ اس کی نظر ظاہر پر تھی اس لئے سب سے پہلے
اس نے ترکی ٹوپی کے خلاف احکام جاری کئے۔ اس نے
کہا کہ یہ دور جہالت و غلامی کی نشانی ہے اس لئے اس
کے بجائے یورپی ٹوپی (ہیٹ) استعمال کی جائے۔ اس
تبدیلی پر اُسے اتنا اصرار تھا کہ اسے حکماً نافذ کیا گیا۔ اور
عدول حکمی کرنے والوں کے لئے سزا تجویز کی گئی۔

لیکن جس چیز نے ترکوں کو اپنی ماضی اور اپنے اسلاف
سے بالکل بے تعلق سا کر دیا۔ وہ رومن رسم الخط کا اجرا
تھا۔ کمال کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ ترک قوم اپنے عرب
بھائیوں کی طرح سیدھی طرف سے لکھے اس لئے اس نے ۱۹۲۸ء
میں لاطینی حروف کو حکماً جاری کر کے بائیں طرف سے
لکھے جانے والی تحریر کو ترکی میں نافذ کر دیا۔ اول اول
یہ رسم الخط صرف سرکاری محکمات میں نافذ کیا گیا لیکن
دو سال بعد ۱۹۳۰ء میں سارے ملک کا سرکاری و غیر

سرکاری خط بنا دیا گیا۔

عورتوں کا برقعہ اور نقاب بھی اُسے پسند نہ تھا۔ اس لئے اُسے بھی زبردستی ختم کر دیا گیا۔ ترک عورتیں بے پردہ پھرنے کی عادی نہ تھیں مگر کمال کے حکم کی خلاف ورزی کون کر سکتا تھا! اس لئے جن خواتین کی فطرت اس جدت کو قبول نہ کر سکی انہوں نے خودکشی کر لی۔ اگرچہ خودکشی کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی۔ تاہم کافی تھی۔ محکمہ دینیات، دینی تعلیم کے مکاتب و مدارس اور درویشوں کی خانقاہیں سب بند کر دی گئیں۔ صرف مسجد کے امام کا ایک دینی منصب باقی رکھا گیا۔ اوقاف کی آمدنی کو محض دینی امور میں خرچ کرنے کے بجائے دنیاوی امور میں خرچ کرنے کا قانون بنایا گیا۔

۸ر اپریل ۱۹۲۴ء کو تمام شرعی عدالتیں ختم کر دی گئیں اور ان کی جگہ جدید مغربی قوانین کے مطابق نئے محکمانہ عدالتیں بنائے گئے۔ اسلامی تعلیم کے نام پر جو دینی درسگاہیں سرکاری یا غیر سرکاری طور پر قائم تھیں۔ ان سب کو ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو ایک قانون کے ذریعے بند کر دیا گیا۔ یکم جنوری ۱۹۲۶ء سے ہجری سنہ بھی منسوخ کیا گیا۔ اور اس کی جگہ عیسوی سنہ نافذ ہوا (چیمبرس انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۴ صفحہ ۲۶۸ بحوالہ تاریخ انقلابات عالم از بزمی)

ترکی میں حزب الاختلاف یا اپوزیشن پارٹی

مصطفٰے کمال نے ترکی میں مغربی طرز کی جمہوریت تو قائم کرلی۔ مگر جمہوری حکومتوں کا حزب مخالف والا ادارہ اسے پسند نہ تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا۔ کہ حزب مخالف (اپوزیشن پارٹی) کو قائم کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ آئے دن پیدا ہونے والے جھگڑوں میں قوم کو مبتلا کرتا ہے۔ اس لیے وہ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء تک ایک ڈکٹیٹر کی طرح حکومت کرتا رہا۔ بظاہر ایک منتخب پارلیمنٹ اور ایک جمہوری دستور اساسی ضرور تھا۔ مگر کام اصل مصطفٰے کمال جو کچھ چاہتا وہی ہوتا تھا۔ ہر مسئلہ پارلیمنٹ میں پیش ہوتا تھا۔ لیکن اس پارلیمنٹ میں حزب مخالف (اپوزیشن پارٹی) کو قائم کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یعنی کسی تجویز پر نکتہ چینی یا اعتراض کرنے کی اجازت تو تھی۔ لیکن باقاعدہ ایک مخالف جماعت بنا کر مخالفت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

لیکن اسے یہ احساس ضرور تھا۔ کہ مغربی جمہوریت کے اصول کے مطابق کوئی اپوزیشن پارٹی ضرور ہونی چاہیئے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں اس نے فتحی بے کی قیادت میں ایک اپوزیشن پارٹی بنانے کی منظوری دی۔ لیکن کمال کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ اس پارٹی نے جلد ہی حکومت کی مخالفت شروع کی

ملک میں ادھر اُدھر پھیل گیا۔ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ شاید مصطفیٰ کمال کمزور ہو گیا۔ اور حزب مخالف نے طاقت پکڑ لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جگہ جگہ سے دینی رہنمائی مخالفتیں نے سر اٹھایا۔ اور حزب مخالف میں شامل ہو کر ملک کے طول و عرض میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔

واقعہ یہ ہوا کہ کمال نے جس شدت اور سختی کے ساتھ معاشرتی اصلاحات نافذ کی تھیں ان سے عوام کے دل مطمئن نہ تھے۔ اور کم از کم ان میں ایک تھوڑی سی تعداد ابتداء ہی سے ایسی موجود تھی جو ان اصلاحات کی سخت مخالف تھی۔ مگر ...

کچھ تو بے اقتدار ہونے اور کچھ کم ہونے کی وجہ سے ان کی آواز بے اثر ثابت ہوتی تھی۔ لیکن لوگ دل میں حکومت کے خلاف بھرے بیٹھے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی مفتی یا ملا کی نکتہ چینی ان کے کانوں میں پڑی وہ بے اختیار پھوٹ پڑے اور چونکہ ان کے دل بری طرح متاثر تھے۔ اس لئے مخالفت نے سختی اور ناگواری کی شکل اختیار کر لی۔ جس کے باعث بالآخر مصطفیٰ کمال نے مجبور ہو کر حزب مخالف کو توڑا اور ایک بار پھر آہنی ہاتھ سے مخالفت کو دبایا۔

مصطفیٰ کمال کے بعد عصمت انونو کے عہد میں حزب مخالف پھر آہستہ آہستہ زور پکڑتا گیا۔ اور بالآخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ عصمت انونو کی پارٹی کو شکست ہوئی۔ اور

حکومت دوسری پارٹی کے ہاتھوں میں چلی گئی چنانچہ آج ترکی کی پارلیمنٹ بھی ایک پُرشور ہجوم کی مانند ہو گئی ہے۔ آئے دن پارلیمنٹ میں شور فساد برپا ہونے اور ایک دوسرے پر حملے کرنے کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ ۹ر جون ۱۹۵۶ء کی ایک تازہ خبر اخبار جنگ میں بدیں عنوان میری نظر سے گذری ترکی اسمبلی میں ممبروں کی لڑائی دو ممبر ایوان سے نکال دیئے گئے۔

انقرہ ۸ر جون (اف پ - اپ ا) پریس کے متعلق ایک بل پر بحث کے دوران ایک حادثہ ہو جانے کے سبب ترکی پارلیمنٹ کے دو ممبروں کو اسمبلی سے نکال دیا گیا۔ حزب مخالف کے ممبر عصمت انونو کی تقریر کے دوران دو ممبروں نے بحث شروع کر دی ایک نے ایک اور ممبر کا چھوٹا سا بکس اٹھا کر دوسرے پر دے مارا جس میں سے ایک ریوالور نکل پڑا۔ اسمبلی کے صدر نے بکس مارنے والے اور ریوالور کے مالک کو اسمبلی سے نکال دیا۔ جب بل پر بحث ہو رہی تھی تو ایوان میں کئی بار کھلے بازی ہوئی اور کافی ریل پیل نظر آئی۔ بل کے خلاف تقریر کرنے والے ایک ممبر کے منہ پر دوسرے ممبر نے طمانچہ رسید کر دیا۔ (اخبار جنگ ۹ر جون ۱۹۵۶ء)

دیکھا آپ نے جب ترکوں جیسی ایک نیشن (قوم) ہم مذہب ہونے کے باوجود حزب مخالف (اپوزیشن پارٹی) کے

باعث آپس کی انتشار اور خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئی ہے تو پھر پاکستان کا کیا حشر ہوگا جہاں ان معنوں میں نہ ایک نیشن (قوم) موجود ہے اور نہ ہی ایک مذہب ۔ یہاں کئی نسلیں، کئی زبانیں بولنے والے اور مختلف مذاہب رکھنے والے لوگ آباد ہیں پھر یہاں غالب اکثریت یعنی مسلمان مختلف مذہبی فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں، جو آئے دن ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگاتے رہتے ہیں۔ یہاں تو حزب مخالف سم قاتل کے برابر ہے اور یہی وجہ ہے کہ روس، امریکہ، برطانیہ بھارت اور دیگر دشمن ممالک کے ایجنٹ آئے دن ان لوگوں میں فتنہ و فساد بپا کرتے رہتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہمارے دشمنوں کے ایجنٹ حزب مخالف میں شامل ہو کر ہماری حکومت کے خلاف تخریبی کاروائیاں شروع کر دیں یا وہ حزب مخالف کے نمائندوں میں سے چند ایک کو خرید کر ہمارے خلاف استعمال کریں تو ہمارے پاس اس کا کیا علاج ہے ؟ یا اگر وہ ہمارے ملک کے اندر قابل ترین ہستیوں کے خلاف غلط افواہیں پھیلا پھیلا کر انہیں قوم کی نظروں سے گرا دیں اور ان کی راہ میں رکاوٹ بن کر انہیں صحیح کام نہ کرنے دیں تو ہمارے پاس کیا تدارک ہے ؟ ۔ اور غالبًا یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں صحیح قیادت نصیب نہیں ہو سکی ہے۔ جب کوئی کام کرنے والا آگے آتا ہے، تو خود غرض لوگ اس کی مخالفت میں

کمر باندھ لیتے ہیں۔ اور بالآخر اس کو مایوس بنا کر بیکار کر دیتے ہیں (پاکستان کے سابق وزیر اعظم چوہدری محمد علی کا اپنے عہدے سے مستعفی ہو جانا اس بات کے لئے کافی شہادت ہے۔)

غرض یہ کہ عالم اسلام کے لئے عموماً اور پاکستان کے لئے خصوصاً حزب مخالف کا وجود سم قاتل سے کم نہیں۔ یہاں تو صرف بلا چون و چرا اطاعت امیر کا اسلامی جذبہ ہی ان کے درمیان اخوت و مساوات اور اتفاق و اتحاد پیدا کر سکتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے مسلمانوں کو صاف صاف بتلا دیا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (النساء)

ترجمہ:۔ (پس قسم ہے آپ کے رب کی کہ یہ لوگ اس وقت تک ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے (یعنی قرآن و سنت سے) فیصلہ نہ کرا دیں۔ پھر آپ کے فیصلے سے اپنے دلوں میں تنگی بھی نہ پاویں اور پورا پورا تسلیم کر لیں)

اسلام تو سراپا تسلیم ہے یہاں تو مخالفت کی گنجائش ہی نہیں۔ ہاں جس مخالفت کو اسلام نے ترجمۃً کہا ہے اور جس

کی اجازت دی ہے۔ وہ کسی مسئلے پر آزادانہ بحث و تحیص ہے تاکہ اس کا تاریک اور روشن پہلو امیر کے سامنے واضح ہو سکے تاکہ ہر بات آپس کے مشورے سے طے ہو" وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کے حکم خداوندی کا مقصد بھی یہی ہے اور وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ" کے حکم الٰہی کا مفہوم بھی یہی ہے، کہ ہر امر مشورے سے طے ہو۔ مگر پھر جس امر کو امیر اختیار کر لے یا جس امر کا امیر حکم دے اس کا بلا چون و چرا اطاعت لازم ہے۔ اس میں مخالفت یا اس کے خلاف گروہ بندی امت مسلمہ میں نفاق پھیلانے کے سوا کچھ نہیں۔

اگر ہم عہد بنو امیہ سے لیکر آج تک مسلمانوں کی تاریخ کا بہ نظر غور مطالعہ کریں اور اس بات کی پوری تحقیق کرنا چاہیں کہ مسلمانوں میں اتنے فرقے، گروہ، اور جماعتیں کیونکر بنی ہیں تو ہمیں اس کے سوا کچھ نہ مل سکے گا کہ ہمارے علماء حضرات اور برسر اقتدار طبقے آپس کی جزوی اور فروعی اختلافات کو اہمیت دیکر اتنا بڑھا دیتے تھے کہ خود وہ یا ان کے متبعین اس اختلاف کی بناء پر علیحدہ جماعت بنانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اور اس طرح ہر جزوی مخالفت پر جماعت سازیاں اور گروہ بندیاں عمل میں آجاتی تھیں۔ جو چھوٹی چھوٹی مخالفتوں کی بناء پر ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتی تھیں۔ نتیجہ یہی

تھوڑا جو ہوتا تھا کہ ملت اسلامیہ میں انتشار پھیلانا ۔ ہر مخالف
کے لئے آسان ہو گیا ۔ وہ جب چاہتا دو گروہوں یا دو جماعتوں
کے درمیان غلط افواہیں پھیلا پھیلا کر انہیں ایک دوسرے سے
بھڑا دیتا ۔ اور یہی کچھ آج ہمارے ساتھ ہمارے دشمن کر رہے
ہیں ۔ ہمارے دشمنوں کے ایجنٹ اگر مسلمانوں کے ہر منصوبے
اور ہر سکیم کو ناکام بنانے میں کامیاب ہیں تو اس کی اصل وجہ یہی
ہے کہ مسلمانوں نے حزب مخالف کو اپنے ہاں پناہ دی ہے اور لبی ۔

موجودہ جمہوریت اور آزادیٔ رائے

موجودہ جمہوریت میں ہر شخص کو یہ
حق دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی مرضی اور اپنے خیال کے مطابق حکومت
یا کسی مذہب اور جماعت پر اگر کسی قسم کی تنقید کرنا چاہے تو کر
سکتا ہے ۔ یا جب وہ چاہے تو کسی دینی ، دنیوی ، یا سیاسی مسئلے پر
کسی اخبار یا رسالے کے ذریعے یا تقریر و تحریر کے یا کسی اور ذریعے
سے تنقید کر سکتا ہے ۔

یہ بات بظاہر بہت اچھی نظر آتی ہے کیونکہ آزادانہ تنقید
سے لوگوں پر مسائل کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو سکتی ہے ۔
حق و باطل کا جلد پتہ لگ سکتا ہے ۔ مگر اس میں جس نقصان کا اندیشہ
ہے وہ اس کے نفع سے کہیں زیادہ ہے ۔ جب ایک شخص کسی
مذہب ، جماعت ، گروہ یا فرد پر آزادانہ تنقید کرتا ہے تو

لازمی امر ہے کہ اس مذہب، جماعت، گروہ والے بھی اس کی تنقید کا جواب دیں۔ اور اس طرح جواب در جواب میں بسا اوقات حالہ تنقید کی بجائے تنقیص تک پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر ایک دوسرے پہ کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔ اور جب یہ سلسلہ کھینچا تانی کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو فطرتی طور پہ ہر شخص اس میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے۔ اور بات خواص سے عوام تک پہنچ جاتی ہے۔ عوام کی مثال تو " العوام کالانعام " کی ہے۔ لہٰذا ان کے جذبات جلد ابھر آتے ہیں اور پھر وہ ایک دوسرے پہ زیادتیاں کر لیتے ہیں۔ جس کے باعث کچھ تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور اسی طرح عوام دو گروہوں میں تقسیم ہو کر کچھ ایک طرف ہو جاتے ہیں کچھ دوسری طرف، ادھر علماء حضرات اور لیڈر صاحبان کو منبروں اور ممبروں پہ آنے کا موقع مل جاتا ہے۔ بس پھر کیا ہے اپنی اپنی سٹیجوں سے ایک دوسرے پہ لعن طعن کرنا شروع کر دیتے ہیں اُدھر نفاق پھیلانے والے اور دشمنوں کے ایجنٹ غلط افواہوں کی بھرمار شروع کر دیتے ہیں۔ اور اگر خدا ناخواستہ یہ ناخوشگوار صورت ذرا لمبی مدت تک قائم رہ جائے، یا اختلافات زیادہ بڑھ جائیں۔ تو یہ گروہ بندی، اور دھڑہ بندی پھر منتج ہو جاتی ہے اور پھر یہ عداوت پشت در پشت چلی جاتی ہے۔ اگر یہ تنقید و تنقیص کہیں مذہبی شکل اختیار کر جائے پھر تو اس کے لیے علیحدہ

عقائد بھی مرتب کئے جاتے ہیں اور پھر فرقوں کے درمیان مذہبی تفریق واقع ہو جاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ آپس میں خانہ جنگی اور تباہی ہے

اسلام اس قسم کی تقلید و تنقیص کی اجازت نہیں دیتا۔

بلکہ اسلام نے تو اس کا آسان علاج یوں بتلایا ہے :۔

"فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ"

(پس اہل ذکر سے دریافت کرو۔ اگر تمہیں علم نہ ہو) یعنی کہ تمہیں کسی مسئلہ کے متعلق معلومات حاصل نہ ہوں۔ تو تم ان لوگوں سے دریافت کرو جو اسے جانتے ہیں۔ اہل الذکر کا لفظ قابل غور ہے۔ ("ذکر" سے مراد "یاد" ہے) یعنی اس مسئلے کی یادداشت رکھنے والا، جاننے والا، معلومات رکھنے والا۔ مثلاً اگر ہم تصوف کے متعلق معلومات کرنا چاہیں تو ہمیں پیران عظام کی طرف توجہ کرنی چاہئے، اگر ہمیں تفسیر کی معلومات حاصل کرنی ہوں تو لازم ہے کہ ہم کسی مفسر کی طرف رجوع کریں۔ اگر ہمیں احادیث کے متعلق معلومات حاصل کرنی ہوں تو تو باید کہ کسی محدث سے دریافت کریں۔ اسی طرح اگر ہمیں فقہ کے متعلق کچھ پوچھنا ہو تو ہمیں چاہئے کہ ہم کسی فقیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا مسئلہ حل کرائیں۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جب ہم بیمار ہوتے ہیں تو ہم ڈاکٹروں سے مشورہ کرتے ہیں۔ اگر عدالت میں ہمارا کوئی مقدمہ ہو تو ہم وکیلوں سے مشورہ کرتے ہیں۔

غرض جس طرح ہم دنیوی معاملات یا مسائل میں ان لوگوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں جن کو ان معاملات یا مسائل کا علم حاصل ہو۔ اسی طرح دینی مسائل میں بھی ہمیں ان لوگوں سے استفسار کرنا چاہیے جو ان کا علم رکھتے ہوں۔ ایسے ہی لوگوں کو قرآن مجید نے "اہل الذکر" فرمایا ہے۔

لیکن آج کل تو مسلمانوں نے مسائل حل کرنے کے عجیب طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ جس کسی کو کوئی مسئلہ پوچھنا ہو وہ اخبار میں "مراسلات" کے کالم میں دے دیتا ہے۔ اس کے بعد ہر کس و ناکس اپنی رائے اور فیصلہ دیتا ہے۔ پھر یہ سلسلہ جواب در جواب اور بحث در بحث میں تبدیل ہو جاتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ لکھنے والے ایک دوسرے کے خلاف ایسے ناشائستہ الفاظ استعمال کر لیتے ہیں کہ شریف پڑھنے والے اس کے پڑھنے سے شرما جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ایک طرف تو وہ مسائل حل ہونے کے بجائے پیچیدہ بن جاتے ہیں اور دوسری طرف لکھنے والے اخلاق و شرافت کی حد سے گذر کر رذالت پر اتر آتے ہیں اور اس طرح انجان لوگوں کے نزدیک قوم کے اخلاق کا دیوالہ نکل جاتا ہے۔ پھر آج کل ان اخبارات کے کالموں میں عورتوں کے مسائل اور مردوں کے مسائل یا دیگر مذہبی مباحثوں کی پیچیدگیوں کی وجہ صرف یہی ہے کہ لوگ "اہل الذکر" سے

تو یہ حضرات بھی ہاتھ کھڑا کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح اکثر ایسی تجاویز بھی پاس ہو جاتی ہیں جن میں چند لوگوں کے ذاتی مفاد کے سوا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

شخصی ذمہ داری کے ختم ہو جانے کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ آج اسمبلی میں ایک پارٹی کی اکثریت ہے لہذا وزارت کے منصب اس پارٹی کے افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور ابھی چند مہینے گذرنے نہیں پاتے کہ دوسری پارٹی کے افراد وزارتوں کے منصوبوں پر فائز ہو جاتے ہیں۔ اور پہلے وزیروں نے جو منصوبے بنائے تھے یا جو تعمیری کام ان کے زیر غور تھے وہ دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ یا انھوں نے قوم اور ملک کو جو نقصان پہنچایا تھا اس کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ نئے وزیر آئے نئے عہد و پیمان ہو رہے ہیں بلند بانگ دعوے کئے جاتے ہیں۔ عوام کے سامنے بڑی بڑی دل خوش کن اسکیمیں پیش کی جاتی ہیں۔ مگر چند ماہ کے بعد سنتے ہیں کہ اس پارٹی کی وزارت ٹوٹ گئی یا اسمبلی ہی ٹوٹ گئی نئے وزراء مقرر ہو گئے نئے گورنر آ گئے۔ نئی پارٹی برسر اقتدار آ گئی۔ وغیرہ وغیرہ

غرض اس طرح غریب عوام بیچارے سالہا سال تک غربت و افلاس اور کشمکش اقتدار کی چکی میں پستے رہتے ہیں وزارتیں ٹوٹتی اور بنتی رہتی ہیں لیکن شخصی ذمہ داری کسی پر عائد

نہیں ہوتی۔ سب کے سب آزاد اور بری الذمہ ہیں۔

موجودہ جمہوریت اور وزارت

موجودہ جمہوریت میں اسمبلی کی ممبری یا وزارت کے لئے کوئی معیار مقرر نہیں۔ کوئی دکاندار، زمیندار، کارخانہ دار جاگیردار اور سرمایہ دار جو اپنے پیسوں سے ووٹ خرید سکے اسمبلی کا ممبر بن سکتا ہے۔

کئی بار مشاہدے میں آیا ہے کہ بسا اوقات اکثر ایسے لوگ بھی اسمبلی کے ممبر بن جاتے ہیں جو سیاسی شعور سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ بعض تعلیمی لحاظ سے اتنے پست ہوتے ہیں کہ اپنے دستخط ہی بمشکل کر سکتے ہیں۔ بلکہ ان میں اکثر ایسے لوگ آجاتے ہیں جن کے باپ دادے سیاست کی "الف ب" سے واقف نہیں ہوتے۔ مگر بیٹے کہیں سے کچھ پیسے مار کر سرمایہ دار بن گئے یا کچھ انگریزی پڑھنا سیکھ گئے۔ اور بس وزارت کے قابل ہو گئے۔ موجودہ جمہوریت کے اصول کے مطابق ایسے دو ٹکے افراد خود عوام الناس کی رایوں سے حکمرانی کے لئے منتخب ہو جاتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ ایسے کئی لوگ مٹی سے اٹھا کر تخت پر بٹھا دئے جاتے ہیں جو حکمرانی کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ بس ایسے لوگ اپنے پیشے اور خاندان کے تنگ خیالات، رشک، حسد، اور کینہ پروری کو ہی لیکر

حکومت کی کرسیوں پر براجمان ہو جاتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ دوسروں کو فیض پہنچانا کسے کہتے ہیں سخاوت کیا شے ہے۔ دریادلی کس کو کہتے ہیں۔ یہ اگر کسی کے ساتھ کوئی نیکی بھی کریں گے تو پہلے اس کے عوض پر نظر ڈالیں گے کہ اس کا مجھے کیا بدلہ ملے گا۔ جس سے مطلب ہو۔ یا کوئی اپنا مفاد پوشیدہ ہو اس سے تو مدد کریں گے اور جس سے مطلب نہ ہو اسے پاس بھی نہ پھٹکنے دیں گے اپنی برادری کے علاوہ باقی تمام قوموں سے عناد ہو گا۔ خدمت خلق اور انسانیت کی فلاح و بہبود کی بُو تک نہ ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ جمہوریت کے حکمرانوں میں نفس پرستی، شہوت رانی، کنبہ پروری اور ذاتی مفاد کے عناصر زیادہ ہوتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ کرسیوں اور عہدوں کے لئے اکثر لڑا کرتے ہیں یا اپنے مفاد کی خاطر قوم اور ملک کو تباہی کے گڑھے میں جھونک دیتے ہیں۔

موجودہ جمہوریت میں حکمرانی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ کوئی شخص وکالت کا ماہر ہو۔ یا وہ تقریر کر سکتا ہو۔ بس ایسے لوگ تو اسمبلی میں پہنچتے ہی وزارت کے عہدوں کو آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ وہاں اس بات کا کوئی لحاظ نہیں کہ آیا یہ شخص جس کو یہ عہدہ دیا جا رہا ہے یا جسے یہ منصب سونپا جا رہا ہے اس کا اہل بھی ہے یا نہیں؟ مثلاً ایک وکیل صاحب کو وزیر دفاع

مقرر کیا جاتا ہے اور اس بات کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا، کہ ایک سویلین جس نے کبھی میدانِ جنگ تو اپنی زندگی میں دیکھا ہی نہیں۔ رائفل تک چلانے سے واقف نہیں، بھلا یہ وزارتِ دفاع کا کام کیسے انجام دے سکیگا؟ ملک کا دفاع کیونکر کر سکیگا؟ اور دفاعی کاموں میں کیا روح بھر سکے گا؟ اسی طرح اگر ایک جاگیردار، خانصاحب، یا سردار صاحب کو وزیرِ صحت مقرر کیا جائے تو وہ ڈاکٹری کے شعبوں کو کیسے ترقی دے سکے گا؟ اور کیا نئی نئی سکیمیں بنا سکے گا؟ یا اگر ایک نواب صاحب کو وزیر تجارت مقرر کیا جائے تو وہ اقتصادی بہبودی کے لئے کیا خدمت انجام دے سکیگا؟ اگر ایک زمیندار کو وزیر مواصلات مقرر کیا جائے تو وہ مواصلات کے شعبے کو کیا فروغ دے سکیگا؟ یا ایک ایسا شخص جس کا اپنا معیار تعلیم انگلش نہ ہو اور تنظیم مدارس کی ابجد سے بھی ناواقف ہو، اس کے ساتھ ساتھ تعمیر ملت کے بجائے تخریبِ ملت کا ماہر ہو۔ کیا اس کا وزیر تعلیم مقرر کیا جانا کسی لحاظ سے شعبۂ تعلیم کے لئے مفید ہو سکتا ہے؟

مگر افسوس! کہ موجودہ دور میں کابینہ سازی کا کوئی معیار مقرر نہیں بس جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ جس پارٹی کی اکثریت ہو اسی کی کابینہ یعنی حکومت ہوگی وہی وزارت کی کرسیوں کو آپس میں تقسیم کرے گی اور اس بات کا کوئی لحاظ نہیں رکھا

جائیگا کہ آیا یہ وزیر حضرات ان عہدوں اور منصبوں کے اہل بھی ہیں یا نہیں ؟

موجودہ دور کی اسمبلی پارلیمنٹ زیادہ تر ایسے اصحاب پر مشتمل ہوتی ہے جو علم فطرت اور علم شریعت سے نابلد اور اعلیٰ سیاسی شعور اور اعلیٰ اخلاقی اقدار سے خالی ہوتے ہیں۔ یہ سادہ لوح عوام کے ووٹوں سے بنائی جاتی ہے اور اسے محض دل خوش کرنے کے لئے جمہوری اسمبلی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ تاکہ عوام یہ سمجھتے رہیں کہ حکومت تو ان کی اپنی ہے۔

اگر آپ اسلامی جمہوریت کے اصول کا بغور مطالعہ کر لیں جس میں تمام فیصلے شوریٰ سے طے کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور پھر ان لوگوں کی عقلی، علمی اور اخلاقی حیثیت کی بھی پوری تفتیش کر لیں۔ جو نمائندگان قوم کہلاتے ہیں اور جنکے ہاتھ میں قانون ساز اداروں کی باگ ڈور دی جاتی ہے۔ تو ان اداروں کے چلانے والوں کی قلعی آپ پر بہت جلد کھل جائے گی اور آپ کو موجودہ قسم کی مغربی پارلیمنٹری نظام کی حقیقت بھی بخوبی معلوم ہو جائے گی۔ آپ کا ضمیر اندر سے خود بخود پکار اٹھیگا کہ موجودہ مغربی جمہوریت اور اس کا پارلیمنٹری نظام قطعاً غلط ہے اس کا اسلامی نظام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اسلامی نظام میں عوام کی نمائندگی کا جائز حقدار صرف خلیفہ

ہے۔ وزراء کا عوام کی نمائندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وزیروں کا عوام کی اسمبلی سے چنے جانے کا کوئی اسلامی حکم موجود ہے۔ تاریخ اسلام اور قرآنی احکام میں کوئی ایسی سند نہیں ملتی کہ جس سے ظاہر ہو۔ کہ اسلامی مملکت میں وزراء عوام کے ووٹوں سے چنے گئے ہوں۔

دراصل وزیر کے معنی ہیں بوجھ ہلکا کرنے والا۔ پس خلیفہ کو اپنی مدد کے لئے ایسے لوگوں کی ایک شوریٰ (یا پارلیمنٹ) بنانے کا حق حاصل ہے۔ جو حکومت کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹا سکے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ حکومت کے کاموں میں خلیفہ کا بوجھ وہی لوگ ہلکا کر سکتے ہیں جو حکومت کے کاموں سے واقف ہوں اگر ہم کسی زمیندار، جاگیردار، کارخانہ دار، دکاندار یا دنیا دار (جو عوام کے ووٹ اپنی دولت کے زور پر خرید کر اسمبلی تک پہنچا ہو) کو حکومت کے کاموں سے واقف سمجھیں تو یہ ہماری سب سے بڑی غلطی ہے۔

لہٰذا میرے نزدیک وزارت ان لوگوں کو ملنی چاہیئے جو اپنے اپنے شعبوں سے زینہ بہ زینہ ترقی کرتے آتے ہوں۔ مثلاً فوج کے شعبے میں سے وہ لوگ پارلیمنٹ میں لئے جائیں جو فوج کے اعلیٰ عہدوں پر رہ چکے ہوں اور یہی لوگ آگے جا کر وزیر دفاع اور وزیر جنگ بھی بنائے جائیں۔ محکمہ صحت کے شعبے

کے لئے اعلیٰ قسم کے ڈاکٹر اور سرجن لئے جائیں اور پھر انہی میں سے ایک قابل ترین فرد کو وزیر صحت بنایا جائے۔ تعلیم کے شعبہ کے لئے ایسے لوگ منتخب کئے جائیں جو تعلیم کے ماہر اور تعلیمی امور سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیم کا عملی تجربہ بھی رکھتے ہوں تعلیمی مسائل کو حل کرنا جانتے ہوں۔ مثلاً محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر یا کسی درسگاہ کے پرنسپل رہے ہوں۔ اسی طرح ہر شعبے کے لئے اُسی شعبے سے ہی ایسے قابل ترین افراد پارلیمنٹ میں لئے جائیں جو اپنے اپنے شعبوں میں مہارت رکھتے ہوں اور پھر انہی میں سے وزراء لئے جائیں۔ تاکہ وہ خلیفہ یا صدر مملکت کے لئے صحیح معنوں میں ممد و معاون ثابت ہو سکیں اور چونکہ ہر شعبے کے ممبر اپنے ہی محکمے کے متعلق بحث و تمحیص میں حصہ لے سکیں گے اور وہ تجاویز بھی اپنے ہی شعبے کے متعلق پیش کر سکیں گے لہذا وہ جو جو منصوبے تیار کریں گے وہ یقیناً ٹھوس اور کارآمد ہوں گے اور ملک اور قوم کی ترقی و بہبودی کا باعث ہوں گے ظاہر ہے کہ ایسے منصوبے سنجیدگی سے پیش ہوں گے اور سنجیدگی سے اس پر بحث ہو گی کسی سے جھگڑنے یا منہ چڑانے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ اور پھر جب یہ تجاویز خلیفہ کے سامنے پیش ہوں گی۔ تو خلیفہ یا امیر جس کو خدا اور رسولؐ کے بعد اسلام نے کلی اختیارات دیئے ہیں اور جو عوام کا واحد نمائندہ ہے وہ دیکھیگا۔ کہ اگر ان،

میں قوم کی فلاح و بہبود ہے تو اسے منظور کر لے گا۔ اور اگر اس کو اس میں کوئی ذاتی مفاد نظر آجائے۔ یا ملک اور قوم کے مفاد کے خلاف کوئی بات نظر آجائے تو بلا روک ٹوک اُسے رد کر سکے گا۔ اس طرح عوام کے حقوق کی پوری رکھوالی بھی ہو گی اور جمہوری طریقے سے ایک تجویز اور سکیم پر پوری طرح سے غور بھی ہو سکے گا۔

موجودہ جمہوریت اور کثرت آراء

موجودہ جمہوریت میں اکثریت کی رائے فیصل قطعی ہوتی ہے۔ یعنی اگر سو ایسے لوگ جو دوسروں کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہوں۔ انگوٹھا لگانے والے ان پڑھ ہوں، یا ضمیر فروش اور بزدل ہوں۔ اگر وہ ننانوے عقلمندوں، سیاستدانوں، اصحاب فکر و فراست، اور قوم و ملک کی فلاح و بہبود کے لئے صحیح سوچنے والوں کے خلاف ووٹ دے دیں، تو جمہوریت کے اصولوں کے مطابق احمقوں کی جیت ہو گی اور عقلمند و مدبر شکست کھا جاویں گے۔

علامہ اقبالؒ نے بار بار اعلان کیا کہ:۔

"جمہوریت کا پہلا اور خاص اصول یہ ہے کہ اکثریت اور فقط اکثریت کا حکم غالب رہے گا۔ یہ اصول اس سختی کے ساتھ عمل میں لایا جاتا ہے۔ کہ مثلاً اگر پانچ ہزار رائیں ایک طرف

اور چار ہزار نو سو ننانوے رائیں دوسری طرف ہیں تو بس پانچ ہزار رایوں والی پارٹی کو حق حاصل ہوگا کہ دوسری پارٹی کو اپنا محکوم بنالے اور باوجود اس کے مساوات کا دعویٰ بھی ہے۔ ؏

چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد"

قرآن مجید اس کی طرف یوں اشارہ فرماتا ہے:۔

اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِىْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ

(پ ۲۳ سورہ ص ع ۲)

ترجمہ:۔"ان کی اکثریت اپنے میں سے بعض کے اوپر ظلم اور زیادتی کرتی ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور نیک اعمال کئے اور وہ بہت کم ہیں۔"

چونکہ دنیا میں یہ قاعدہ رہا ہے کہ مومنین کفار کے مقابلے میں کم ہوتے ہیں یا نیک لوگ بروں کے مقابلے میں کم تعداد میں ہوتے ہیں۔ لہذا قرآن نے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے صاف فرمادیا۔ بلکہ ان کی وساطت سے ہر داعیٔ حق مومن اور ہر قاری کو فرمادیا کہ:۔

"وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ (پ ۸ سورہ الانعام ع ۱۴)

ترجمہ:- اے رسولؐ! اگر آپ اکثریت کی اطاعت کریں گے (یعنی کثرت رائے کو مانیں گے اور اصلیت پہ غور نہ کریں گے) وہ تو آپ کو خدا کی راہ سے گمراہ کر دیں گے وہ لوگ تو اپنے ظن و قیاس کی پیروی کرتے ہیں اور یہ تو فقط ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں۔

اسی طرح موجودہ اسمبلی کے ممبر بھی جس طرف کو زیادہ ہاتھ اٹھ گئے بس اسی کو صحیح سمجھتے ہیں چاہے اس کے نتائج تباہ کن ہی کیوں نہ ہوں۔ اور وہ اکثریت اپنے مفاد یا اپنے قیاس ہی کی پیروی کیوں نہ کرتی ہو۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ موجودہ جمہوریت کا اصول تو یہ ہے کہ اگر دو کے مقابلے میں ایک شخص دو اور دو چار کہے تو یہ غلط ہو سکتا ہے لیکن اگر پانچ آدمی دو اور دو پانچ کہیں تو یہ غلط نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے جمہوریت کی سند حاصل ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی مسئلہ کی صحت کے لئے یہی سند کافی ہے کہ اکثریت اس کے حق میں ہے۔ تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (نعوذ باللہ) خدا کا بیٹا یا خود خدا ماننے والوں کے مسلک کی تردید کیوں کی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ اکثریت میں ہیں؟ -

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے "وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" اور "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ" کا حکم تو دیا ہے مگر اکثریت

امیر کو اکثریت کی رائے پر مقدم کر دیا ہے۔ اور مسلمانوں کو یہ حکم دے دیا ہے کہ خدا اور رسولؐ کے حکم کے بعد تم اپنے امیر کی اطاعت کرو۔ اور امیر کو ہر مسئلے میں کلی اختیارات عطا کر دیئے ہیں کہ شوریٰ میں بات پیش کر دینے کے بعد امیر جس بات کو اختیار کرے وہی مقدم ہو گا اور ہر مسلمان پر اسی کی اطاعت لازم ہو گی، چاہے وہ فیصلہ اکثریت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ عوام کے سامنے صرف خلیفہ یا امیر ہی جواب دہ ہوتا ہے لہٰذا اسے لازماً وہ بات اختیار کرنی ہو گی جس میں عوام کا مفاد ہو گا۔

موجودہ جمہوریت اور انتخاب

موجودہ جمہوریت کے اصول کے مطابق ہر بالغ کو رائے دینے اور ہر شخص کو اپنا ووٹ آزادانہ طور پر استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک آزاد اقوام کے انتخاب اور ووٹ دینے کا تعلق ہے۔ وہاں تک یہ اصول عوام کی مفاد کے لئے بہت اچھا اور اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے۔ لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جہاں غلامانہ ذہنیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا تسلط ہو، وہاں ایسے اصول انتخاب سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ مغربی جمہوری دور کے گذشتہ انتخابات میں بارہا تجربتہً اور مشاہدۃً یہ دیکھا گیا ہے کہ تمام کارخانوں اور پبلک اداروں میں ملازموں،

مزدوروں، اور محنت کشوں پر اثر ڈالا جاتا ہے کہ وہ اپنے ووٹ اپنے مالکوں کی مرضی کے لئے استعمال کریں۔ آج کسی نوکر کو یہ جرأت نہیں کہ وہ اپنا ووٹ اپنے مالک کی مرضی کے خلاف استعمال کر سکے، کسی مزارع کو یہ طاقت نہیں کہ وہ زمیندار یا جاگیردار صاحب کی مرضی کے خلاف ووٹ دے سکے اور نہ ہی کسی غریب میں یہ ہمت ہے، کہ وہ سردار، نواب یا اپنے علاقے کے کسی سرمایہ دار کے خلاف اپنا ووٹ استعمال کر سکے، چاہے وہ زانی، شرابی، فاسق، فاجر، اور نااہل و نابکار ہی کیوں نہ ہو۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ کارخانہ دار، زمیندار، جاگیردار، سرمایہ دار خانصاحبان، سردار صاحبان اور نواب صاحبان، اپنے اپنے نوکروں، مزدوروں، محنت کشوں، اور غریبوں کا ووٹ ان کی آنکھوں کے سامنے اپنی مرضی کے مطابق ایک دوسرے پر فروخت کرتے اور سودا بازیاں کرتے ہیں اور ہر جائز و ناجائز طریقوں سے غریبوں کا ووٹ حاصل کر کے برسراقتدار آجاتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ آج دنیا کے سامنے ہے کہ غریب اور متوسط درجے کے لوگ تو علمی، اخلاقی اور سیاسی صلاحیت اور اہلیت رکھنے کے باوجود قوم کی نمائندگی سے محروم ہیں۔ لیکن سرمایہ دار زانی، شرابی، فاسق، فاجر، نااہل و نابکار ہونے کے باوجود برسر اقتدار ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آج ہم بھی اپنے آپ کو آزاد اقوام میں شمار کرتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہم میں سو سالہ غلامی کا اثر اور سرمایہ دارانہ نظام کا تسلط ابھی تک باقی ہے۔ ہمارے مزدور، محنت کش اور غریب عوام میں ابھی تک وہ اخلاقی جرأت پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ کہ وہ اپنے ووٹ کو اپنی مرضی کے مطابق آزادانہ طور پر استعمال کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم گزشتہ دس سال میں بھی صالح قیادت کو برسراقتدار نہ لا سکے ہیں۔ اور نہ ہی خود غرض، نفس پرست، شہوت زدہ، زانی، شرابی، فاسق، فاجر، مفاد پرست اور کرسی کی خاطر قوم اور ملک کو غیروں کے ہاتھ فروخت کر دینے والے غدار لوگوں سے نجات حاصل کر سکے ہیں۔

آج ہم یہ کہتے کہ ہماری حکومت عوامی حکومت ہے، ہماری اسمبلی قومی اسمبلی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ ہماری اسمبلیوں میں غریبوں کے نمائندے موجود ہیں اور نہ ہی ہماری پارلیمنٹ میں کوئی غریب شخص غریبوں کے مفاد کے کسی عہدے پر فائز ہے، اور کمال عیاری تو یہ ہے کہ ہر نمائندہ اپنے آپ کو عوام کا نمائندہ تصور کرتا ہے چاہے وہ سیاسی مکاری، غنڈہ گردی اور روپے پیسے کے بل بوتے پر غریبوں کا ووٹ خرید خرید کر ہی ممبر کیوں نہ بن گیا ہو۔

یہ تو عرض کیا جا ہی چکا ہے کہ ہمارے انتخابات میں علمی، اخلاقی

اور سیاسی صلاحیت کے لئے تو کوئی معیار ہی نہیں۔ نیز ہمارے ہاں علم سے مراد ایم اے، بی اے، ایف اے یا میٹرک تک تعلیم ہے یعنی انگریزی بول چال سے واقف ہونا علم ہے اور بس۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری اسمبلی میں جو لوگ وکالت کے ماہر ہوں یا ایم اے، بی اے ہوں وہ وزارت کے ہر شعبے کے لئے موزوں سمجھے جاتے ہیں۔ اور اس بات کا کوئی لحاظ نہیں، کہ وزارت صحت کے لئے ڈاکٹری تعلیم وزارت دفاع کے لئے فوجی تعلیم بھی ضروری ہے اور اسی طرح ہر محکمے کے لئے اس شعبے کے ماہرین کی ضرورت ہے۔

سیاسی شعور۔ آج کل کی اصطلاح میں سیاست سے مراد، جھوٹ، فریب، دھوکہ دہی، دغا بازی (جسے سیاسی قلابازی بھی کہا جاتا ہے) میں مہارت حاصل کرنا ہے۔ موجودہ سیاست میں تو قومی خدمت، قوم کی فلاح و بہبود کی صلاحیت، ملک و ملت اور دین سے محبت، اخوت و مساوات کا جذبہ رکھنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی۔ جو لوگ سیاسی چالوں یعنی غنڈہ گردی، دھوکہ، فریب، مکاری اور عیاری سے سیاسی طور برسر اقتدار آجائیں۔ بس وہ سیاست دان سمجھے جاتے ہیں۔

اخلاقی معیار:۔ اخلاق کے تو کیا کہنے۔ جو لوگ خدا اور رسول ؐ کے نافرمان ہوں۔ جو نوجوان دوشیزاؤں کو اپنے ہاں ملازم رکھ سکیں؛ اور پھر انہیں بڑے بڑے لوگوں کی خدمت...

میں پیش کر سکیں۔ جو کاکٹیل پارٹیاں دے سکیں۔ جو کلبوں اور ناچ گھروں میں اپنی بہو، بیٹیوں اور بیویوں کو لے جا سکیں۔ بس وہی لوگ عزت وحشمت کے مالک ہیں۔ انہی کا سونا اور انہی کی چاندی ہے۔ وہی بڑی بڑی الاٹمنٹوں، کارخانوں اور جاگیروں کے مالک ہیں۔ وہی بڑے بڑے عہدوں پر فائز کئے جا سکتے ہیں اور اگر برسر اقتدار طبقہ میں اتفاق سے کوئی فرد ایسا پیدا ہو جائے جو ان تمام بدمعاشیوں کا مخالف خدا اور رسولؐ کا فرمانبردار، قوم اور ملک کا وفادار، سچائی اور صداقت کا پرستار اور متاع اخلاق کا مالک ہو تو اس کا حشر یہ ہوتا ہے۔ کہ باوجود تمام اہلیتوں کے بیک بینی و دوگوش وزارت کے منصب سے علیحدہ کئے جانے پر مجبور کیا جاویگا[1]۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ قصور برسر اقتدار طبقے کا ہے۔ بلکہ میرے نزدیک یہ قصور اول تو ہمارے غلط طریقۂ انتخاب کا ہے۔ کہ جس میں کوئی علمی، اخلاقی، اور سیاسی معیار مقرر نہیں۔ اور دوم ہمارے عوام کا ہے۔ کہ جو چند ٹکوں کی خاطر اپنے ووٹ غیر صالح لوگوں کو دے دیتے ہیں۔ جب ہم اپنے ووٹ کو صحیح طریقہ پر

---

[1] جیسا کہ چوہدری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان کو وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا۔

استعمال ہی نہیں کرتے۔ جب ہم ووٹ دیتے وقت علمی، اخلاقی، اور سیاسی صلاحیت کا کوئی لحاظ ہی نہیں رکھتے تو غلط لوگوں کا ہمارے اوپر حکمران بن جانا بھی اٹل ہے۔ اسلام نے ہمیں اپنے ووٹ کو غلط استعمال سے روکنے کی جو تعلیم دی ہے۔ شہادت حسین علیہ السلام (فداہ ابی وامی ونفسی واہلی وملی) اس کا عملی نمونہ ہے۔ انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے جان دے دی مگر غلط آدمی کی بیعت نہیں کی۔

حقیقت یہ ہے کہ انتخاب کے بارے میں حضرت حسین علیہ السلام اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے ان کا عمل ہمارے لئے اسوہ حسنہ ہے۔ ان کے عمل سے ووٹ دینے والوں کو یہ سبق ملتا ہے کہ ووٹ دیتے وقت ان کا اور ان کے ساتھیوں کا یہ کردار اپنے سامنے رکھو! کہ ؎

سر داد نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ ہست حسین

شہادت حسین علیہ السلام کا لب لباب یہی ہے کہ نہ صرف دس لاکھ دینار سالانہ وظیفے کی پیش کش ٹھکرائی جاتی ہے۔ بلکہ اپنی جان اور اپنے ننھے اور معصوم بچوں تک کی قربانی محض اس لئے دی جاتی ہے کہ اگر زانی، شرابی، فاسق و فاجر کے ہاتھ پر بیعت کی گئی تو آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے بیعت کرتے وقت

(یعنی ووٹ دیتے وقت) اسلام کا بتلایا ہوا معیار باقی نہ رہ سکے گا۔ اور یہی مقصد تھا جس کو حسین علیہ السلام نے اپنے آخری خطبے میں واضح فرمایا ہے کہ:۔ "یزید کی بیعت تو ناممکن ہے۔ جس نے مسلمانوں کے لئے صبر و استقلال، استقامت و ایثار اور خودداری کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اور میں تمہیں اعلانیہ کہتا ہوں کہ تمہاری یہ توقعات پوری نہ ہو سکیں گی اور دنیا بہت جلد تمہیں اپنا کو سمجھ دکھا دے گی۔ خدا اس دن کے لئے مجھے زندہ نہ رکھے کہ میں چند روزہ زندگی کی خاطر ایک فاسق فاجر کی بیعت کر لوں[1] اور بنو فاطمہ کے دامن پر سیاہ داغ لگا دوں خداوند قدوس کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایک باضمیر انسان بنایا۔ مجھے خطرہ تھا کہ میرا ضمیر کہیں میرے معصوم بچوں کی محبت اور پدری شفقت کی بناء پر دھوکہ نہ دے دے۔ لیکن یہ اس پاک ماں کے پاک دودھ کا اثر تھا کہ جھوٹی توقعات اور فانی ضروریات حقیقت کے سامنے مغلوب ہو گئیں اور اب میں خداوند تعالیٰ کے حضور میں سرخروئی کے ساتھ جا رہا ہوں"

(از حسین ابن علیؑ)

---

[1] بعض روایات سے ثابت ہے کہ حسین علیہ السلام کو دس لاکھ دینار سالانہ وظیفہ کی پیش کش بھی کی گئی تھی کہ اگر وہ یزید کی بیعت کر لیں تو انہیں یہ وظیفہ دیا جائے گا۔ (افغانی)

لیکن افسوس! کہ آج مسلمانوں نے حضرت حسین علیہ السلام کی اصل تعلیم کو بھلا دیا ہے وہ محرم الحرام کے دس دنوں میں ماتم تو خوب کرتے ہیں، مگر وہ ہر وقت حسین علیہ السلام کی اتنی عظیم الشان قربانی کو بھلا دیتے ہیں۔ کیا ان ماتم کرنے والوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ حسین علیہ السلام جیسے جلیل القدر انسان نے اتنی عظیم الشان قربانی محض اس لئے دی تھی کہ ان کی شہادت کے بعد لوگ بیٹھ کر ان کی مرثیہ خوانی کرتے رہیں؟ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ حسین علیہ السلام کی قربانی کا منشاء یہ تھا کہ ان کے پیچھے ان کا ماتم کیا جائے یا ان کے پیچھے رویا پیٹا جائے تو میرے نزدیک وہ بہت بڑی غلطی میں پڑا ہوا ہے۔ ماتم کرنے سے تو شہادت حسینؑ کا صرف ایک ہی پہلو دنیا کے سامنے عیاں ہوگا اور وہ یہ کہ حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھی مظلوم تھے اور یزیدی لشکر نے ان پر بہت بڑا ظلم کیا۔ [لہ]

[لہ] دراصل تذکرۂ حسینؑ کی بجائے ماتم حسینؑ کا رواج پا جانا ہی شہادت حسینؑ کے اصل مقصد پر پردہ پڑ جانے کا موجب ہے۔ جب محرم کے دس دنوں میں حسین علیہ السلام کی شہادت کے متعلق مجالس منعقد کی جاتی ہیں، تو لوگ جوق در جوق ان مجالس میں حصہ لیتے ہیں۔ مگر وہاں ان کو اس کے سوا کچھ نہیں ملتا کہ حسین علیہ السلام اور ان کے (باقی حاشیہ صفحہ ۲۸۷ پر)

(بقیہ حاشیہ صہ ۲۸۹)

ساتھیوں پر کون کون سے مظالم ڈھائے گئے اور کس طرح سے ان کو بھوکا پیاسا رکھا گیا اور ان کے ننھے ننھے اور معصوم بچوں کو کس طرح تیروں کا نشانہ بنایا گیا۔ یا شہیدان کربلا کی لاشوں کو گھوڑوں کے ٹاپوں تلے کس ظلم و استبداد سے روندا گیا۔ یا عصمت و پردہ دار بیبیوں کا جلوس کس بے دردی اور رسوائی سے نکالا گیا۔ جگر گوشہ رسول کا سر مبارک کس طرح نیزوں پر اچھالا گیا۔ اسی طرح کے قصے خاص انداز میں پورے درد کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ جس کا فطری نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ لوگ زار و قطار روتے ہیں۔ سر اور سینے پیٹتے ہیں واویلا مچاتے ہیں، مرد، عورتیں اور بچے سب کے سب ماتم کرتے ہیں غم و غصہ سے گریبان پھاڑتے ہیں اپنے آپ کو زنجیروں سے لہولہان کر دیتے ہیں اور بس۔

اور اسی طرح سے متواتر دس دن اور رات تمام لوگوں پر غم و غصہ کا عالم چھایا ہوا ہوتا ہے۔ مگر اس حقیقت کی طرف کوئی نہیں جاتا کہ آخر یہ شہادت کیوں وجود میں آئی۔ اس کی اصل غرض و غایت کیا تھی۔

یہی وجہ ہے کہ بعض تاریخ دان یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ کبھی جب حضرت حسین علیہ السلام نے یزید کی حکومت کے خلاف خروج اس لئے کیا تھا کہ ان کو حکومت مل جائے اور اسی لئے تو وہ کوفہ والوں کے پاس بیعت لینے جا رہے تھے تو یزید کو ایک بادشاہ کی حیثیت سے ان کی مدافعت تو کرنی ہی چاہیئے تھی۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ جب ایک بادشاہ

(باقی حاشیہ صہ ۲۹۱ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۰)

کے خلاف کوئی شخص ایسی حرکت کرے کہ اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے لوگوں سے اپنے حق میں بیعت لینا شروع کر دے تو اس بادشاہ کو اس شخص کے خلاف سخت سے سخت کاروائی کیوں نہ کرنی چاہیئے؟ خود حضرت علی علیہ السلام کے خلاف جب حضرت زبیر، حضرت طلحہ و حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہم نے خروج کیا تھا تو کیا حضرت علی علیہ السلام نے ان سے جمل کے میدان میں جنگ نہ کی تھی؟ اور پھر جب امیر معاویہؓ نے اپنے لئے بیعت لینا شروع کی تو کیا حضرت علی علیہ السلام نے ان کے خلاف علم جہاد بلند نہ کر دیا تھا؟ گو حضرت علی علیہ السلام اور یزید کی شخصیتوں میں عرش اور فرش کا سا فرق ہے۔ لیکن اس سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یزید بھی مسلمانوں کا ہی حکمران تھا۔ پھر آخر بات یہیں آ جاتی ہے کہ واقعی یزید کو جگر گوشۂ رسولؐ اور اہل بیت اطہار پر اتنا ظلم نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ یہ کہہ کر یزید کی نسبت یہی ثابت کرتے ہیں کہ یزید نے تو حسینؓ کو شہید کر نے یا ان پر اتنے مظالم ڈھانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ یہ تو ابن زیاد اور شمر وغیرہ ظالم تھے جنہوں نے ظلم کی حد کر دی تھی وغیرہ وغیرہ۔

آخر یہ سوالات کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ اسی لئے نا کہ لوگ جب تاریخ پڑھتے ہیں تو وہ دیکھتے ہیں کہ ماتم کی ابتداء تو ابو مسلم خراسانی سے ہوتی ہے جو کہا جاتا ہے کہ ایران پر خراسان گیا۔ اور وہاں منانا ہوا

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۹۲ پر)

(بقیہ حاشیہ صہ ۲۹۱)

کربلا کا جلوس نکال نکال کر ڈرامائی انداز میں خراسان کے لوگوں کو شہادت حسین کے واقعات سناتا رہا۔ اور اس طرح سے خراسان کے لوگوں میں بنوامیہ کی حکومت کے خلاف نفرت بھرتا گیا۔ جب یہ طریقہ ماتم خراسانیوں میں مقبول ہوا اور پھر پھیلتے پھیلتے ایران و عراق تک پہنچا اور جب ایران والوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تو عوام میں بنوامیہ کی حکومت کے خلاف نفرت کا ایک عظیم جذبہ بھر گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ عباسیوں نے عوام کے ان جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حبّ اہل بیت کا نعرہ بلند کیا اور بنوامیہ کی حکومت کے خلاف انقلاب برپا کر کے ان کی حکومت کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ گو عباسیوں نے بھی اپنے عہد حکومت میں بنو فاطمہ پر کم مظالم نہیں ڈھائے مگر محرم کے دس دنوں میں سیاہ لباس سے ملبوس ہو کر حسین علیہ السلام کا ماتم خوب مناتے رہے۔ حالانکہ مقصد ان کا بھی صرف یہ تھا کہ عوام کو ماتم حسین میں مبتلا کر کے شہادت حسین کے اصل مقصد سے بے خبر رکھا جائے۔ تاکہ ہماری مطلق العنان حکومت اور خود مختار ملوکیت میں کوئی خلل نہ آسکے یا ہمیں اپنا ولیعہد خود مقرر کرنے سے کوئی باز نہ رکھ سکے تاکہ اسی طرح حکومت پشت در پشت تک ہمارے خاندان میں چلتی جائے۔

غرضیکہ جب وہ ماتم کی اصل تاریخ سے واقف ہو جاتے ہیں اور انہیں یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ یہ محض ایک سیاسی حربہ تھا جو عباسیوں کی طرف سے کھیلا گیا تھا۔ پھر جب وہ قرآن مجید میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ:۔

(باقی حاشیہ صہ ۲۹۳ پر)

(بقیہ حاشیہ صـ ۲۹۲)

" وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۘ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ (پ ۴ آل عمران ع ۱۷)

ترجمہ :- " اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیے گئے ان پر مُردوں کا گمان نہ کرنا۔ یا ان کو مُردوں میں شمار نہ کرنا (یعنی مُردوں کی طرح ان کا ماتم نہ کرنا) بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے قرب میں انہیں رزق بھی ملتا ہے۔ وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے۔ ان کی یہ شہادت (یعنی حق پر اپنی جان تک کو قربان کر دینا) بشارت ہے ان لوگوں کے لئے جو ان کے پاس ابھی تک نہیں پہنچے اور ان سے پیچھے رہ گئے ہیں (یعنی وہ ان کو خوشخبری دیتے ہیں) کہ ان پر بھی کسی طرح کا خوف واقع ہونے والا نہیں اور نہ وہ مغموم ہوں گے اور وہ خوشخبری دیتے ہیں اس نعمت اور فضل خداوندی کی (جو ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی ہے) اور اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا اجر ضائع نہیں فرماتے۔"

چنانچہ وہ اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ واقعی جگر گوشۂ رسولؐ اور اہل بیتِ اطہار پر تو سارے ظلم ڈھائے گئے ہیں۔ مگر اب

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۹۴ پر)

حقیقت یہ ہے کہ امیر معاویہ نے اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے یزید کے لئے بیعت لینا شروع کردی تھی۔ یہ بات اسلامی خلافت کے اصول کے بالکل خلاف تھی اور اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ وہ ملوکیت یا بالفاظ دیگر وہ قیصریت و کسرایت جس کو ختم کرنے کے لئے انقلاب اسلام برپا کیا گیا تھا خود مسلمانوں میں اسلامی ملوکیت کے نام سے آجاتی۔ چنانچہ تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ پہلی صدی ہجری میں ہی سوسائٹی کے ہر طبقے میں حتیٰ کہ ملوکیت پرست علماء کی بڑی جماعت میں بھی خاندانی حکومت اور خلیفہ کو اپنی زندگی میں اپنے ولی عہد کے مقرر کرنے کا حق اس حد تک جڑ پکڑ چکا تھا کہ عمر بن عبدالعزیز اور مامون الرشید جیسے خلفاء نے اس رسم کو بدلنا بھی چاہا تو ان کو بری طرح ناکامی ہوئی۔ تاریخ افکار و سیاسیات کا مصنف اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ "ملوکیت کی یہ بنیادی رسم قائم ہوتے ہی اس کے تمام لوازمات و خصوصیات اسلام

(بقیہ حاشیہ ۲۹۳)

جبکہ نہ یزید باقی ہے نہ بنو امیہ کی حکومت۔ تو اس ماتم و واویلا سے کیا فائدہ؟ اب تو ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم شہادت حسینؑ سے کوئی سبق حاصل کرلیں اور قوم کو اس حقیقت سے آگاہ کرلیں کہ حسین علیہ السلام کی قربانی کا اصل مقصد کیا تھا۔

میں داخل ہو گئے اور جس بنیاد کو امیر معاویہ نے اپنے ہاتھوں سے پیوستہ قائم کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس پہ ملوکیت کی اتنی بڑی عمارت کھڑی ہو گئی کہ اس نے اسلام کے پورے نظام کو درہم برہم کر دیا۔ اور اس کا سب سے پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام اور خلیفہ میں براہ راست جو رابطہ قائم تھا ختم ہو گیا۔ خلیفہ نے خود کو بادشاہ اور حاکم اعلیٰ اور عوام کو اپنی رعایا اور محکوم سمجھنا شروع کر دیا۔ امیر معاویہ نے اپنی زندگی میں ضعیف العمری کا عذر کر کے عوام سے خود کو ممتاز کر کے تخت پہ بیٹھنا شروع کیا تھا۔ اور دارالخلافت میں اپنی ڈیوڑھی پہ حاجب مقرر کئے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہی نشست مقدس تخت شاہی بن گیا۔ جس پہ بیٹھے ہوئے بادشاہ کی زیارت زمین بوسی اور اس کے لئے سجدہ تعظیمی عین سعادت سمجھی جانے لگی۔ خلیفہ تک عوام بلکہ خواص کا پہنچنا ناممکن ہو گیا۔ خلیفہ کا دربار قیصر و کسریٰ کے درباروں سے بڑھ گیا۔ خلفاء کے رہنے کے محلات اور عمارتیں بلکہ ان کے دفن ہونے کے مقبرے اور قبرستان تک عجائب روزگار بن گئے۔ خلفاء کے ساتھ سلاطین، وزراء اور امراء کی عیش پسندیاں اور عشرت پرستیاں بھی کم نہ تھیں۔ ان سب کے محلات اور حرم سرا کنیزوں اور غلاموں سے پر رہنے لگے اور اس طرح سوسائٹی کا بڑا حصہ جو خود کو قومی ذمہ داریوں سے بری اور حکومت کو

خلیفہ کی ملک سمجھ چکا تھا۔ اب صرف ان کی تفریحات کے سامان مہیا کرنے میں مصروف ہو گیا...... خلیفہ اور سلطان کا حکم بجائے الٰہی قانون کے سمجھا جانے لگا۔ سلطان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون اور اس کے حکم کی اطاعت خدا کی اطاعت کے مرادف ہو گئی، لہٰذا ہر قرآنی احکام جاری تھے۔ لیکن چونکہ فقہا کی بڑی اکثریت ملوکیت کے استبداد سے مرعوب ہو کر اور کچھ مراعات خسروی سے پابہ زنجیر ہو کر سلطانی حقوق کی محافظ ہو چکی تھی اس لئے ایسے تمام قوانین کی تاویلیں گھڑی گئیں جن سے ملوکیت کے نظام پر زد پڑتی تھی۔ جن علماءِ حق اور داعیانِ اسلام نے صدائے حق بلند کی، اُن حکمرانوں نے انہی علماء کے فتاویٰ کی مدد سے ان پر مظالم و مصائب کے وہ پہاڑ توڑے کہ عوام بھی لرز اٹھے، سعید بن جبیرؒ، ابوذئبؒ اور امام احمد بن حنبلؒ سے لے کر امام ابن تیمیہؒ، مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہم کے زمانہ تک علماءِ حق اس طرح برابر ملوکیت و ملائیت کی سازش کا شکار بنتے رہے غرض حکومت و خلافت کو اپنے خاندان اور نسل میں محفوظ رکھنے کی خاطر تقریباً ہر خاندان نے ہر ملک میں دوسرے مسلم افراد کا جو کسی طرح بھی تخت و تاج کے لئے خطرہ بن سکتے تھے، جس قدر خون بہایا ہے وہ مسلم تاریخ کا نہایت الم ناک باب ہے۔ واقعہ کربلا سے لے کر سقوطِ خلافت تک جس قدر مثالیں بھی ظلم و استبداد کی مسلم

تاریخ میں ملتی ہیں وہ کم و بیش تمام ہی حکومت یا خلافت کو اپنے خاندان یا نسل میں محفوظ رکھنے کی غرض سے وابستہ ہیں۔"
(تاریخ افکار و سیاست اسلامی)

غرض یہ ہے کہ حسین علیہ السلام کو یزید کی بیعت کر لینے میں جو خطرہ درپیش تھا وہ یہ تھا کہ اگر یزید کو ولیعہد مقرر کرنے کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو نہ صرف خلافت ہی ملوکیت میں تبدیل ہو جائے گی بلکہ حکومت کو ایک خاندان یا نسل میں محفوظ رکھنے کی رسم کو بھی اسلام ہی کا جزو تصور کیا جائے گا۔ اور اگر یزید جیسے فاسق و فاجر شخص کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو صالح قیادت کو برسر اقتدار لانے کے لئے اسلام کا کوئی معیار باقی نہ رہ سکے گا۔ یہی وجہ تھی کہ آپؑ نے یزیدی لشکر سے فرمایا کہ "خدا اس ان کیلئے مجھے زندہ نہ رکھے کہ میں چند روزہ زندگی کی خاطر ایک فاسق و فاجر کی بیعت کر لوں اور بنو فاطمہ کے دامن پر سیاہ داغ لگا دوں۔"

غرض شہادتِ حسینؑ کا لب لباب یہ ہے کہ بیعت کرتے وقت (یعنی ووٹ دیتے وقت) حکومت کی کرسی کے لئے اپنا نمائندہ چنتے وقت، زانی، فاسق، فاجر اور نااہل شخص کی مکارانہ چالوں میں نہ آتے ہوئے حسین علیہ السلام کے نقش قدم پر چلا جائے۔ شاعر نے کیا خوب فرمایا ہے کہ ؎

غم شبیرؑ میں رونا ثواب ہے بیشک
مگر شبیرؑ کا کردار کیوں نہ اپنائیں
مجھے حسینؑ کے ماتم پر اعتراض نہیں!
اگر حسینؑ کے عاشق حسین بن جائیں

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج حسین بننا تو درکنار حسینؑ کا کوئی صحیح عاشق بھی نہیں ملتا۔ میرا ایمان ہے کہ اگر حسینؑ کا کوئی ایک بھی سر پھرا عاشق یا متوالا ہوتا۔ تو یزیدیت کے پرخچے اڑا کر رکھ دیتا۔ میں تو یہ کہونگا کہ آج تو حسین علیہ السلام کی شہادت کے اصل مقصد کو بیان کرنے والا بھی نہیں ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ حسین علیہ السلام کا ماتم کرنے والے تو کروڑوں ہیں مگر افسوس کہ ان محبان حسینؑ کی موجودگی میں یزیدیت کا بول بالا ہے آج چاروں طرف یزیدیت ہی یزیدیت پھیلی ہوئی ہے، گھر گھر میں یزیدیت کا پرچار ہے آج ہر زانی، شرابی، فاسق، فاجر حکمران یزید سے کئی گنا بڑھ چکا ہے۔ مگر فدایانِ حسین اور عاشقانِ حسین میں کوئی ایسا فرد نہیں جو ان یزیدی طاقتوں کے خلاف ایک آواز بھی بلند کر سکے۔ سے

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے

دراصل یہ ہمارے ووٹوں کے غلط استعمال کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ہم پر غلط لوگ حکمران ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر ایک دوسرے

برسر پیکار ہیں یہ آئے دن ہماری وزارتوں میں تبدیلیاں، ہماری اسمبلیوں میں دنگا فساد، ہمارے ہی ووٹوں کا اصل نتیجہ ہے۔
" ھی اعمالکم تردون علیکم " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی ہے کہ یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جا رہے ہیں۔ ع

" شامت اعمال ما صورت نادر گرفت "

آج ہمارے ہی حاکم ہمارے لئے عذاب بنے ہوئے ہیں یہ کیوں! اس لئے کہ ہم نے ووٹ دیتے وقت اس بات کا خیال نہ رکھا تھا کہ آیا جس شخص کو ہم ووٹ دے رہے ہیں وہ علمی اخلاقی، مذہبی اور سیاسی اعتبار سے کتنی استعداد کا مالک ہے ہمارے پاس صلاحیت کا کوئی معیار نہ تھا لہٰذا جیسے نمائندے ہم نے بھیجے تھے ویسے ہی حکمران ہم پر بن گئے۔

اس میں شک نہیں کہ ہماری اسمبلیوں اور وزارتوں میں کچھ مخلص لوگ بھی ہیں مگر وہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں اور ان بیچاروں کی کوئی بات نہیں سنی جاتی لہٰذا جب تک تمام مسلمان ووٹ دیتے وقت یا اپنا نمائندہ منتخب کرتے وقت حسین علیہ السلام کے اسوہ کو سامنے رکھ کر یہ زانی، شرابی، فاسق، فاجر، خود غرض، مفاد پرست اور نااہل نابکار ہے حسین علیہ السلام کی پیروی کرتے ہوئے صاف انکار نہ کر دیں گے اور اپنے ووٹ کو قوم کی امانت سمجھ کر اپنی جان اور مال سے عزیز نہ

رکھیگا۔ اور اسے صحیح طور پہ استعمال کرنے میں "لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ" یعنی کسی ملامت کی پرواہ نہ کرے گا۔ تب تک صالح قیادت کا برسراقتدار آنا محال بلکہ ناممکن ہے۔

غرض یہ ہے کہ موجودہ جمہوریت نے ایک طرف تو ہر کس و ناکس کو ووٹ دینے کا اختیار دے کر بڑے بڑے زمینداروں، جاگیرداروں کارخانہ داروں، سرمایہ داروں، نوابوں اور سرداروں کو یہ موقعہ دے دیا ہے کہ وہ غریبوں، مزدوروں، محنت کشوں کے ووٹ خرید خرید کر برسراقتدار آسکیں، اور دوسری طرف انتخابات میں کھڑے ہونے والے لوگوں کے لئے علمی، اخلاقی اور سیاسی معیار نہ رکھ کر ہر زانی شرابی، فاسق، فاجر، مفاد پرست، نفس پرست، جاہ پرست اور خود غرض کو یہ موقعہ دے دیا ہے کہ وہ الیکشن میں کھڑا ہو کر سادہ لوح عوام کا ووٹ بھی مکاری، عیاری، اور سیاسی، چالبازی سے حاصل کر کے قوم کو ذہنی اور اخلاقی طور پہ ضمیر فروش بنا کر ذلیل کر دے اور ایک ناپاک قیادت کے عذاب میں بھی مبتلا کر دے۔

کئی افراد کا بیک وقت انتخاب لڑنے کا طریقہ غلط ہے

اور تیسری بات جو موجودہ جمہوریت کے اصول انتخاب میں غلط ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر وہ علاقہ جس سے ایک ہی نمائندہ منتخب ہونا مقصود ہو کئی کئی افراد کو کھڑے ہونے کی اجازت

دی جاتی ہے۔ چنانچہ جب کبھی بھی ایک علاقہ سے کئی کئی افراد قسمت
آزمائی کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ تو ان حضرات نے اپنے مد مقابل کو
ذلیل و رسوا کرنے اور اپنے آپ کو مقبول عام بنانے کے لئے وہ
وہ حرکتیں کی ہیں اور اخلاق و شرافت کا دیوالیہ کچھ اس کمینگی سے
نکالا ہے کہ دنیا کے مہذب و سنجیدہ لوگ حیران و ششدر رہ گئے ہیں
اخبارات، رسالے، پمفلٹ، اشتہارات، پوسٹر اور ہینڈ بل کے
ذریعے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔ ایک دوسرے کے
باپ دادوں تک کی غلط کاریاں اور سیاہ کاریاں آشکارا کی جاتی
ہیں، بہتان و افترا باندھے جاتے ہیں۔ اخبارات میں کارٹون دے
دے کر ایک دوسرے کو رسوا کیا جاتا ہے۔ علیحدہ علیحدہ گروہ
اور پارٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ ضمیر فروش، بدمعاش اور غنڈے لوگوں
کو خریدا جاتا ہے۔ توہین آمیز و مردہ باد کے نعرے ایک، دوسرے
کے خلاف لگائے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے پر پتھراؤ کرنے اور
لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور بسا اوقات تو انتخابات
کی یہ چند روزہ مخالفت ابدی دشمنی، بدی، اور ناراضگی میں تبدیل
ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح سے ملت اسلامیہ کے اندر سے اتفاق
و اتحاد، اخوت و مساوات اور یکجہتی کو ختم کر کے مسلمانوں کو نسلی، لسانی
اور علاقائی تعصبات میں گرفتار کر دیا جاتا ہے۔

موجودہ اصول انتخاب کے مطابق کوئی نمائندہ اکثریت کا نمائندہ نہیں کہلایا جا سکتا!

علاوہ ازیں اس طریق انتخاب سے جو ایک بڑا نقصان واقع ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ ان میں کا کوئی نمائندہ بھی عوام کی اکثریت کا نمائندہ نہیں رہتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک علاقہ سے جس سے صرف ایک ہی نمائندہ منتخب ہونا مقصود ہو کئی کئی افراد کھڑے ہو جاتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اس علاقہ کے ووٹر بھی کئی کئی افراد پر تقسیم ہو کر اقلیت میں رہ جاتے ہیں مثلاً ایک علاقہ سے چھ افراد انتخاب میں قسمت آزمائی کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں فرض کر لیں کہ اس علاقہ میں کل ووٹر ایک ہزار ہیں اور ۵ افراد بالترتیب ۱۲۰، ۱۳۰، ۱۴۰، ۱۵۰، ۱۶۰ اور ۳۰۰ ووٹ حاصل کرتے ہیں اب یہ تو معلوم ہی ہے کہ ۳۰۰ ووٹ حاصل کرنے والا نمائندہ کامیاب رہا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ شخص $\frac{300}{1000}$ ووٹ لے چکا ہے یعنی ۷۰۰ ووٹر اس کے خلاف تھے اور صرف ۳۰۰ اس کے حق میں تھے۔ تو کیا ایسی حالت میں وہ ۱۰۰۰ ووٹروں کی اکثریت کا نمائندہ تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں مگر موجودہ انتخاب میں وہ اکثر کا نمائندہ تسلیم ہو گا۔

اسی طرح مرکزی یا صوبائی اسمبلی کا انتخاب ہے۔ اگر ایک علاقہ سے پانچ نمائندے چنے جانے مقصود ہوں تو اس کے لئے پندرہ

امیدوار کھڑے ہو جاتے ہیں اس میں بھی فرض کر لیں کہ ووٹر کل دس ہزار ہیں اور کامیاب نمائندوں کو علی الترتیب ۶۰۰، ۷۰۰، ۸۰۰، ۹۰۰ اور ہزار (۱۰۰۰) ووٹ ہو گئے ہوں اور باقی ووٹ نا کام نمائندوں پر تقسیم ہو چکے ہوں تو موجودہ طریق انتخاب کے اصول کے مطابق تو یہ نمائندے اکثریت سے کامیاب بتلائے جاویں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہلا شخص دس ہزار سے صرف چھ سو ووٹ حاصل کر چکا ہے اور دوسرے نمائندے علی الترتیب $\frac{۷۰۰}{۱۰۰۰۰}$، $\frac{۸۰۰}{۱۰۰۰۰}$، $\frac{۹۰۰}{۱۰۰۰۰}$ اور $\frac{۱۰۰۰}{۱۰۰۰۰}$ ووٹ حاصل کر چکے ہیں۔ یعنی کوئی شخص بھی اکثریت کا نمائندہ نہیں ہے۔

بعینہٖ اسی طرح صدر مملکت یا رئیس جمہوریہ کا چناؤ ہے۔ موجودہ طریق انتخاب کے اصول کے مطابق صدر کو اسمبلی کے اراکین چنتے ہیں جن کی تعداد تقریباً تین سو ہوتی ہے۔ اب فرض کر لیجئے کہ صدارت کے لئے پانچ امیدوار کھڑے ہیں اور کل ووٹ تین سو ہیں مثلاً ان کی تقسیم یوں ہوتی ہے کہ پہلا امیدوار ۱۰۰ ووٹ، دوسرا ۶۰، تیسرا ۷۰، چوتھا ۳۰، پانچواں ۴۰ ووٹ لیتا ہے یعنی پہلا امیدوار ۳۰۰ ووٹ کی اکثریت سے صدر منتخب ہوا اور انہیں اکثریت کا نمائندہ تسلیم کیا جائے گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ۲۰۰ ووٹر ان کے خلاف تھے جنہوں نے ان کو ووٹ نہ دیئے۔ یعنی $\frac{۲}{۳}$ اکثریت ان کے حق میں نہیں تھی اور صرف $\frac{۱}{۳}$ اقلیت نے انہیں

ووٹ دیا۔

معلوم ہوا کہ وہ اکثریت کا نمائندہ نہیں ہے مگر موجودہ طریق انتخاب کی رو سے انہیں اکثریت کا نمائندہ تسلیم کیا جائے گا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ برسر اقتدار آکر اکثریت کو ساتھ ملانے کے لئے ہر داؤ پیچ چلاتا ہے۔

پس میرے نزدیک تو اس طرح کے انتخابات کا بہتر طریقہ یہ ہوتا کہ جتنے افراد اپنے آپ کو انتخابات لڑنے کے لئے پیش کرتے اُن کا پہلے علمی اخلاقی اور سیاسی امتحان لیا جاتا جو باقاعدہ تحریری اور زبانی پرچوں کی صورت میں ہوتا۔ اور یہ امتحان اس علاقے کے تعلیم یافتہ اور سنجیدہ طبقے کی ایک پنچائت کے سامنے دیا جاتا پھر اس پنچائت کے وہ معزز حضرات ان لوگوں کو اپنی صلاحیت کے مطابق باقاعدہ نمبر الاٹ کرتے اور جو شخص اول درجہ میں کامیاب ہوتا۔ سب سے پہلے اس کو انتخاب لڑنے کا موقع دیا جاتا۔ اگر وہ عوام الناس کے نصف سے زیادہ اکثریت کا ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ تو بس وہی شخص اس علاقے کا نمائندہ سمجھا جاتا۔ اگر وہ اکثریت کا ووٹ حاصل کرنے میں ناکام ہوتا تو پھر دوسرے نمبر پہ کامیاب شدہ شخص کو اپنی قسمت آزمائی کا موقع دیا جاتا۔

بلا مقابلہ منتخب شدہ نمائندگی غلط ہے

یہاں ایک سوال پیدا ہو گا کہ جب...

ایک شخص علمی، اخلاقی، اور سیاسی امتحان میں اول درجہ پر کامیاب ہوگیا اور پنچایت نے اسے انتخاب لڑنے کے لیے اول درجہ پر منتخب کر لیا۔ تو پھر کیوں نہ اس کو بلا مقابلہ کامیاب نمائندہ تسلیم کر لیا جائے۔

میرے نزدیک یہ قطعاً غلط ہوگا۔ مجھے تو موجودہ طریق انتخاب میں بلا مقابلہ کامیاب ہو جانے کے طریقے پر بھی اعتراض ہے وہ یوں کہ موجودہ طریقہ انتخاب کے اصول کے مطابق اگر ایک علاقہ سے تین چار نمائندے کھڑے ہوں اور پھر ان میں کا ایک نمائندہ اپنے اثر و رسوخ یا زر و دولت سے باقی تینوں پر اپنے مقابل کو بیٹھ جانے پر مجبور کر دیتا ہے تو موجودہ جمہوریت کے طریق انتخاب کے اصول کے مطابق وہ بلا مقابلہ کامیاب نمائندہ تسلیم کیا جائے گا۔ چاہے وہ ذاتی فاسق فاجر اور نااہل ہی کیوں نہ ہو اور طرہ یہ کہ وہ بھی اپنے آپ کو عوام کا نمائندہ تصور کرے گا۔ حالانکہ اگر اسے عوام کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ عوام کی اکثریت کا ووٹ حاصل نہ کر سکتا لہذا بلا مقابلہ انتخاب قطعاً غیر اصولی ہے اور بلا مقابلہ منتخب شدہ نمائندہ عوام کا نمائندہ ہرگز نہیں کہلایا جا سکتا۔

اسلام نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ جب ایک نمائندہ چند معزز حضرات کی رائے سے خلافت یا صدارت کے لئے نامزد کیا جائے تو پھر اس کو عوام الناس کے سامنے بھی پیش کیا جائے اور اس کی اصل کامیابی اس وقت تسلیم کی جائے جب کہ عوام الناس کی اکثریت اس

کسے ہاتھ پر بیعت کر دے۔ خلفائے راشدین کے عہد میں بھی یہی طریقہ
انتخاب رکھا گیا تھا کہ پہلے چند معزز حضرات ایک صاحب کو منتخب
کرتے اور پھر ان کو عوام الناس کے سامنے بیعت لینے کے لئے پیش
کرتے۔ یہاں تک کہ عوام کی اکثریت کا ووٹ انہیں حاصل ہو جاتا۔

موجودہ طریق انتخاب | ووٹوں کو خفیہ طور پر بکسوں میں ڈالنے کا اصول غلط ہے

کا ایک اصول یہ ہے کہ نمائندوں کے لئے علیحدہ علیحدہ رنگ کے
بکس تیار کئے جاتے ہیں پھر ان بکسوں کو ایک علیحدہ کمرے میں
مجسٹریٹ یا پولنگ آفیسر کی نگرانی میں رکھا جاتا ہے اور ہر ووٹر اندر
جا کر اپنی مرضی کے مطابق جس نمائندہ کو چاہتا ہے اس کے بکس میں
اپنے ووٹ کی پرچی ڈال دیتا ہے۔ یا اگر ووٹر تعداد میں زیادہ ہوں تو پھر ہر
نمائندہ کو پولنگ آفیسر کی طرف سے ایک انتخابی نشان الاٹ ہوتا ہے
اور پھر ووٹر اندر جا کر جس شخص کو ووٹ دینا چاہیے اس کے الاٹ شدہ
نشان کے سامنے چرخی (×) کا نشان ڈال دیتے ہیں۔

بظاہر یہ طریقہ بہت اچھا نظر آتا ہے کیونکہ اس میں ہر ووٹر کو اندر
جا کر تخلیئے میں آزادی مل جاتی ہے کہ وہ جس کسی کو بھی اپنا ووٹ دینا
چاہے دے سکتا ہے۔ مگر اس طریقہ میں چند ایسے نقائص بھی ہیں جو اس کے
فائدے سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ مثلاً ایسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ چند
چالاک لوگ اپنے نمائندہ کی ایماء پر ووٹوں کی علیحدہ تیار شدہ کاپیاں

جو پہلے سے مارک کی گئی ہوتی ہیں اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں اور نہایت چالاکی سے آنکھ بچا کر اپنے ایک ووٹ کے ساتھ دس اور پرچیاں ڈال دیتے ہیں یا بسا اوقات بعض ایسے نمائندے جو کچھ اثر و رسوخ رکھتے ہوں وہ پولنگ آفیسر اور اس کے کارندوں کو ساتھ ملا کر جعلی ووٹ بکس میں ڈلوا جاتے ہیں۔

لیکن اس کا سب سے زیادہ نقصان دہ پہلو یہ ہے کہ اس طرح سے عوام الناس میں اخلاقی طور پر احساس کمتری اور منافقت کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہر نمائندہ کی پارٹی کئی کئی بار ہر ووٹر کے پاس پہنچتی ہے اور ہر اثر و رسوخ سے اسے اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ اس کا ووٹ ان کے نمائندہ کو دیا جائے۔ بہتوں کو روپوں کا لالچ دیا جاتا ہے۔ بہتوں کو دھمکی سے پھسلایا جاتا ہے اور نہ معلوم ہر ووٹر کی کیا کیا منت سماجت کی جاتی ہے کئی لوگ بیچ میں سودا بازی کر جاتے ہیں اور اس طرح ووٹر بیچارے کو اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ یا تو وہ ایک کے سوا باقی تمام کی مخالفت اور دشمنی مول لے اور یا دل میں منافقت رکھ کر ہر پارٹی کے ہاں میں ہاں ملاتا جائے اور بسا اوقات تو ووٹروں کو یہ بات بھی سکھائی جاتی ہے کہ بھئی تم دعوتیں تو فلاں صاحب کے اڑاتے جاؤ اور اگر روپے پیسے چاہیں تو وہ بھی لے ڈکار ہضم کر تے جاؤ مگر اندر جا کر ووٹ ہم ہی کو دینا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ کئی ووٹر جاتے تو ایک طرف

سے ہیں، لیکن اندر جا کر ووٹ کسی دوسری پارٹی کو دے جاتے ہیں اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض چالاک ووٹر اپنے ووٹ لینے والوں سے یہ کہہ دیتے کہ بھئی میں جاؤں گا تو فلاں پارٹی کی طرف سے لیکن اندر جا کر ووٹ تمہیں دوں گا۔ مگر اندر جا کر وہ ایسا نہیں کرتا۔

اس طریقۂ انتخاب کا عوام الناس کے اخلاق پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے کیونکہ وہ ایک طرف تو منافق بن جاتے ہیں کہ جس سے کھاتے ہیں جس سے وعدہ کرتے ہیں اور جس پارٹی کی طرف سے جاتے ہیں ان کو ووٹ نہیں دیتے اور محض ان بیچاروں کو دھوکہ میں رکھ لیتے ہیں اور دوسری طرف بھی وہ جھوٹے اور وعدہ خلاف بن جاتے ہیں جو کہتے تو ہیں کہ ہم ووٹ تمہیں دیں گے۔ لیکن دیتے نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝ (۲۸ الصف ع ۱) "اے ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ خدا کے نزدیک ایسی بات بہت بری ہے (یعنی خدا کو ایسی بات بہت بری لگتی ہے) جو تم کہتے ہو اور کرتے نہیں۔"

اسلام تو عوام الناس کے اندر اخلاقی جرأت پیدا کرنے کا سبق دیتا ہے۔ اسی لئے اسلام میں یہ طریقہ رکھا گیا ہے کہ جو

شخص جس کسی کو ووٹ دینا چاہے وہ سر میدان آکر علی الاعلان بیعت کرے اور جو مخالفت کرنا چاہے وہ ڈنکے کی چوٹ حسین علیہ السلام کی طرح صاف انکار کر دے کہ میں فاسق و فاجر کی بیعت نہیں کر سکتا۔

موجودہ جمہوریت کے طریق انتخاب

عورتوں کا مردوں کے حق میں ووٹ دینا غلط ہے

میں ایک اصول یہ رکھا گیا ہے۔ کہ عورتوں کو بھی مردوں کے حق میں ووٹ دینے کا حق دیا گیا ہے۔ بظاہر تو یہ بہت اچھی بات نظر آتی ہے کہ عورتوں کو بھی مردوں کے برابر حقوق دئے گئے ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ ایک سنہری چال، دھوکہ اور فریب ہے۔ جو عورتوں کی تسلی کے لئے رکھا گیا ہے تاکہ عورتوں کو یہ اطمینان حاصل ہو کہ اسمبلی میں جو نمائندے جا رہے ہیں وہ ہمارے ہی نمائندے بن کر جا رہے ہیں۔ حالانکہ کوئی مرد اسمبلی میں جاکر یہ خیال تک بھی نہیں کرتا کہ میں عورتوں کی نمائندگی کے لئے آیا ہوں یا مجھ پر عورتوں کی بھی نمائندگی کرنا لازم ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عورت کبھی بھی اپنی مرضی کے مطابق کسی مرد کو ووٹ نہیں دے سکتی۔ کیونکہ وہ اکثر کسی کی ماں، کسی کی بہن، کسی کی بیٹی، اور کسی کی بیوی ہوتی ہے۔ جو عموماً ان افراد سے مرعوب و متاثر ہوتی ہے۔ اگر کسی گھر کا مرد یہ چاہتا ہو کہ

اسکا ووٹ فلاں شخص کو ملے تو اس کی بیوی کبھی اسکی مخالفت نہیں کر سکتی، اِلّا یہ کہ وہ اتنی آزاد عورت ہو کہ اسے کسی معاملہ میں بھی مرد کی کوئی پرواہ نہ ہو جیسے یورپ کی عورتیں ہوتی ہیں۔ اور اسی طرح کوئی عورت اپنے والد، اپنے بیٹوں اور اپنے بھائیوں کی مخالفت نہیں کر سکتی لہذا یہ کہنا کہ عورت کا مرد کو ووٹ دے دینا اس کی مساوی حقوق کا مل جانا ہے قطعاً غلط ہے۔

اور سب سے بڑھ کر جو بات باعث خطرہ ہے وہ یہ ہے کہ عورت چونکہ برقعے میں ملبوس ہوتی ہے۔ لہذا چالاک لوگ چالاک عورتوں کے ذریعے سے کئی جعلی ووٹ بکس میں ڈلوا جاتے ہیں اور مختلف برقعوں اور پردہ میں رہنے کی وجہ سے عورتوں کی صحیح پہچان نہیں رکھی جا سکتی اور اس کے ذریعے سے کئی جعلی ووٹ بڑی آسانی سے ڈالے جا سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عورت کو مردوں کے حق میں ووٹ دینے کی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی خلیفہ کے انتخاب میں عورت کو ووٹ دینے کی ضرورت محسوس کی ہے۔

البتہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں عورت کو عورتوں کی نمائندگی کا حق ضرور ملنا چاہیئے اور اس کا طریق انتخاب بھی یہ ہو کہ عورت، عورت کو ہی ووٹ دے۔ عورتوں کا پولنگ افسر بھی عورت ہو اور ان کا پولنگ سٹیشن بھی علیحدہ اور باپردہ ہو تا کہ وہ مردوں کے

تسلط سے دور رہ کر پوری آزادی کے ساتھ ووٹ دے سکیں۔

غرض یہ ہے کہ موجودہ قسم کی مغربی جمہوریت نہ تو اسلامی جمہوریت ہے اور نہ ہی اس کی کوئی مسخ شدہ صورت، بلکہ یہ نظام جو مغربیت کا ایجاد کردہ ہے۔ فی نفسہ اپنی اصلیت اور شکل دونوں کے اعتبار سے غلط ہے۔ جس کو چوں چوں کا مربہ یا چنڈال چوکڑی کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسلام ڈکٹیٹرشپ ہے۔ ڈکٹیٹر تو ہر حکم خود سے دیتا ہے۔ وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر حکم قانون سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اسلام کا خلیفہ کوئی ایسا حکم اپنی جانب سے نہیں دے سکتا۔ جو قرآن و سنت کے خلاف ہو بلکہ وہ تو بذات خود خدا اور رسولؐ کے احکام کا پابند ہوتا ہے اور عوام کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔

دوسرے اگر کسی ملک اور قوم کے قوانین ڈکٹیٹر کی مرضی کے خلاف ہوں تو وہ ان کو اپنی خواہشات کے مطابق تبدیل یا منسوخ کر سکتا ہے۔ لیکن اسلام خلیفہ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ خدا اور رسولؐ کے بنائے ہوئے قوانین میں ذرا برابر بھی تبدیلی کر سکے۔

تیسرے یہ کہ ملک کا کوئی بھی شخص ڈکٹیٹر کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس پر نکتہ چینی کر سکتا ہے۔ اسلام

اطاعت امیر کا حکم ضرور دیتا ہے۔ لیکن جب تک امیر اسے خدا اور رسول کے حکم کے مطابق حق بات کا حکم دے۔ اگر امیر خدا اور رسولؐ کے خلاف حکم دے یا منکرات پر امر کرے تو اس کی اطاعت اسلام کی رو سے لازم نہیں۔

اور یہ کہنا کہ ہر شخص ڈکٹیٹر بن سکتا ہے۔ کسی معیار، صلاحیت یا کسی شرط کی ضرورت نہیں مگر اسلام کسی زانی، شرابی، فاسق، فاجر اور نااہل و نالکارہ کی بیعت کا حکم نہیں دیتا۔ بلکہ اسلام ہمیں حکم دیتا ہے کہ تمہاری قیادت صرف صالح لوگوں کو ملنی چاہیئے۔ غیر صالح قیادت کو ختم کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

اسلام نے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی "وشاورھم فی الامر" کا حکم دیا ہے۔ اور قرنِ اول کے مسلمانوں کے متعلق فرمایا ہے
" وامرھم شوریٰ بینھم "

اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر امر آپس کے صلاح مشورے سے طے کیا جائے تاکہ وہ قرآن و سنت کے بھی مطابق رہ سکے اور اس کے تاریک و روشن پہلو بھی امیر کے سامنے کھل سکیں اور پھر امیر جس امر کو مناسب سمجھے اسے اختیار کر لے اسلامی شوریٰ میں امیر اکثریت کی رائے کا پابند نہیں بلکہ حق کا پابند ہے۔ اگر ایک منصوبہ کسی ایسے شخص کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ جس کی اکثریت مخالف ہو لیکن وہ منصوبہ ایسا ہو کہ جس میں قوم اور ملک کی

فلاح و بہبود ہو تو امیر پر لازم ہے کہ اس ایک شخص کا پیش کردہ منصوبہ منظور کرے۔ اس میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ صلاحیت رکھنے والے لوگ بڑی دلیری کے ساتھ امیر کے سامنے فلاح و بہبود کے منصوبے پیش کر سکتے ہیں اور اگر امیر اکثریت کی رائے کا پابند ہو جائے تو اکثریت میں تو ایسے نتھو خیرے سب شامل ہوتے ہیں جو صرف ہاتھ اٹھانا جانتے ہیں کسی منصوبے کو سمجھنے کی صلاحیت تو کیا اس کی "الف ب" سے بھی واقف نہیں ہوتے۔

لہذا اسلام نے مشورہ دینے کا حق تو ہر فرد کو دیا ہے مگر حکم دیتے وقت امیر کو مکمل آزادی اور اختیار دے دیا ہے اور جو بات مشورے میں طے ہو جائے اور امیر اس کا اعلان کر دے پھر اس کی مخالفت کرنا ضد، ہٹ دھرمی، ذاتی عناد، فساد اور منافقت کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ "وَمَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ" اور حق کے بعد تو گمراہی کے سوا کیا رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام مکمل اطاعتِ امیر کا حکم دیتا ہے اور کسی قسم کی مخالفت یا ریشہ دوانیاں کو برداشت نہیں کرتا۔ الا یہ کہ امیر کا حکم قرآن و سنت کے صریحاً خلاف ہو۔

پس میرے نزدیک موجودہ جمہوریت مغربی جمہوریت ہے جس کا اسلامی شوریٰ کے ساتھ دور تک کا بھی واسطہ نہیں۔ لہذا اس طرزِ حکومت کو اسلامی شوریٰ کے طرز پر بدلنا لازم ہے مگر افسوس

ہے کہ اس کے خلاف آج تک کسی جماعت یا فرد نے آواز تک نہیں اٹھائی اور غالباً نہ ہی کسی جماعت میں آج تک یہ جرأت پیدا ہو سکی ہے کہ حسین علیہ السلام کے نقش قدم پر چل کر کربلا کی یاد کو تازہ کر سکے اور دنیا کو عملی طور بتلادے ۔ ؎

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حکومت الٰہیہ :- انیسواں امر جو اس وقت غور طلب ہے وہ یہ کہ کیا ہم حکومت الٰہیہ - یا خلافۃ فی الارض کا قیام عمل میں لا سکتے ہیں ؟ یا اگر آج کسی مسلم ملک میں یا یوں کہیئے کہ ہمارے ملک میں اسلامی قانون نافذ ہو جائے ۔ تو کیا ہم اس مملکت کے حکمران کو امیر المؤمنین (خلیفۃ المسلمین) اور ایسی حکومت کو حکومت الٰہیہ یا خلافت راشدہ کہہ سکیں گے ؟ اور جو اسلامی قانون مرتب کیا جائے گا کیا وہ دنیائے اسلام کی تمام حکومتوں کیلئے بھی قابل قبول ہو گا ؟ اگر نہیں تو آخر وہ کونسی کمی رہ جائے گی کہ جسکے باعث ہم اپنی حکومت کو خلافت راشدہ اور اپنے سربراہ کو خلیفۃ المسلمین نہیں کہہ سکتے ، یا ہمارا مرتب کردہ قانون دنیائے اسلام کی تمام حکومتوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا ؟ اس کے کئی اسباب اور وجوہات ہیں ۔ سب سے پہلی بات

یہ ہے کہ جب تک تمام دنیائے اسلام کے مسلمان ایک پلیٹ فارم
پر جمع نہیں ہو جائیں گے۔ اور اپنے اپنے ذاتی مفادات کو ترک کر کے
"وحدت اسلامی" کی خاطر ایک اسلامی بلاک نہیں بنائیں گے۔ اور
"واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا" [1]
کے حکم خداوندی کے مطابق ایک مضبوط زنجیر کی کڑیوں کی
طرح ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ نہیں ہو جائیں گے
کہ "استمسک بالعروۃ الوثقی لا انفصام لھا" [2]
کا عملی ثبوت دے سکیں۔ اور پھر بالاتفاق کسی ایک مرد خدا کو
اپنا صدر یا خلیفہ منتخب نہیں کریں گے تب تک کسی ایک مملکت کے
سربراہ کو خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین نہیں کہا جا سکتا۔ کسی
ایک فرد کو تمام دنیائے اسلام کا امیر یا خلیفہ منتخب کرنے کیلئے
یہ امر ضروری ہے کہ تمام اسلامی ملکوں میں بنیادی طور پر قرآن و
سنت کے مطابق صرف ایک ہی اسلامی قانون نافذ ہو۔ ہاں
البتہ ہر ملک اور قوم کی تہذیب تمدن اور رسم و رواج کا لحاظ
جزوی طور پر ضرور رکھا جائے گا اور ایک ہی قانون اسی وقت
نافذ ہو سکتا ہے۔ جبکہ تمام دنیائے اسلام کے لئے ایک سربراہ

---

[1] تم سب کے سب اللہ تعالیٰ کی رسی کو اسطرح مضبوطی سے پکڑو کہ ایک دوسرے سے جدا ہو کر

[2] ایسی مضبوط کڑیوں سے وابستہ ہونا جو کبھی نہ ٹوٹنے والی ہوں ۔۔

صرف اور صرف ایک ہی فقہ مدون کی جائے جس میں تمام مختلف الخیال اور مختلف العقائد اسلامی فرقوں کے مذہبی جذبات و احساسات کا لحاظ رکھا جائے۔ اور اس کا واحد علاج میرے نزدیک یہی ہے کہ صحاح ستہ اور دیگر تمام احادیث کی کتابوں کو جمع کر کے دنیائے اسلام کے بڑے بڑے مفسروں، محدثوں، اور فقہا کی نگرانی میں تحقیق و تجرید کی جائے۔ اور اس طرح اس تمام مجموعے سے صرف وہ متفق علیہ احادیث لی جائیں جو قرآن کی صحیح تفسیر اسلامی تاریخ اور فقہ کی تدوین میں کام آسکیں تاکہ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک تمام مسلمان ایک فقہ پر عامل ہو سکیں۔ پھر قرآن سنت اور اس فقہ کی روشنی میں ایک ایسا اسلامی قانون مرتب کیا جائے جو تمام مسلم مملکتوں میں قابل قبول اور قابل عمل ہو سکے۔

دوسری وجہ حکومت الٰہیہ نہ کہہ سکنے کی یہ ہے۔ کہ اس میں شک نہیں کہ قانون ہی کی وساطت سے اجتماعی شیرازہ بندی ہوتی ہے عدل قائم کیا جاتا ہے۔ مظالم کی روک تھام ہوتی ہے۔ حقوق کی حفاظت ہوتی ہے، بدمعاشی کے اڈوں کو بند کیا جا سکتا ہے۔

معاشرے میں بہت سے ایسے افراد ہوتے ہیں کہ اگر ان کے خلاف طاقت استعمال نہ کی جائے تو وہ ایسے افعال کے مرتکب ہو جاتے ہیں جو بحیثیت مجموعی ملک اور قوم کے مفاد کے خلاف ہوتے ہیں اور اسی طرح وہ ایسے بہت سے فرائض کی انجام دہی سے

غفلت برتتے ہیں، جن کی عدم ادائیگی پر معاشرے کو کافی حد تک نقصان پہنچ سکتا ہے اور معاشرے کے منفرد افراد بھی اگر قانون کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے آپ کو ملک و قوم کے نافذ کردہ قوانین سے وابستہ رکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ظلم و جبر سے محفوظ ہیں اور امن و سلامتی سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قانونی نظام کے بھی جسمانی نظام کی طرح دو پہلو ہو سکتے ہیں، ایک ظاہری دوسرا روحانی جسم سے مراد قانون کی وہ تمام تحریری دفعات ہیں جنہیں الفاظ کے سانچے میں ڈھالا جا سکے (جیسے قرآن کی دفعات) مثلاً وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ "ترجمہ: اور چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ ڈالو (جب وہ چوری کریں) ان کے کردار کے عوض میں بطور سزا کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ بڑی قوت والے بڑی حکمت والے ہیں" اسی طرح زانی مرد اور زانیہ عورت کے متعلق حکم ہے کہ ان کو سو سو کوڑے مارو۔ یعنی یہ اقتباس اسلامی قانون کی جسمانی دفعات ہیں، وہ ایک جسم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب اگر کسی اسلامی مملکت میں ان دفعات کو قانونی صورت دے دی جائے

تو اسی قانون کو ہم اسلامی شریعت یا اسلامی قانون کا نام تو ضرور دیں گے لیکن جبتک اس قانون کو عوام الناس اور حکمران طبقہ کے دل و دماغ پر حقیقی اور باطنی غلبہ و اقتدار حاصل نہ ہو۔ ہم اُسے حکومت الٰہیہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ حکومت الٰہیہ سے مراد ظاہری اور باطنی دونوں لحاظ سے الٰہی احکام کا غلبہ و اقتدار ہے۔ مثلاً ایک ملک میں اسلامی قانون تو نافذ ہو گیا، اسلامی دفعات کے مطابق سزا دینی بھی شروع ہو گئی۔ مگر معاشرے میں کچھ ایسے افراد موجود ہیں جو اسلامی قانون و شریعت کے نفاذ کے باوجود زنا، شراب، رشوت، چوری، چھوٹ یا کسی اور جرم پر اس طرح قدرت رکھتے ہیں کہ قانون کی گرفت میں نہ آسکیں اور وہ اُن جرائم سے باز بھی نہ آئیں پھر ان کی اصلاح کا طریقہ کیا ہے؟

پس ایسے قوانین جن کو عوام الناس کے دل و دماغ پر روحانی غلبہ حاصل نہ ہو۔ ہم انہیں جسم سے تعبیر کریں گے چاہے ظاہری طور پر وہ عمل ہی میں کیوں نہ لائے گئے ہوں۔ اور اسی حقیقت کے پیش نظر اللہ تعالےٰ نے رسول علیہ الصلاۃ والسلام کو دو حیثیتوں سے مبعوث فرمایا۔ ارشاد ہے "هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ - لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا" (اللہ تعالےٰ وہ ذات پاک ہے) جس نے اپنے رسول کو ہدایت (بالھدیٰ) اور سچا دین (دین الحق) دے کر بھیجا ہے

"تاکہ وہ اس "دین" کو تمام ادیان پر غالب کر دے اور اس پر اللہ تعالیٰ گواہ کافی ہے۔"

یعنی رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اگر ایک طرف اسلامی قوانین و ضوابط کو نافذ کرنے کی ذمہ داری تھی تو دوسری طرف وہ "ہادی" کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ یعنی رشد و ہدایت کے ذریعے خلق خدا کی اخلاقی اصلاح بھی فرماتے تھے۔ اور یہی اخلاقی و روحانی اصلاح قوانین کی اصل روح ہے۔

دراصل جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر چیز کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے۔ اسی طرح خلافت راشدہ یا حکومت الٰہیہ کا بھی ایک ظاہر اور ایک باطن ہے۔ ظاہر کا تعلق نظم و نسق اور قوانین و شریعت سے ہے۔ اور باطن کا تعلق روحانی اصلاح اور تہذیب اخلاق سے ہے۔ اگر کسی قوم میں ظاہری نظم و نسق کے ساتھ روحانی اصلاح کی قوت بھی پیدا ہو جائے۔ تو اللہ تعالیٰ قوموں کی امامت و قیادت کی باگ ڈور اس کے سپرد کر دیتا ہے اور اگر وہ روحانی اعتبار سے اخلاق حمیدہ کی مالک نہ ہو۔ تو وہ حکومت کو چلانے کی فطری صلاحیت کی بنا پر ظاہری لحاظ سے تو قائم تو کر لیتی ہے۔ لیکن اس کے برسر اقتدار آنے کے ساتھ ساتھ وہ سفاکی اور ضابطوں یا دو رخی جو اس کے ضمیر میں موجود ہے، یعنی ابھر آتا ہے۔ یا آمرانہ طریقے سے عیاشی و شہوت اور ذاتی اغراض کی خاطر

پیرا ہوتی ہو کر کے شر و فساد اور خونریزی پر آمادہ کرتا ہے جس کا قطعی نتیجہ ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمؑ (یعنی انسان) کو چونکہ علم فطرت ودیعت کر دیا گیا ہے لہٰذا وہ نظم و نسق اور حکومت کے چلانے میں فطری طور پر ماہر بن سکتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی اُس کے ہاتھ میں حکومت آئی ہے۔ اُس نے ظاہری نظم و نسق پر بہت جلد عبور پا لیا ہے۔ لیکن اُس کے باطن کا تعلق چونکہ اصلاح نفس اور تہذیب اخلاق سے ہے لہٰذا اس میں وہ تزکیہ نفس کا محتاج ہے۔

اور جب تک اس بارے میں کسی روحانی قائد (یعنی نبیؑ یا امام یا ان کے متبعین) کی پیروی نہ کی جائے۔ روحانی اصلاح کا ظہور پذیر ہونا مشکل ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ پ۴ آل عمران ع ۱۷

ترجمہ :- تحقیق اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ اُن میں اُن ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ اُن لوگوں کو اللہ تعالےٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور اُن کو

تزکیہ کرتے ہیں اور اُن کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ اس سے پہلے صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ جس طرح دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب اسلام ہے۔ اسی طرح دنیا کے سب سے بڑا روحانی، سیاسی اور مذہبی قائد سید الانبیاء احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ (فداہ ابی وامی و نفسی والی و مالی وعیالی) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے انسانیت کے لیے ظاہری اور باطنی طور پر جو جو تعمیری امور سرانجام دیئے ہیں اس کی نظیر تاریخ عالم میں ملنی محال بلکہ ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور آپ کی بدولت دنیا کے جاہلوں کو عالم، ظالموں کو عادل، وحشیوں کو مہذب، رذیلوں کو بااخلاق، غیر متمدن کو متمدن، ڈاکوؤں اور چوروں کو محافظ و پاسبان اور گڈریوں کو حکمران بنا دیا بلکہ ان خوبیوں میں انہیں تمام دنیا کا امام بھی بنا دیا۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ اس حیرت انگیز انقلاب کا واحد سبب آپ کی تعمیری قیادت تھی جس نے نہ صرف مسلمانوں کو سیاسی طور پر امامت و قیادت کا اہل بنا دیا تھا بلکہ روحانی طور پر بھی وہ دنیا کے امام بن گئے تھے۔

پس خلافت راشدہ تک کے لیے بھی نہ صرف ظاہری امور شرعیہ میں رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع لازم ہے بلکہ روحانی طور پر بھی ان کا اتباع اسی طرح لازم ہے جس طرح ظاہری شریعت میں اور جو خلافت ظاہری اور باطنی ہر دو پہلوؤں سے علیٰ منہاج النبوۃ قائم

کی جائے وہ خلافت راشدہ کہلاتی ہے لیکن جو حکومت ان ہر دو لحاظ سے منہاج النبوۃ پر قائم نہ ہو۔ وہ مسلمانوں کی حکومت تو کہلائی جاسکتی ہے لیکن اُسے خلافتِ راشدہ ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

مندرجہ بالا آیت سے بھی واضح ہوتا ہے۔ کہ خلافتِ راشدہ کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور جہاں حکمران طبقہ کے لئے ظاہری انتظام دینی کو شریعتِ اسلامی کے مطابق چلانے کی ضرورت ہے وہاں "وَيُزَكِّيهِمْ" کے حکم خداوندی کے تحت انہیں نہ صرف اپنی اصلاح اور تزکیہ النفس کرنا ہے بلکہ عوام الناس کی روحانی اصلاح بھی ان پر لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خلافت عطا کرنے کا وعدہ بھی چند ضروری اور اہم امور سے مشروط فرما دیا ہے۔ ارشاد ہے:-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (پ ۱۸ النور ع ۷)

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ نے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ وعدہ فرمایا ہے جو ایمان لائے اور صالح العمل ہیں کہ اُن کو زمین میں خلافت عطا کرے گا جیسے

کہ اُن سے پہلے لوگوں کو عطا کی گئی تھی۔ اور جس دین کو اُن کے لیے پسند کیا گیا ہے
اُس سے اُن کو قوت دے گا اور اُن کے خوف کو امن سے بدل دیگا
(بشرطیکہ وہ) میری بندگی کریں " یَعْبُدُوْنَنِیْ " اور میرے ساتھ
کسی قسم کا شرک نہ کریں۔ اور جو شخص حکومت ملنے کے بعد ناشکری کریگا
تو ایسے ہی لوگ فاسق (نافرمان) ہوتے ہیں۔ اور تم نماز کی پابندی کرو
زکوٰۃ دیا کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو۔ تاکہ تم پر رحم کیا جاوے "

خداوند تعالیٰ نے خلافتِ ارضی کو ایمانداری، عمل صالح اور
خدا کی عبودیت (بندگی) سے مشروط کر کے آگے نصیحت فرمائی ہے
کہ تم نماز کی پابندی رکھو، زکوٰۃ دیا کرو اور رسول کی اطاعت و پیروی
کرو تاکہ تم پر رحم کیا جاوے یعنی ان احکام سے تم خدا کی عبودیت اختیار
کر سکوگے اور صالح العمل ایماندار بن سکوگے جو خلافتِ ارضی کے لیے
لازمی شرائط ہیں۔

لیکن تاریخ شاہد ہے۔ کہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
زندہ تھے تب تک تو وہ حکومت کی انتظام داری اور اصلاحِ عالم کا
کام خود ہی انجام دیتے رہے۔ بلکہ آپ کے وصال کے بعد تقریباً بیس سال
تک اسلام ظاہر و باطن ہر دو لحاظ سے اپنے اصلی رنگ میں موجود رہا۔
جب تک کہ وہ اُن افراد کے ہاتھوں میں چلتا رہا۔ جو اسلام کی تحریک کے ساتھ
شروع سے وابستہ تھے۔ اور جو اُس کے نشیب و فراز سے واقف
اور اُس کے تمام رموز کو سمجھتے تھے۔ اور جن کا سیرت کی تعمیری نظام

کے تحت ہو گئی تھی۔ لیکن جیسے ہی حکومت اسلامیہ اُن لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی جو یا تو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے۔ یا جن لوگوں کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے براہ راست تعلیمات اسلامی حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ تو اسلام میں افراط و تفریط کے دروازے کھلنے شروع ہو گئے۔

قرآن کریم میں بھی اُن لوگوں پر جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے پہلے اسلام لانے والوں کو ترجیح دی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ط اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا ط پ ۲۷ الحدید ع ا (تم میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے قبل خرچ کیا اور لڑے وہ برابر نہیں، وہ لوگ درجہ میں اُن لوگوں سے بہت بڑے ہیں جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اور لڑے۔)

انہی اصحاب میں امیر معاویہ اور مروان بھی تھے۔ گو امیر معاویہ ان سب میں زیادہ سمجھدار اور سیاست داں تھے۔ اور فتح مکہ کے بعد کچھ دنوں کے لئے آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی کی حیثیت سے آپ کے قریب رہ کر اسلام کو سمجھنے کا موقع بھی مل گیا تھا۔ لیکن خلفائے راشدینؓ کی طرح اسلامی سیاست یعنی خلافت راشدہ یا حکومت الٰہیہ کی پیچیدگیوں کو آپ بھی نہ سمجھ سکے تھے یہی وجہ تھی کہ حضرت علی علیہ السلام (جو مسلمانوں کی اکثریت

کے اتفاق سے خلیفہ منتخب ہوئے تھے) کی عہد خلافت میں آٹھ ماہ کے سکوت کے بعد آپ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت اور اُن کے خون کے قصاص کو بہانہ جنگ بنا کر نہ صرف خلافت کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا اور اس طرح اسلامی سیاست میں زبردست خانہ جنگی کا دروازہ کھول دیا۔ بلکہ حضرت علی علیہ السلام کی مخالفت اور حصول تخت حکومت کی جدوجہد میں وہ تمام مذموم ذرائع اور وسائل بھی استعمال کئے جن کی اسلام کفار کے مقابلے میں بھی اجازت نہیں دیتا۔ بیت المال کے خزانوں کو اپنے ذاتی مقاصد کے لئے بے دریغ خرچ کیا گیا۔ حضرت علیؓ کے ساتھیوں کو اپنی طرف ملانے اور اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لئے خوب روپیہ صرف کیا گیا۔ عمرو بن عاص کو جن شرائط کے ساتھ اپنے ساتھ ملایا گیا اور حضرت حسنؓ سے جن شرائط پر صلح کی گئی ان کی تفصیلات تمام تواریخ میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت علی علیہ السلام کو مسجد میں جمعہ کے خطبوں کے بعد جس طرح برا بھلا کہنے کی رسم جاری کی گئی۔ اور اس سلسلہ میں حجر بن عدیؓ اور اُن کے ساتھیوں کو جس طرح شہید کیا گیا۔ پھر یزید کو اپنی حیات میں جس طرح جانشین کیا گیا اور مسلمانوں سے زبردستی بیعت لی گئی۔ اور امیر معاویہ کے یزید کو اپنی زندگی میں ولی عہد بنانے کی بدعت نے اسلام کو جو نقصان پہنچایا۔ اُس کی تلافی آج تک نہیں ہوسکی۔ حالانکہ خود امیر معاویہ کو حضرت علی علیہ السلام کے خلاف خروج کرنے کا از روئے قرآن حق حاصل نہ تھا کیونکہ قرآن کی آیت

مذکورہ بالا ہیں "اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا" سے صاف ظاہر ہے کہ فتح مکہ سے قبل جو لوگ ایمان لائے تھے وہ درجے کے لحاظ سے اُن لوگوں سے بہت بڑھے تھے جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے ورنہ ویسے بھی حضرت علی علیہ السلام کے مقابلے میں امیر معاویہ اور حضرت حسین علیہ السلام کے مقابلہ میں یزید کی حیثیت سورج کو چراغ دکھانے کے برابر تھی، بالخصوص جبکہ مہاجر و انصار بیعت رضوان کے صحابہ اور اصحاب بدر رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بالاتفاق آپؑ کو خلیفہ منتخب کر لیا تھا بلکہ تمام حجاز، بصرہ، اور کوفہ تک کے لوگوں نے آپؑ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی اور اس طرح آپؑ کی خلافت پر سات آٹھ ماہ کا عرصہ بھی گذر چکا تھا۔ امیر معاویہ کا طرز عمل بحث طلب ہو جاتا ہے۔

غرض اس طرح خلافت راشدہ یا حکومت الٰہیہ کے اصل مقصد کو ضائع کیا گیا۔ اور اسلامی حکومت بنو امیہ کے خاندان میں محبوس ہو گئی۔ اسلام کا جمہوری نظام ختم ہو گیا اور اُس کی جگہ ایسی ہی بادشاہت قائم ہو گئی جیسی ایران و روم میں اُس وقت قائم تھی جب اسلام کا ظہور ہوا تھا۔ اور جس کو مٹانے کا دعویٰ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا امیر معاویہ کے بعد سے تقریباً تیرہ سو برس تک یعنی "جب تک خلافت کا برائے نام ادارہ قائم رہا" حکومت ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہوتی چلی آئی درباری علماء نے بھی نظام ملوکیت

اور خداوندی وراثت خلافت کی موجب حمایت کی حالانکہ الٰہی حکم کے
مطابق ہر فرد خلیفہ اور نائب خدا ہے ۔ اور خداوندی احکامات و
قوانین کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے ۔ البتہ نظام میں مرکزیت پیدا کرنے
کی خاطر افراد کو یہ اجازت ہے کہ وہ اپنے اختیار اور اپنے ارادے
سے اپنے ہی اندر سے جس پر ان کو اعتماد ہو، امیر یا خلیفہ منتخب
کر لیں اور یہ امیر یا خلیفہ اس وقت تک امیر ہے جب تک عوام کی
رضامندی اور اعتماد اس کو حاصل ہے ۔ اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ
ہے کہ انسان سوائے اللہ تعالٰی کے کسی دوسری طاقت یا ذات کی
عبودیت نہیں کر سکتا ۔ چنانچہ ہر وہ نظام جو اس عقیدہ پر مبنی
ہو اور جس کا مقصد صرف خدا کی حکومت کا قائم کرنا ہو ۔ اور جو صرف
خداوندی قانون کے ماتحت نظام حکومت کو چلاتا ہو بلکہ تمام ملت
کا نظام حیات بھی ظاہری اور باطنی ہر دو لحاظ سے یکسوئی کے
ساتھ خدا اور رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کے عین مطابق
ہو ۔ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ
الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا
أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۝ (پ ۸ الانعام ع ۲۰) ترجمہ: (اے نبی آپ
فرما دیجئے) اے مخاطب! کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری
عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے
جو سارے جہان کا پروردگار ہے ۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور

مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں خود سب سے پہلے ان احکام کو ماننے والا ہوں۔)

غرض خلافت راشدہ کے بعد سے اسلام کا اجتماعی تخیل ختم ہو کر ایک نسلی اور لسانی نظریہ حیات ہو گیا اور دین کو یا تو انفرادی نجات اخروی کا ذریعہ سمجھ لیا گیا یا صرف زمین پر غلبہ حاصل کرنے اور کفار پر حکومت کر لینے کا نام "اسلام" رکھ لیا گیا اور اس طرح دین و دنیا مذہب و سیاست یعنی دنیا و آخرت میں کوئی واسطہ باقی نہ رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام میں رہبانیت، قیصریت، اور چنگیزیت آہستہ آہستہ داخل ہو گئی۔ شریعت و ہدایت کی وہ وابستگی جس کے متعلق رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں قرآن و سنت یا قرآن و اہل بیت ہر دو کو مضبوطی سے پکڑنے کی ہدایت کی تھی، سیاسیات کی بھینٹ چڑھ گئی اور جب تک بنو امیہ کی حکومت رہی تب تک تو کوئی فرد بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت سے دوستی یا ان کی پیروی کا نام تک نہیں کر سکتا تھا۔ جب بنو عباس برسر اقتدار آئے تو وہ بھی خلافت کے ہاتھ سے چھن جانے کے ڈر سے بنو فاطمی کو ہر طرح سے دباتے رہے۔ ادھر تخریبی عنصر اور منافقین نے بنو فاطمی کے ہمدردوں کو حکومت کے خلاف اکسانے میں کوئی کمی نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو بعض لوگ اہل بیت (جو اصل وارثین نبوت تھے) کی محبت سے محروم رہ کر روحانی اصلاح سے دور

رہے اور دوسری طرف دوسرے لوگوں نے بغض صحابہ کو دل میں رکھکر حد سے تجاوز کیا اور قرآن کی صریح آیتوں کو جھٹلاتے ہوئے اصحاب ثلاثہ کو "رضی اللہ تعالےٰ عنہم" کہنے سے انکار کیا۔ حالانکہ قرآن کا صاف حکم تھا کہ :- لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ (پ ۲۶ الفتح ع ۳)

ترجمہ :- "تحقیق اللہ تعالےٰ اُن مسلمانوں سے راضی ہوا۔ جب کہ یہ لوگ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ اور ان لوگوں کے دلوں میں جو کچھ تھا۔ اللہ تعالےٰ کو وہ بھی معلوم تھا۔ اللہ تعالےٰ نے اُن میں اطمینان قلب اور تسکین پیدا کر دیا اور اُن کو لگتے ہاتھ فتح دیدی"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے بیعت رضوان کے صحابہؓ کے دلوں کی صفائی دیکھ کر ہی اُن کو اپنی رضا کی بشارت دی تھی اور تاریخ شاہد ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہما تو اس بیعت میں موجود تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی بیعت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک دست مبارک کو دوسرے ہاتھ پر مارکر فرمایا :- کہ "یہ بیعت حضرت عثمانؓ کی طرف سے ہے جو میں خود کر رہا ہوں" اب جو لوگ اس سے انکار کرتے ہیں وہ اپنی ضد اور ذاتی عناد کی وجہ سے نہ صرف تاریخ کو جھٹلاتے ہیں بلکہ قرآن کا بھی انکار کر رہے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے

نے تصافت فرمادیا ہے: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ یُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ (پ التوبہ ع ۳) ترجمہ:" جو لوگ ایمان لے آئے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں مال اور جان سے جہاد کیا، اُن کے درجے اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑے ہیں اور یہی لوگ پورے کامیاب ہیں۔ اُن کا رب اُن کو اپنی رحمت اور اپنی رضا مندی یعنی رضوان کی بشارت دیتا ہے۔ اور ایسے باغوں کی کہ اُن میں اُن کے لئے دائمی نعمت ہوگی اِن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا اجر ہے "

کیا کوئی شخص مندرجہ صدر آیت کی بشارت سے اصحاب ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کو باہر کر سکتا ہے؟ اگر نہیں! تو پھر بغضِ صحابہ سے کیا معنی؟ اور اصحاب ثلاثہؓ سے تبرّا کیا؟

غرض ایک طرف تو بنو اُمیّہ کے نسلی و سیاسی تعصب نے حضرت علی علیہ السلام کی امامت اور اہل بیتِ اطہار کی محبت سے مسلمانوں کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اور پھر بنو عباس کے عہدِ حکومت میں شیعہ سنی جھگڑوں نے اسے اور زیادہ ہوا دی

اور دوسری طرف بغضِ صحابہؓ کی غلط تعلیم نے لوگوں کو اپنی ضد اور
ہٹ دھرمی کے باعث راہ ہدایت سے دور رکھا۔ اور اسطرح
حکومت بنو امیہ سے لیکر قسطنطنیہ کی آخری خلافت تک جتنے بھی مسلمان
حکمران آئے ہیں گو اُنہوں نے بڑے سے بڑے پیمانے پر فتوحات
بھی کی ہیں۔ اسلامی حکومتیں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب
تک پھیلتی بھی رہیں اور اُن میں بعض حکمران صالح ترین بھی آئے۔ اُنہوں
نے اپنے عہدِ حکومت میں اسلامی قانون (اسلامی شریعت) کا نفاذ
بھی کیا ہے۔ لیکن خلافتِ راشدہ یا حکومتِ الٰہیہ کہیں بھی قائم نہ ہو سکی

خلافت اور امامت میں فرق :- در اصل ان تمام جھگڑوں کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے
امامت اور خلافت میں صحیح فرق نہیں کیا۔ ہمارے بعض لوگ
امامت کو بمعنی خلافت اور خلافت کو امام کا واحد حق تصور کرتے
ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خلافت کو حضرت علی علیہ السلام کا موروثی حق
ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اسی نظریے کے تحت بعض
لوگ خلافت کے لئے قریش کا ہونا لازمی سمجھتے تھے۔ اور بعض
بنو فاطمہ کو خلافت کا اصل وارث تصور کرتے رہے ہیں۔ بلکہ بعض
لوگ خلفاء ثلاثہؓ کے دشمن اسی لئے بن گئے تھے کہ انہوں نے
حضرت علی علیہ السلام کو جو وارثِ رسولؐ اور وصی نبیؐ تھے خلافت
کا واحد حقدار سمجھا تھا، حالانکہ اگرچہ خلافت اور امامت کو خیر

محنوں نہیں سمجھ سکتے تو یہ نوبت ہر گز نہ آتی۔

اس میں شک نہیں کہ لغوی لحاظ سے خلیفہ کے معنی پیچھے آنے والے قائم مقام یا نائب کے ہیں۔ لیکن دراصل خلافت کے معنے سٹیٹ یا حکومت کے ہیں جو انسان کو خدا کی نیابت میں تسخیر کائنات کے لئے عطا کی گئی ہے۔ اور امامت وراثت نبوت ہے جو اصلاح امت کے لیئے عطا کی جاتی ہے خلافت انسان کا فطری حق ہے۔ جو روز ازل سے اسے ودیعت کیا گیا ہے اور اسے انتظام ارضی کو قائم کرنے کے لئے خدا کا نائب بنایا گیا ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ (الانعام) الخ۔ ترجمہ: اللہ تعالیٰ تو وہی ہے جس نے تم سب کو زمین میں خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر زیادہ بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے

علامہ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے تفہیم القرآن میں آیت مذکورہ کی شرح یوں فرمائی ہے: "اس فقرہ میں تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں

۱۔ ایک یہ کہ تمام انسان زمین میں خدا کے خلیفہ ہیں، اس معنی میں کہ خدا نے اپنی مملوکات میں سے بہت سی چیزیں ان کی امانت میں دی ہیں اور ان پر تصرف کے اختیارات بخشے ہیں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ان خلیفوں میں مراتب کا فرق بھی خدا ہی نے رکھا ہے۔ کسی کی امانت کا دائرہ وسیع ہے۔ اور کسی کا محدود۔ کسی کو زیادہ چیزوں پر تصرف کے اختیارات دیئے ہیں اور کسی کو کم چیزوں پر۔ کسی کو زیادہ قوت کارکردگی دی ہے۔ اور کسی کو کم۔ اور بعض انسان بھی بعض انسانوں کی امانتیں ہیں۔

۳۔ تیسرے یہ کہ یہ سب کچھ دراصل امتحان کا سامان ہے۔ پوری زندگی ایک امتحان گاہ ہے۔ اور جس کو جو کچھ بھی خدا نے دیا ہے۔ اسی میں اس کا امتحان ہے۔ کہ اس نے کس طرح خدا کی امانت میں تصرف کیا۔ کہاں تک امانت کی ذمہ داری کو سمجھا اور اس کا حق ادا کیا اور کس حد تک اپنی قابلیت کا ثبوت دیا۔ اسی امتحان کے نتیجہ پر زندگی کے دوسرے مرحلے میں انسان کے درجہ کا تعین منحصر ہے۔"

علامہ مشرقی صاحب تذکرہ کے مقدمہ میں استخلاف کی آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کے تحت المتن میں قرآنی آیات کے ذیل دیگر فرماتے ہیں۔ "قرآن کریم میں استخلاف کا لفظ یا آیۂ استخلاف مع متعلق لفظ چار موقعوں پر آیا ہے۔ جو یہاں اپنے وسیع الذیل لفظ کے مطلب کی تفہیم و توضیح کے خیال سے اکٹھا لکھے جاتے ہیں۔" پہلا موقع سورۃ انعام میں ہے۔ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِن بَعْدِكُم مَّا يَشَاءُ ۲

اَنْشَاَکُمْ مِّنْ ذُرِّیَّۃِ قَوْمٍ آخَرِیْنَ ○ (۶: ۱۳۳) اور اے پیغمبر! جہاں تمہارا پروردگار بڑا رحم والا ہے۔ وہاں بڑا بے نیاز بھی ہے۔ وہ اگر مناسب سمجھے تو تم سب کو دنیا سے اُٹھا لے جائے اور تمہارے بعد جس کو چاہے تمہارا جانشین کر دے۔ جیسا کہ آخر دوسرے لوگوں کو ہلاک کر کے اُن کی بقیہ نسل سے تم کو فروغ دے ہی چکا ہے۔

۲ — دوسرا موقع سورۂ اعراف میں ہے۔ قَالَ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّھْلِکَ عَدُوَّکُمْ وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ○ (۷: ۱۲۹) ترجمہ: اس پر موسیٰ نے جواب دیا کہ لوگو! اب وہ وقت قریب آ لگا ہے۔ کہ تمہارا خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمکو ملک میں اُس کا جانشین بنائے پھر دیکھے کہ تم کیا سعی و عمل کرتے ہو۔

۳ — تیسری جگہ سورۂ ہود میں ہے۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِہٖٓ اِلَیْکُمْ ط وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ج وَلَا تَضُرُّوْنَہٗ شَیْئًا ط اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ (۱۱: ۵۷) اس پر ہود نے اُن سے کہا کہ اگر تم نے ان احکام سے گریز کیا تو کم از کم میں نے اپنا پیغام تم تک پہنچا دیا۔ اور اس نافرمانی کا نتیجہ لامحالہ یہ ہوگا کہ خدا تمکو ہلاک کر کے کسی دوسری قوم کو تمہارا جانشین کر دیگا اور وہ اس قدر تمہارے سب قوت ہوں گے کہ تم اُن کا کچھ بگاڑ بھی

نہ سکو گے اور یاد رکھو کہ میرا پروردگار ہر قوم کے اعمال کو بغور تمام دیکھ رہا ہے۔

۴۔ ایک موقع میں استخلاف کا لفظ ذرا مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے۔ سورۂ حدید میں ہے۔ "اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝" (۵۷ : ۷) ترجمہ: لوگو! خدا کو خدا مانو، اور رسول کو اس کا بھیجا ہوا پیغمبر سمجھ کر اس کے احکام کی تعمیل کرو۔ اور اس مال میں سے جس کا وارث اگلوں کو تباہ کر کے تم کو بنایا (اعلائے خدا میں) صرف کرو۔ کیونکہ جو لوگ احکام کی پیروی کرتے رہتے۔ اور جنہوں نے اپنا مال دیا۔ ان کو خدا کے ہاں سے اجر عظیم ملے گا۔ —— علامہ موصوف صاحب آگے لکھتے ہیں کہ:

"ان چاروں مثالوں سے یہ امر واضح ہے کہ استخلاف کے معانی قرآن کریم میں ایک قوم کو ہلاک کر کے دوسری کو اس کا جانشین بنانا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ نہ اس سے مراد بالخصوص وہ مسلمہ خلافت ہے۔ جس کا مرکز آج کل قسطنطنیہ ہے۔ اگرچہ وہ بھی اس میں شامل ہے نہ اس سے مراد [illegible] کا استخلاف ہے۔ نہ عجم کا نہ مشرق کا اور نہ مغرب کا بلکہ جو قوم ایک دوسرے کے ہلاک ہونے کے بعد اسکے ملک اور دولت کی وارث ہو وہی مستخلف ہے۔ خواہ وہ چین کی ہو یا روم کی یہی لیکن وہ [illegible] [illegible] ہے۔

مذکورہ صدر حضرات کی تشریح سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ انفرادی طور پر ہر انسان اور اجتماعی طور پر ہر قوم اپنی حیثیت کے مطابق زمین میں خلیفہ ہے۔ اور اُن سے اپنی اس ذمہ داری کے متعلق باز پرس ہوگی درااصل یہ حدیث شریف بھی اس آیت کی تفسیر ہے۔ ارشاد ہے:

"الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ" یاد رکھو کہ تم میں کا ہر شخص حاکم ہے۔ اور ہر شخص سے اُس کی رعایا کے متعلق باز پرس ہوگی اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے خلیفہ کے چناؤ میں ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق دیا ہے، اور غالباً اسی لئے حضرت علی علیہ السلام حضرت زبیرؓ۔ حضرت طلحہؓ۔ حضرت ابو سفیانؓ اور دوسرے بعض اصحابؓ نے خلیفۂ اول کے انتخاب کے وقت شامل نہ کئے جانے پر ناراضگی اختیار کی تھی۔

لیکن اس کے برعکس امامت ہر شخص کو نہیں مل سکتی چاہے وہ کتنا ہی دولتمند یا علم مذہبی کیوں نہ ہو کیونکہ امامت کے لئے ایمان کے ساتھ ساتھ تقویٰ بھی شرط ہے جیسے کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ○

ترجمہ: اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے کہ جب ابراہیمؑ کو اُنکے رب نے چند باتوں میں آزمایا۔ اور وہ اُن سب میں پورا اتر گیا تو اُس نے کہا میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔" اور ابراہیم نے

عرض کیا " اور کیا میری اولاد سے بھی یہ وعدہ ہے ؟" اللہ تعالیٰ نے جواب دیا " میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے "۔ اور پھر فرمایا:۔ لَقَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ۔ تحقیق تمہارے لئے ابراہیم علیہ السلام اور جو لوگ اُن کے ساتھ تھے کا اسوہ حسنہ ہے۔ یعنی امامت کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں سنت ابراہیمی کی پیروی کرنی ہو گی۔

اسوۂ ابراہیمی یا سنت ابراہیمی کو ادا کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اُن کی قربانیوں کو مدنظر رکھنا ہو گا۔ چنانچہ قرآن نے بھی ہمیں اس کی تفصیل بتا دی ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے (۱) جھوٹے معبودوں کی قربانی دی۔ فرمایا " فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا "۔ آپ نے تمام بتوں کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ پھر (۲) قوم کی قربانی دی۔ فرمایا " أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ (یا) تم سے اور تمہارے باپ دادوں کے روایات سے بیزار ہوں (یعنی) تم اور تمہارے اسلاف میرے دشمن ہیں۔ سوائے پروردگار عالم کے (یعنی) میں ایسے خدا کا پرستار رہوں جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے۔

اس کے بعد (۳) رشتہ داری کی قربانی دی۔ ارشاد ہے " فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ "۔ جب ابراہیم پر ثابت ہو گیا کہ اُس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو اُس سے بیزاری اختیار کی۔ پھر (۴) جان کی قربانی پیش کی ارشاد ہے " اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ " ابراہیم کو قتل کر ڈالو یا آگ میں ڈال کر جلا دو اور جب آگ

میں ڈالے گئے تب بھی متزلزل نہ ہوئے حتیٰ کہ خود اللہ تعالیٰ کو آگ سے فرمانا پڑا کہ یا نارُ کُونِی بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ۔ اے آگ ٹھنڈی اور سلامتی دینے والی ہو جا ابراہیمؑ پر۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(۵) بادشاہ سے ٹکر لیکر حجت کی۔ "حَاجَّ اِبْرٰھِیْمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ" ابراہیمؑ اپنے رب کے معاملہ میں بادشاہِ وقت سے بھی جا ٹکرائے۔ (۶) چھٹی قربانی وطن کی دی۔ اور اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ۔ کہہ کر بابل سے نکلے اور تبلیغ حق کے لئے مصر روانہ ہوئے (۷) ساتویں قربانی عیال و اولاد کی دی۔ چنانچہ اپنی وفادار بیوی ہاجرہ کو جو مصر کی شہزادی تھی بمعہ اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کے خدا کے حکم کے بموجب اپنے آپ سے جدا کر کے حجاز کے ویران مقام پر بسا آئے۔ اور پھر چند سال بعد جب ملاقات کی غرض سے بیوی اور بچے کو ملنے تشریف لے گئے خواب میں الہام ہوا کہ بچے کی قربانی دو چنانچہ ارشاد ہے۔

آیت :- یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی اور پھر بیٹے کی دلیری دیکھئے عرض کرتا ہے۔ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ۔ اے باپ! آپ کو خدا

کا حکم پورا کیجئے : اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے ضرور صابر اور ثابت قدم پائینگے ۔ اور جب ابراہیم نے اپنے عزیز ترین چیز یعنی بیٹے کو زمین پر لٹایا اور اس کی گردن پر چھری رکھ دی ۔ تو عین اس وقت زمین و آسمان سے ایک صدائے وردناک بلند ہوئی ۔ وَ نَادَیْنٰہُ اَنْ یّٰاِبْرٰھِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا ۔ اے ابراہیم تو نے خواب کو سچا کر دکھایا اور پھر کیا ارشاد باری تعالے ہوتا ہے ۔ وَ فَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ۔ اور ہم نے اسے ایک بہت بڑا بدلہ دیا ۔ اور وہ کیا ؟ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ” ہم نے کہا اے ابراہیم ہم تم کو تمام بنی نوع انسان کا امام بناتے ہیں ۔

یعنی امامت انسان کو تب ملتی ہے جب انسان پہلے تمام بتوں کو توڑ کر موحد بن جائے ۔ پھر دین کی خاطر قومی محبت و تعصب کی قربانی دے پھر دین کے لئے رشتہ اور کنبہ پروری کی محبت کو ترک کر دے پھر جانی و مالی قربانی بھی دے پھر حکومت سے نڈر ہو کر حق کے لیے کھڑا ہو ۔ اور حدیث شریف کے مطابق افضل الجہاد کلمۃ الحق عند السلطان الجابر ۔ ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کرے ۔ پھر ملک وطن کی محبت کی قربانی دے یعنی دین کی خاطر خدا کی خاطر وطن ترک کرے یا تبلیغ دین کے لئے ہجرت کرے اور ساتویں قربانی اہل و عیال کی محبت کو دین پر قربان کر دے تب جا کر ایک قوم امامت کی صلاحیت پیدا کر سکتی ہے ۔ اور جبتک کسی قوم کے افراد میں

یہ صلاحیتیں موجود نہ ہوں وہ "لَا یَنَالُ عَهْدِی الظَّالِمِیْنَ" کے حکم سے نہیں نکل سکتی۔

غرض یہ ہے کہ امامت اور خلافت میں قدرت نے بنیادی فرق یہ رکھ دیا ہے کہ امامت کئی امتحانات کے بعد نصیب ہوتی ہے "ابتلیٰ" کی آیت نے ثابت کر دیا کہ ابراہیمؑ کا پہلے امتحان لیا گیا۔ آزمائشیں ہوئیں۔ پھر امامت کا منصب عطا کیا گیا۔ لیکن خلافت انسان کو پیدائشی عطا کی گئی ہے بلکہ پیدائش سے بھی قبل اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں۔ یعنی خلافت انسان کا پیدائشی ورثہ ہے۔ امتحان بعد میں ہوتا ہے۔

داؤد علیہ السلام کو خلافت دیتے وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا
يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (پ ۲۳ رکوع ۲) ترجمہ:۔ —— اور خود آدم علیہ السلام کا امتحان خلافت کے بعد ہی ہوتا ہے۔ وَقُلْنَا يٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ۔ الخ۔

ہاں انسانوں میں خلافت کے درجے ضرور مقرر ہیں۔ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ " اور تم میں سے بعض کو بعض پر زیادہ بلند درجے دیئے ہیں اور ان درجوں کا معیار قدرت نے

علم قرار دیا ہے۔ جیسے کہ طالوت کو خدا نے شموئیل پیغمبرؑ کے ذریعے بنی اسرائیل کے لئے بادشاہ مقرر کیا۔ اگرچہ وہ خاندان کا سب سے کمزور اور مفلس آدمی تھا۔ اسی لئے اس تقرر پر اُن لوگوں نے جن کو حضرت موسیٰؑ سے رشتہ تھا مخالفت کی۔ کہ نسب اور مال کے اعتبار سے ہم زیادہ حقدار ہیں۔ لیکن خدا نے فرمایا۔ کہ حکومت صرف اُس شخص کو دی جاسکتی ہے جس کو حکومت کرنے کا علم اور صلاحیت حاصل ہو لیاقت کو چھوڑ کر صرف دولت اور نسب دنیا کا انتظام چلانے کے لئے کافی نہیں۔

چنانچہ ارشاد ہوا۔ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ (البقرہ ع ۳۲)

ترجمہ: اور اُن کے نبیؑ نے اُن سے کہا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے "ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہوگا۔ اس کے مقابلے میں تو (نسب اور دولت کے لحاظ سے) بادشاہی کے ہم زیادہ حقدار ہیں وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی بھی نہیں ہے" نبیؑ نے جواب دیا

"اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلے میں اُسی کو منتخب کیا ہے اور اُس کو دانائی (علم) و جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسکو مناسب سمجھتا ہے دیتا ہے اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا ہے اور سب کچھ اُس کے علم میں ہے"۔ پس ثابت ہوا کہ خلافتِ ارضی کے لئے نہ نسب و دولت لازمی ہے اور نہ ہی زہد و عبادت کیونکہ نسب و دولت کے لحاظ سے تو موسیٰؑ کے رشتہ دار حکومت کے زیادہ حقدار اور مستحق تھے۔ اور زہد و عبادت کے لحاظ سے شموئیل پیغمبر۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حکومت کے چلانے کے لئے ان تمام چیزوں پر علم کو ترجیح دی کیونکہ حکومت کو چلانے کے لئے صلاحیت کی ضرورت ہے نہ کہ مال و نسب یا زہد و عبادت۔

معلوم ہوا کہ امامت علیحدہ چیز ہے اور خلافت علیحدہ ورنہ شموئیل نبیؑ کے ہوتے ہوئے دوسرے شخص کو بادشاہت کا کیا حق حاصل تھا؟ حالانکہ طالوت کے متعلق بھی ایسی کوئی تصریح قرآن یا حدیث میں موجود نہیں کہ وہ نبوت کے منصب پر بھی فائز تھے بلکہ محض بادشاہی کے لئے نامزد کئے گئے تھے۔ جس کی وجہ محض علمِ سیاست سے واقف ہونا تھا اور بس۔

بعینہ یہی جواب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی پیدائش سے قبل فرشتوں کو دیا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے "وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ط قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ o الخ

(البقرہ ع ۴) اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں" انہوں نے عرض کیا "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں، جو اس میں فساد مچائیگا اور خونریزیاں کرے گا؟ حالانکہ ہم تو آپ کی حمد وثنا، تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں" فرمایا "میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔"

ہوسکتا ہے کہ اس فقرے سے فرشتوں کا مدعا یہ نہ ہو کہ انہیں خلافت دی جائے۔ یا حمد و ثنا، تسبیح و تقدیس بیان کرنے کی وجہ سے وہ اس تقرر کے زیادہ مستحق ہیں۔ مگر انسان کو سفاک اور فسادی بتلانا، اور اپنا تقدس پیش کرنا، یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ خلافت کے لیے بھی امامت کی طرح صرف تقدس ہی کو لازم سمجھتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دلیل کو رد کر دیا۔ نہ اللہ تعالیٰ نے نہ تو انسان کے سفاک اور فسادی ہونے کی تردید فرمائی اور نہ ہی دنیا کے نظم و خلافت کو چلانے کے لیے فرشتوں کی تسبیح و تحمید اور تقدیس بیان کرنے کو کافی سمجھا۔ بلکہ فرمایا کہ "خلافت ارضی کو چلانے کے لیے انسان کو جو چیز درکار تھی میں نے اسے عطا کر دیا ہے۔"

وہ تم میں نہیں ہے۔ اور اس کو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ "اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب فرشتوں کو یہ معلوم تھا کہ انسان زمین میں فساد مچائے گا اور خونریزیاں کرے گا تو کیا انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ان انسانوں میں پیغمبر اور امام بھی آئیں گے جو متاع اخلاق کے مالک بھی ہوں گے زاہد و عابد بھی ہوں گے؟ ضرور معلوم تھا۔

پس معلوم ہوا کہ اگر ایک شخص فرشتوں کی طرح عابد، زاہد، پرہیزگار، اللہ تعالے کی تسبیح تحمید اور تقدیس بیان کرنے والا کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر وہ دنیاوی نظام کو چلانے کے علوم کا مالک نہیں تو وہ خدا کا ایک نیک بندہ تو ضرور بن سکتا ہے۔ لیکن خلافت (حکومت) کا حقدار ہرگز نہیں چاہے وہ اعلیٰ نسب ہی کیوں نہ ہو۔

ہاں البتہ اسلام نے ہمیں یہ بتلایا ہے۔ کہ خدائی خلافت (حکومت) کے لئے ایمان شرط ہے۔ اور تمکن فی الارض کا خداوندی وعدہ بھی اُن لوگوں سے کیا گیا ہے جو ایمان رکھتے ہیں کیونکہ انسان کی پیدائش کا اصل مقصد خداشناسی اور خدارسی ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے "وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ط وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ○

(۲۴ : ۵۵) ترجمہ: تم میں سے جن لوگوں کا ایمان سچے دل سے قائم رہا اور جنہوں نے اس کے علاوہ نیز دین سے اعمال صالحہ کیے اُن سے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا وعدہ ہے کہ وہ اُنہیں زمین میں قیام عطا فرمائے گا جیسے اُن لوگوں کو قیام عطا فرمایا تھا جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں، وہ اس دین کو جو اُس نے ان کے لئے پسند کیا ہے جما کر رہے گا اور بعد ازاں اُس خوف کو جو انہیں دشمن سے لاحق ہے امن سے بدل دیگا۔ ان کا مسلک عمل یہ ہے کہ میرے غلام بنکر میرے حکموں پر چلتے رہیں (یَعْبُدُوْنَنِیْ) اور اطاعت گزاری میں کسی دوسری شئے کو میرے ہم مقام نہ کریں۔ (لا یشرکون بی شیئاً) اور جنہوں نے اس تمکن اور قیام کے بعد اطاعت احکام سے انحراف کیا، اور اپنی بداعمالیوں کے باعث اس نعمت عظمیٰ کی بے قدری کی (کَفَرَ) تو وہی فاسق ہیں (اور وہی اجتماعی ہلاکت کے اہل ہوں گے۔ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُوْنَ (۴۶ : ۳۵)

علامہ مشرقی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تصنیف "تذکرہ" کے مقدمہ میں آیات مذکورہ کے متعلق لکھتے ہیں: "یہ شارع قدرت کا حتمی میثاق نہ صرف اسلام بلکہ تمام اقوام عالم کی حیات و ممات

کا مکمل اور آخری فیصلہ ہے۔ قرآن کریم کی حجت بالغہ "اور شریعت خدا کی حکمت جامعہ و بالغہ، جہد للبقا اور بقا و منہ للنفس کے اُس طبعی نتیجے پر تیرہ سو برس پہلے پہونچ چکی ہے۔ جو فلسفہ دان فارابی، ہیکل، اور ڈارون کے مسئلہ ارتقاء و انتخاب طبیعی کی اصطلاح میں "بقائے اصلح" کے نام سے مشہور ہے۔ اس آیت کریمہ میں دو باتوں کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اولاً یہ کہ "استخلاف فی الارض" یعنی بقا و استبقاء کے لیے ایمان شرط ہے۔ اور اللہ کا وعدہ اُن ہی لوگوں سے کیا گیا ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ ایمان کے ہوتے ہوئے اعمالِ صالحہ کا اکتساب لازمی امر ہے جس جماعت کے افراد میں یہ دونوں باتیں موجود ہوں وہی اصلح ہے، اُسی کی صیانت اور سلامتی کا ذمہ قانونِ فطرت نے اپنے اوپر لیا ہے قرونِ ماضیہ کی اقوام متمدنہ کی طرح اُسکا غلبہ اور استخلاف قائم رہے گا جب تک ایمان اور صلاحیت عمل اُن میں باقی رہے۔ اور فسق و کفر کی حد تک نہ پہنچیں۔"

علامہ موصوف صاحب بقاء و استبقا کے تحت الملتق میں آگے لکھتے ہیں: "استخلاف کے ان معانی کی جتنی تائید قرآنِ عظیم کی دو اور آیتوں سے ہوتی ہے۔ جن کے نفس موضوع کا مقابلہ سورۂ ہود کی آیت ۵۱! سے ہم نے کرنا چاہیئے

تو یہ یوں ہے: "إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۹ : ۳۹) اگر (اے عافیت پسند لوگو!) لڑائی کے واسطے ہمت مستعد نہ ہوئے، تو خدا تم کو دردناک سزا دے گا اور تمہارے سوا کسی دوسری مستقل قوم کو تم سے بدل دے گا۔ اور وہ اس قدر صاحب قوت ہوں گے کہ تم ان کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے اور یاد رکھو کہ خداوند بے نیاز خدا ہے کہ وہ ہر بات کر سکتا ہے۔ اور سورۂ محمد میں بھی یستبدل، یستخلف کے معانی میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہے: "وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم (۴۷ : ۳۸) یعنی اگر تم نے ان احکام سے سرتابی کی تو کچھ پروا نہیں وہ خدائے عظیم تمہارے سوا کسی اور قوم کو تمہاری جگہ لا بٹھائے گا۔ پھر وہ تم جیسے بدعمل، نافرمان اور نفس پسند بھی نہ ہوں گے۔"

علامہ موصوف صاحب آگے لکھتے ہیں: "ان آیات الٰہی سے صاف ظاہر ہے کہ استخلاف اقوام در اصل ان کا استبدال ہی ہے۔ جو قوم بادشاہت زمین کی اہل نہ رہی جو قانون خدا سے سرتابی کرنے کے باعث اپنی قوت اور صلاحیت کھو چکی اس کا اس کی زمین پر سے بیک بینی و دوگوش نکالا جانا لازمی تھا

جو وارث نہیں ہے ۔ وہی مستخلف ہے۔ وہی ناقابلِ عزل اور قوی تر ہے ۔ اور اُس کا اس دنیا پر باقی رہنا طے شدہ امر ہے "

یہاں اللہ تعالیٰ نے احکام خداوندی کی پیروی نہ کرنے اور انہیں رائج کرنے کے لئے جدوجہد نہ کرنے کو جرم بتلا کر خلافت کے چھین لینے کی دھمکی دی ہے ۔ معلوم ہوا کہ قوم کی صلاحیت یہ ہے کہ وہ احکام خداوندی (دین فطرت) کی فرمانبرداری کرتی رہے اور پھر ان احکام کو نافذ کرنے کی جدوجہد بھی ۔ بس یہی دو چیزیں ایمان اور عمل صالح ہے اور انہی دو چیزوں کو تازہ کرنے کے لئے نبی یا امام آیا کرتے ہیں ۔

ان آیات کی روشنی میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت قوموں کو اُن کے اعمال صالحہ کے باعث تو ملا کرتی ہے ۔ لیکن کسی خاص فرد کے لئے مخصوص نہیں ۔

داؤد علیہ السلام کو بھی خلافت ارضی تب ہی نصیب ہوئی جب قوم نے جالوت کی حکومت کو ختم کرنے میں طالوت کا ساتھ دیا اور پھر جب داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا ۔ تو اُن کو اس بہادری کے صلے میں قوم نے اُن کو خلیفہ بنا لیا ارشاد ہے ۔ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ اور داؤد نے جالوت

قتل کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کو چاہا اس کو علم دیا۔ اور اس طرح جب اللہ تعالیٰ نے یہ دیکھا کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری تن دہی اور جانفشانی و صداقت کے ساتھ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّہُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ الخ یہ بعینہ ایسا وعدہ ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو خلافت کا وعدہ دیا گیا تھا۔ اور جیسا کہ انکو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے فرمایا تھا۔ قَالَ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّہْلِکَ عَدُوَّکُمْ وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ۔ اسی طرح اصحاب رسول کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرما دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ عنقریب تمہیں زمین کی خلافت عطا کریگا (وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ

بایں ہمہ حضرت جنید بغدادیؒ اور خواجہ معین الدین اجمیری اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں کہ ہر خلافت کی دو قسمیں ہیں (۱) خلافت کبریٰ اور (۲) خلافت صغریٰ خلافت کبریٰ جو ظاہری ہے وہ بہ اجماع امت خدا اور رسول کی حکم کے مطابق سر حلقہ اولیاء حضرت علی المرتضیٰ سے متعلق ہے اور خلافت صغریٰ جو ظاہری ہے آپکی

باب میں امت کے درمیان اختلاف ہے۔

لیکن اگر ہم آیۂ استخلاف سے مراد علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت لے لیں۔ اور ان احادیث کو اس کے لئے حجت بنالیں۔ جو آئمہ اثنا عشرہ کی خلافت و وراثت نبوت کے متعلق کتابوں میں آئی ہیں

تو اس طرح خلفاء ثلاثہ کے عہد خلافت کو اس آیت کی تحت سے نکالنا ہوگا۔ اور اگر ہم نے خلفائے ثلاثہ کے عہد خلافت کو اس آیت کی تحت سے نکال باہر کیا تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ وعد اللہ الذین امنوا۔ کا ایفا ابھی تک نہیں ہوسکا ہے۔ کیونکہ اس وعدہ استخلاف کے ساتھ۔ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا کا وعدہ بھی ہے۔ جس کا اطلاق خلیفۂ اول و دوم کی عہد خلافت اور خلیفۂ سوم کی چھ سال تک کی عہد خلافت کے سوا کسی اور وقت ہو ہی نہیں سکتا تاریخ گواہ ہے کہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنی عہد خلافت میں ایک دن بھی امن اور چین نصیب نہ ہوسکا ہے اور نہ امام حسن علیہ السلام کو اپنی ششماہی عہد خلافت میں امن وسکون نصیب ہوسکا ہے۔ بلکہ خلافت سے دستبردار ہونے کے بھی ظالموں کے ہاتھوں زہر دیکر شہید کئے گئے۔ ... امام حسین علیہ السلام کو میدان کربلا میں جس بے دردی اور ظلم کے ساتھ شہید کیا گیا ہے۔ اس پر تاریخ کے اوراق آج تک خون کے

آشوب رہے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس تمام آئمہ اہل بیت رضوان
اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ وہ
اپنے زمانے کے تمام لوگوں سے علم نبوت کے زیادہ عالم زیادہ
بزرگی والے زیادہ پرہیزگار اور زیادہ متقی تھے۔ لیکن انکی
زندگیاں مصیبت و آلام ہی میں گذری ہیں۔ بلکہ ان حضرات
میں اکثر حکومت و سلطنت سے بھی محروم رہے ہیں۔

خود حضرت مہدی علیہ السلام کے متعلق حدیثوں میں آیا ہے
کہ ان کے ظہور کے ساتھ نزول عیسیٰ بھی وابستہ ہے اور حکومت
اس وقت بھی عیسیٰ ہی کے ہاتھ دی جائیگی۔

معلوم ہوا کہ استخلاف فی الارض اور تمکن فی الارض
کی آیت تمام مومنین کی شان میں نازل ہوئی تھی نہ کہ صرف آئمہ
اہل بیت کے حق میں۔ اور یہ احادیث خلافت بھی دراصل بمعنی
وراثت و محافظ دین کے ہے نہ کہ بمعنی حکمران کے۔ علامہ شیخ
سلیمان بلخی القندوزی مفتی اعظم قسطنطنیہ اپنی مشہور عالم کتاب
ینابیع المودہ میں لکھتے ہیں "بہت سے محققین کہتے ہیں کہ احادیث
مشتمل بر اینکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد آپ کے
بارہ نائب و خلفاء ہونگے۔ بہت سے طریقوں کے ساتھ شہرت
پکڑ گئی ہیں اور ان شارحین نے کہا ہے اور ان کی تصنیف اور زمانہ
اختتام کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی ہے۔ اس

معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد اس حدیث سے آنحضرت کی ذریت و عترت کے بارہ امام ہیں کیونکہ آپ کے اصحاب ثلاثہ جو آپ کے بعد یکے بعد دیگرے خلیفہ ہوئے ہیں وہ اپنے قلت تعداد کی وجہ سے اس حدیث کے مصداق نہیں ہیں اور یہ حدیث بنو امیہ کے بادشاہوں پر بھی حاوی نہیں ہوتی کیونکہ ان کی تعداد بارہ سے زیادہ ہے۔ اور سوائے عمر ابن عبدالعزیز کے وہ سب ظلم اور فحش کے مرتکب ہوتے تھے۔ اور یہ بھی وجہ ہے کہ وہ سب بنو ہاشم میں سے نہ تھے کیونکہ جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں جو جابر سے مروی ہے یہ شرط ہے کہ وہ سب بنو ہاشم ہونگے اور یہ بھی ممکن نہیں کہ اس حدیث کا اطلاق ثانیاً بنو عباس پر ہوسکے کیونکہ وہ بارہ سے زیادہ تھے۔ اور آیہ مودہ میں شریک نہ تھے۔ لہذا اب ثابت امر یہ ہے کہ یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عترۃ و اہل بیت کے بارہ اماموں پر ہی منطبق ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اپنے زمانہ کے تمام لوگوں سے زیادہ عالم، زیادہ بزرگی والے، زیادہ پرہیزگار اور متقی تھے۔ اور نسب وحسب میں ان سب سے زیادہ بڑھ کر تھے اور خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم اور ان کے علوم اپنے آباؤ اجداد کے سلسلہ سے براہ راست ان کے جد معظم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان تک پہونچے ہوئے تھے

یہ علوم ان کو وراثتاً بھی حاصل ہوئے اور لدنی بھی تھے۔ یہ سب واقعات اس امر کے
مؤید ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد اپنے اہل بیت و ذریت و عترت
کے بارہ اماموں اور حضرت جابر ابن سمرہ کی روایت میں جو الفاظ مزید ہیں کہ تمام
امت ان پر مجتمع ہو جائے گی تو اس سے آنحضرتؐ کی مراد یہ تھی کہ جناب قائم
آل محمد امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے وقت، تمام امت ان سب کی
امامت کی قائل ہو جائے گی۔

غرض حدیث خلفاء اثنا عشرہ سے آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد
بارہ امام ہیں نہ کہ بارہ خلیفہ۔ امام مامور من اللہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے: "قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا" میں تجھے انسانوں کا
امام بناتا ہوں۔ رسول کو رسول کے نام سے خطاب کیا گیا ہے۔ یعنی امر کا
رسول۔ لیکن خلیفہ کو اولی الامر منکم فرمایا یعنی جو تم میں سے
صاحب امر ہو اور امر کو شوریٰ کے سپرد کر دیا۔ ارشاد ہے: وامرھم
شوریٰ بینھم۔ جب امر شوریٰ ہے تو صاحب امر بھی شوریٰ ہی
سے منتخب کیا جائے گا۔ اور اسلام نے یہیں بتلایا ہے کہ اگر رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم بھی حکمران کی حیثیت اختیار کریں گے تو بیعت لے کر
اختیار کریں گے۔

ماہ ذی قعدہ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بقصد عمرہ مدینہ
سے مکہ کو روانہ ہوئے مہاجرین و انصار کا ایک گروہ آپ کے ہمراہ تھا
کل تعداد چودہ پندرہ سو تھا۔ آپ نے اپنی روانگی سے پہلے قربانی کے جانوروں

کو آگے روانہ کر دیا تھا۔ اور مدینہ منورہ ہی سے احرام باندھ لیا تھا۔ لیکن قریش مکہ خبر پاتے ہی آپؐ سے لڑنے اور بیت اللہ کی زیارت سے روکنے پر تل گئے۔ اور خالد بن ولیدؓ کو ایک دستہ سواروں کے ساتھ کراع الغمیم کی طرف بڑھایا۔ یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس وقت پہنچی جبکہ آپ عسفان میں پہنچ گئے تھے۔ آپ نے اسی مقام سے معمولی راستہ چھوڑ کر ثنیۃ المرار کا راستہ اختیار کیا۔ رفتہ رفتہ مقام حدیبیہ میں پہنچے۔ خالد ابن ولید کو جب یہ اطلاع ہوئی تو وہ مکہ کو واپس ہو گئے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار قریش میں نامہ و پیام شروع ہوا۔ عثمان بن عفانؓ ان دونوں میں سفارت کا کام دے رہے تھے۔ اتفاقاً مکہ سے واپسی میں ان کو کچھ تاخیر ہوئی اور یہاں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ مشرکین نے ان کو شہید کر ڈالا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر برہم ہوئے اسی وقت مسلمانوں کو طلب کر کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کفار مکہ سے لڑنے مرنے اور لڑائی سے نہ بھاگنے کی بیعت لی اور اپنے داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر مارا اور فرمایا کہ یہ بیعت عثمانؓ کی جانب سے ہے۔ چنانچہ پ ۲۶ س الفتح ع ۳ آیت ۱۸ میں ارشاد ہے۔ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا۔

بالتحقیق اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے راضی ہوا جبکہ یہ لوگ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے دلوں میں جو (جذبہ) تھا۔ اللہ تعالیٰ کو وہ بھی معلوم تھا۔ سو اللہ تعالیٰ نے انہیں اطمینان پیدا کر دیا اور ان کو

ایک مگتے ہاتھ فتح دیدی۔

اسی بیعت کو بیعت رضوان کہتے ہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بیعت لینے کی کیا ضرورت تھی۔ حکم ہی دے دیتے کیا رسول ؐ کا حکم کافی نہ تھا؟ معلوم ہوتا ہے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام مدینہ منورہ سے ایک رہنما کی حیثیت سے چلے تھے اور عمرہ کرنے کی نیت سے لوگ ان کے ہمراہ چلے تھے اب جب جنگ کرنے کی نوبت آئی۔ تو آپ ؐ کی حیثیت رہنما کی بجائے حکمران کی ہو گئی اس لئے آپ ؐ نے لوگوں سے بیعت لی کہ جب میں تمہیں لڑنے اور مرنے مارنے کا حکم دوں تو تم اطاعت کرو گے یا نہیں؟۔

جو لوگ خلفاء ثلاثہ کو انتخاب سے چنا ہوا خلیفہ تصور کرتے ہیں اور انکی خلافت کا انکار کرتے ہیں۔ تو کیا اگر حضرت علی رضؓ اول خلیفہ چنے جاتے تو اسی جمعیت کے ووٹوں سے نہ چنے جاتے جس نے خلیفہ اول و دوم کو چنا تھا؟ بلکہ ہوا بھی ایسا کہ آپ اسی جمعیت کے ووٹوں سے خلیفہ بنے ہیں جنہوں نے خلیفہ اول (حضرت ابابکر صدیق رضؓ) اور خلیفہ دوم (حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو چنا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے خطبات نہج البلاغت میں ارشاد فرمایا ہے۔ کہ مجھے تو انہی لوگوں نے خلیفہ چنا ہے جنہوں نے خلیفۂ اول اور خلیفۂ دوم کو چنا تھا۔ فرماتے ہیں کہ اگر اصحاب بدر بیعت رضوان کے صحابہ اور مہاجر و انصار صحابہ مجھے مجبور نہ کرتے اور میرے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے تو میں ہرگز خلافت کو قبول

نہ کرتا۔ معاویہ کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں "مجھ سے انہی لوگوں نے بیعت کی ہے۔ جنہوں نے ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ سے بیعت کی تھی۔ لہٰذا نہ تو حاضر کے لئے حق باقی رہ گیا ہے۔ کہ بیعت میں اختیار سے کام لے اور نہ غیر حاضر کو حق ہے کہ بیعت سے روگردانی کرے۔ شوریٰ تو صرف مہاجرین و انصار کے لئے ہے اگر انہوں نے کسی آدمی کے انتخاب پر اتفاق کر لیا اور اسے امام قرار دے دیا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی اور پوری امت کی رضامندی کے لئے کافی ہے۔ اب اگر امت کے اس اتفاق سے کوئی شخص اعتراض یا بدعت کی بناء پر خروج کرتا ہے۔ تو مسلمان اسے حق کی طرف لوٹا دیں گے۔ جس سے وہ خارج ہوا ہے۔ انکار کرے گا تو اس سے جنگ کی جائے گی۔ کیونکہ اس نے مومنوں کی راہ سے کٹ کر الگ راہ اختیار کی ہے۔ اور خدا اسے اس کی گمراہی کے حوالے کر دیگا اور اے معاویہ! میں قسم کھاتا ہوں۔ کہ اگر تو نفس سے ہٹ کر عقل سے کام لے گا۔ تو مجھے عثمانؓ کے خون سے بالکل بری الذمہ پائیگا۔ اور جان جائے گا کہ میرا اس خون سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تو اپنے مطالب کے تہمتیں تراشے غیر جو کرنا چاہے کرتا رہ۔ والسلام"

تاریخ گواہ ہے کہ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ معاویہ کے مقابلہ میں جنگ کے لئے نکلتے ہیں تو ان کے ہمراہ ستر بدری صحابہ، سات سو بیعت رضوان کے صحابہ اور چار سو عام مہاجر و انصار صحابہ بھی تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر صحابہ کرام کی یہ جمعیت جنہوں نے خلیفۂ اول و دوم کو چنا۔ خدانخواستہ غلط کار تھی، ان کا چناؤ غلط تھا، تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس شوریٰ کو کیوں قبول فرمایا؟ اور کیوں ان کی بیعت کو حجت بنا کر پیش کرتے رہے؟

اصل واقعہ یوں ہے کہ قبیلۂ قریش حسب و نسب کے اعتبار سے قبائل عرب میں ممتاز اور سیاسیات عرب میں ایک امتیازی مقام رکھتا تھا۔ اس قبیلہ کی دس شاخیں تھیں۔ بنی ہاشم، بنی امیہ، بنی مخزوم، بنی اسد، بنی سہم، بنی نوفل، بنی تیم، بنی عبدالدار، بنی جمح اور بنی عدی — ان خاندانوں میں بنی ہاشم اور بنی امیہ بڑی عظمت کے مالک تھے۔ بنی ہاشم خانۂ کعبہ کے متولی اور اچھے منتظمین مملکت تھے اور بنی امیہ کے ہاتھ میں عبدشمس کے دور سے قریش کی فوجی کمان تھی۔ یعنی بنو ہاشم انتظامی امور میں فوقیت رکھتے تھے۔ اور بنو امیہ فوجی برتری کے مالک تھے۔ نبوت سے پہلے جو جنگیں عکاظ، ذات نکیف اور فجار وغیرہ ہوئی ہیں، ان میں فوج کی کمان امیہ کے لڑکے حرب کے ہاتھ میں تھی۔

عبد مناف کے بیٹوں میں ہاشم اور عبدشمس بڑی وجاہت کے مالک تھے۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ انہی دو بھائیوں کی اولاد ہیں۔ عبدشمس کے لڑکے امیہ ابن شمس کے نام سے امیہ خاندان چلا ہے۔ اور ہاشم کے نام سے بنو ہاشم کا خاندان چلا آرہا ہے۔ لیکن دونوں خاندانوں

میں شروع سے چشمک چلی آتی تھی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنو ہاشم میں پیدا ہوئے تو آپؐ کی نبوت سے بنو ہاشم کا پلہ بھاری ہوگیا۔ یہ چیز بنو امیہ پر شاق گذری چنانچہ انہوں نے بڑی شدومد کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو ناکام بنانے کی کوشش کی بنو امیہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس مشن کے خلاف فوجی تحریک چلائی جس کی کمان حرب بن امیہ کے بیٹے ابوسفیان کے ہاتھ میں تھی۔ ابوسفیان، معاویہ کا والد اور یزید کا دادا تھا۔ غزوۂ احد ۳ھ اور غزوۂ احزاب ۵ھ وغیرہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ٹکر لی۔ ۸ھ میں (فتح مکہ) کے وقت ابوسفیان مع اپنے بیٹے معاویہ کے مسلمان ہوئے۔ گو ۲۱ سال میں اسلام کی عداوت، مدینہ پر بار بار یورش، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی خفیہ سازش اور قبائل عرب میں اسلام کے خلاف اشتعال پھیلانے کے جرم اتنے سنگین تھے کہ اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کوئی اور فاتح ان کو اتنی تکلیفوں کے بعد فتح کرتا۔ تو وہ کم از کم ابوسفیان اور ان کے خاندان کے ٹکڑے اڑا دیتا۔ لیکن یہ رحمتہ اللعالمین کی شان تھی کہ آپ نے ابوسفیان کو نہ صرف معاف ہی کر دیا۔ بلکہ اعلان کر دیا کہ جو بھی ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے اسے پناہ مل جائے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس رویہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی ہاشم اور بنو امیہ کے خاندان میں جو برسوں سے چشمک چلی آرہی تھی وہ باہم میل و محبت کی وجہ

سے ختم ہو گئی۔ لیکن چونکہ بنو امیہ کے افراد شروع سے فوجی افسر چلے آئے تھے اس لئے وہ یہ سمجھتے تھے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد عرب کی حکمرانی انہی کو ملنی چاہیے ہے۔ لیکن اس راستے میں اگر ان کو کوئی رکاوٹ نظر آتی تھی۔ تو وہ علی کرم اللہ وجہہ کی ذات تھی۔ کیونکہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام وقتاً فوقتاً علی کرم اللہ وجہہ سے والہانہ محبت کا اظہار فرماتے تھے۔ اور اُن سے سرگوشیاں فرماتے تھے۔ یہ بات بنو امیہ کے بعض افراد کو شاق گزرتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جنگِ بدر میں بنو امیہ کے بڑے بڑے سرداروں کے سر اڑا دیئے تھے جس کا ذکر علی کرم اللہ وجہہ نے معاویہ کے نام ایک مکتوب میں خود فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔ " فانا ابوالحسن قاتل جدک وخالک واخیک شدخاً یوم بدر وذالک السیف معی وبذالک القلب القی عدوی۔" کیا تم بھول گئے کہ میں وہی ابوالحسن ہوں جس نے بدر کی لڑائی میں تمہارے نانا، ماموں اور بھائی کے سر اڑا دیئے تھے۔ وہی تلوار آج بھی میرے ہاتھ میں ہے۔ اسی دل کے ساتھ آج بھی دشمن کا سامنا کرتا ہوں۔" (نہج البلاغہ)

جنگِ بدر کے بعد بنو امیہ کے دلوں میں بنو ہاشم کے خلاف بغض و عداوت اتنی بڑھ گئی تھی۔ کہ جنگ احد میں ہندہ نے ایک ماہر تیر انداز غلام کو خاص اس کام پر لگا رکھا تھا۔ کہ وہ حضرت علیؓ یا امیر حمزہؓ کو اپنے تیروں کا نشانہ بنائے گا۔ چنانچہ جب حضرت امیر حمزہؓ

جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے چچا تھے۔ اُس غلام کے تیر کا نشانہ بنے۔ اور شہید ہو گئے تو ہندہ نے اسی پہ صبر نہ کیا۔ بلکہ حضرت شہید رض کا جگر پھاڑ کر ان کا کلیجہ نکال کر دانتوں سے چبایا۔ اور پھر اس پہ بھی اُس کا دل ٹھنڈا نہ ہوا تو ناک، کان کاٹ کر اُن کا حلیہ مبارک بگاڑا۔

لیکن فتح مکہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اخوت قائم کرنے کی خاطر سب سے پہلے اپنے چچا حضرت امیر حمزہ رض کے قاتلوں کو معاف کر دیا۔ یہ تھا اخوت کے علمبردار کی صداقت کا عملی نمونہ۔ لیکن کاش! کہ بنو امیہ کے افراد بھی اسی طرح صداقت سے اپنے مقتولوں کے خون کو بھلا دیتے جو کفر کی حالت میں مارے گئے تھے۔ لیکن امیر معاویہ کا حضرت علی رض سے بغاوت اور واقعہ کربلا نے دنیا کو بتلا دیا کہ بنو امیہ کے افراد کے دلوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اولاد علی رض کی عداوت ختم نہیں ہوئی تھی۔ خود رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بار بار اس بات کو محسوس کیا تھا۔ کہ بنو امیہ کے افراد اب بھی علی رض کے ساتھ کچھ نہ کچھ عداوت ضرور رکھتے ہیں۔ تب ہی تو رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بار بار یہ اعلان کرنا پڑا۔ من کنت مولاہ فعلی مولاہ[1]

---

[1] میں جس کا ولی ہوں علی بھی اس کا ولی ہے (یعنی جو مجھے اپنا دوست، رہبر اور والی بنانا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ علی رض کو بھی اپنا دوست رہبر اور والی بنا لے)

اور وقتاً فوقتاً یہ دعا فرماتے :۔ اللّٰھم وال من والاہ وعاد من عاداہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ واحب من احبّہ وابغض من ابغضہ واعز من اعزّہ واعن من اعانہ[1]

آخر وہ کونسی بات تھی کہ بار بار علیؓ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ اعلانات کرنے پڑتے ہیں۔ سوا اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دلوں سے بغض علیؓ کو مٹانا چاہتے تھے اور کیا وجہ تھی ؟

اور اس راز کو اگر کوئی شخص سمجھا ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سمجھے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ بنو امیہ کے افراد علی کرم اللہ وجہہ کی فضیلت اور برتری کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان باتوں سے الٹا برا اثر لیتے ہیں تب ہی تو آپؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے زیادہ سرگوشیاں نہ فرمایا کریں۔ کیونکہ بعض لوگ اس کو برا مناتے ہیں لیکن رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام جواب میں فرما دیتے کہ اس کا امر مجھے من جانب اللہ ہوا ہے۔

غرض یہی وہ اصل چیز تھی جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت میں

---

[1] اے اللہ تو اس کا ولی ہو جا جس کا علیؓ ولی ہو، اور اس کو دشمن بنا جو علی سے دشمنی کرے اور اس کی نصرت کر جو علیؓ کی نصرت کرے اور اس کو ذلیل کر جو علیؓ کو ذلت پہنچائے اور اس سے محبت کر جو علیؓ سے محبت رکھے اور اس پر غضب کر جو علیؓ پر غضب کرتا ہو اور اس کو عزت دے جو علیؓ کی عزت کرے اور اس کی اعانت کر جو علیؓ کی اعانت کرے۔

مانع تھی۔ حضرت عمر رضؓ سے دریافت کیا گیا۔ کہ آپ نے حضرت علیؓ کو کیوں خلیفہ نہ چنا۔ تو آپ نے یہی جواب دیا۔ کہ اگر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ چن لیتا تو مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو کہ آپس کی خانہ جنگی سے تباہ ہو جاتے۔ درحقیقت یہ سیاستِ فاروقی کا ایک کرشمہ تھا کہ انہوں نے ایک ایسے شخص کو خلیفہ چنا۔ جس پر نہ صرف مہاجر و انصار متفق ہو گئے تھے۔ بلکہ بنو امیہ کے افراد بھی ٹھنڈے پڑ گئے۔ غالباً حضرت زبیرؓ۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت ابو سفیانؓ کے شروع شروع میں بیعت نہ کرنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ یہ لوگ خود خلافت کے امیدوار تھے۔ گو بظاہر انہوں نے اس کا اظہار نہ کیا تھا۔ اور آثار و قرائن سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب امیر معاویہ ابن ابی سفیانؓ اور حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ نے حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے خلاف اس وقت بھی خروج کیا جبکہ آپ کی عمر ساٹھ سال کو پہنچ چکی تھی۔ تو کیا وہ ابتدا میں ابو سفیان کی موجودگی میں حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کو برداشت کر سکتے تھے جبکہ اس وقت حضرت علیؓ کی عمر صرف تیس سال کی تھی۔؟

علاوہ ازیں حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ منتخب نہ کرنے میں اللہ تعالیٰ کی ایک حکمت بھی مضمر ہے۔ کیونکہ اگر خلافت حضرت علیؓ کو مل جاتی۔ تو ایک طرف تو مخالفین اسلام کے ہاتھ اسلام کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کرنے کا حربہ ہاتھ آجاتا، کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

محض دنیا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد اپنے خاندان کے لئے حکومت حاصل کرنا تھی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر حضرت علی علیہ السلام ابتدا ہی میں خلیفہ مقرر ہو جاتے تو قیامت تک خلافت کے لئے بنو فاطمی کا ہونا لازمی قرار پا جاتا۔ اور اس طرح خلافت قیصریت اور کسرایت میں تبدیل ہو جاتی۔ جیسا کہ ابنو امیہ اور بنو عباس کے عہد خلافت میں ہوا۔ اور نہ صرف اسلام کا جمہوری نظریہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا۔ بلکہ ہر داعی حق کے لئے آل نبیؐ اولاد علیؓ کی حکومت کے خلاف آواز بلند کرنا محال ہو جاتا، چاہے وہ حکومت منہاج النبوۃ اور منہاج السنۃ سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہوتی۔ اور نتیجہ یہ ہوتا کہ خود بنو فاطمی بھی حکومت کی خاطر آپس میں لڑتے جھگڑتے جیسا کہ امامت کے لئے آپس میں لڑے اور امام غائب کی آڑ میں اسماعیلیہ اور باطنیہ جیسے کئی فرقے بن گئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بذات خود حضرت علیؓ کی فضیلت اور اہلیت خلافت کے منکر نہ تھے انہوں نے بار بار اپنے خطبوں میں اس بات کا اعلان کیا ہے کہ لوگو! تمہاری خلافت کے اصل اہل حضرت علیؓ ہیں۔ فضیلت علیؓ اور حب علیؓ کے متعلق حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کئی حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔ لیکن جب وہ ان کوششوں کے باوجود اس نتیجہ پہ پہنچے کہ بنی امیہ کے افراد کسی صورت میں بھی حضرت

علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے قائل نہیں ہوتے تو بالآخر ابوبکر صدیقؓ کو بھی مجبوراً یہ اعلان کرنا پڑا کہ میں تم پر ایک سخت مزاج اور تند خو شخص کو خلیفہ مقرر کرتا ہوں۔ تاکہ منافقین کو سر اٹھانے کا موقعہ نصیب نہ ہو سکے۔

اگر ہم ان حضرات کی زندگی کا بغور مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ اپنی ذات کے لئے نہ تھا۔ کیوں کہ انہوں نے اسلامی بیت المال کا ایک پیسہ بھی ضائع نہیں کیا۔ اور نہ ہی اپنے عیش و آرام کا سامان مہیا کیا بلکہ انہوں نے اپنے کپڑوں کو پیوند لگا لگا کر گذارہ کیا۔ اور یہ بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے اپنے خاندان کے لئے حکومت حاصل کرنا چاہی تھی۔ ورنہ اگر امیر معاویہ یزید جیسے فاسق و فاجر فرزند کے لئے لوگوں سے بیعت لے سکتا تھا تو حضرت عمر فاروقؓ اپنے صالح العمل فرزند عبداللہ کے لئے لوگوں سے بیعت نہیں لے سکتے تھے۔ جب کہ لوگوں نے ان کا نام بھی پیش کر دیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے جو کچھ کیا وہ اسلام کے لئے کیا مسلمانوں کی یکجہتی کی خاطر کیا۔ تاریخ گواہ ہے۔ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ہر دو خلفاء کے ساتھ ہر معاملہ میں پوری طرح تعاون کیا ہے تب ہی تو حضرت عمرؓ کو بار بار یہ کہنا پڑا "لولا علیؓ لھلک عمر" اور یہ دعا کرتے "لا بقیت لمعضلة لیس لھا ابوالحسن" میں باقی نہ رہوں اس مشکل کے لئے جس کے حل کرنے کے واسطے ابوالحسن (علی ابن ابی طالب) نہ ہوں

پس ہمارے نزدیک امامت اور خلافت دونوں اپنی اپنی جگہ برحق ہیں بلکہ اگر ہم ان کو خلافتِ کبریٰ اور خلافتِ صغریٰ کا نام دے دیں تو اور بھی بہتر ہوگا۔ کیونکہ اگر ایک طرف ہم انتظام داری اور قیامِ حکومت میں سیاستِ فاروقی رضؓ کے مدح خواں ہیں تو دوسری طرف ہدایت و ولایت اور روحانی قیادت کے لئے بابِ علمِ نبوت پر دستک دینا بھی لازمی ہے۔ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے کہ :۔

آنا المدینۃ العلم وعلی بابھا من اراد العلم فلیات الباب"

(میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے جو شخص علم کا طالب ہو اسے چاہیئے کہ دروازہ سے آئے) اور اس علم سے مراد علمِ نبوت اور حکمت ہے کیونکہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے :۔

عن ابی ذر غفاری رضؓ قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علیؓ باب علمی ومبین لامتی ما ارسلت بہ من بعدی حبہ ایمان وبغضہ نفاق والنظر الیہ رافۃ ومودتہ عبادۃ

(ترمذی) حلیۃ الاولیاء میں ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "علیؓ میرے علم کا دروازہ ہے اور میرے بعد میری امت کے واسطے اس چیز کا بیان کرنے والا ہے جس کے ساتھ مجھ کو بھیجا گیا ہے۔ (یعنی وہ میرے بعد احکام الٰہی کی تشریح و تفسیر کرنے والا ترجمانِ وحی اللہ ہے) اس کی دوستی و محبت ایمان کی نشانی ہے اور اس کی دشمنی نفاق ہے اور اس

کی طرف نظر کرنا مہربانی ہے اور اس کی مودت عبادت ہے ۱۱

ابن ابی الحدید معتزلی نے شرح نہج البلاغۃ (الجز الاول ص ۶) میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی افضلیت اور حقیقت پر نہایت عمدہ مضمون لکھا ہے۔ یہاں میں اس کے صرف علم کی فضیلت والے حصے کا مختصر ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں " میں کیا کہوں ایسے شخص کے متعلق کہ جس کی طرف تمام فضیلتیں جھکتی ہیں۔ اور تمام فرقے اس کی طرف منتہی ہوتے ہیں اور تمام گروہ اس پر ختم ہوتے ہیں۔ پس وہ تمام فضیلتوں کا سردار ہے۔ اور تمام فضائل کا لباس زیب تن کئے ہوئے ہے۔ ہر ایک شخص نے جس نے آپ کے کسی فضیلت کو حاصل کرنا چاہا۔ آپ ہی سے اس کو حاصل کیا اور آپ ہی کی پیروی کی اور آپ ہی کے نقش قدم پر چلا۔ اور تو جانتا ہے کہ اشرف العلوم علم الٰہیات ہے۔ کیونکہ علم کا شرف اس کے معلوم سے ہوتا ہے۔ اور علم الٰہیات کا معلوم یعنی خداوند تعالیٰ اشرف الموجودات ہے لہذا وہ اشرف العلوم ہوا۔

حالت یہ ہے کہ اس مضمون پر حضرت علیؑ کے کلام سے انتخاب کیا جاتا ہے آپؑ سے ہی نقل کیا جاتا ہے۔ اور اس علم کی انتہا آپؑ پر ختم ہوتی ہے۔ اور آپؓ ہی سے یہ علم شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ معتزلہ ہی اہل توحید و صاحب عدل اور ارباب نظر ہیں۔ اور ان میں سے جن سے لوگوں نے علم سیکھا وہ حضرت علیؑ کے شاگرد اور ان کے اصحاب تھے۔ ان میں سے سب سے بڑا واصل بن عطا

جو شاگرد تھا ابو ہاشم کا، ابو ہاشم شاگرد تھا عبداللہ بن محمد حنفیہ کا اور عبداللہ شاگرد تھا اپنے باپ محمد بن حنفیہ کا اور محمد بن حنفیہ شاگرد تھا حضرت علی علیہ السلام کا اور فرقہ اشعریہ کا یہ حال ہے کہ انہوں اپنا علم حاصل کیا ابو الحسن علی بن ابی الحسن علی ابن ابی بشر الاشعری اور وہ شاگرد تھا ابو علی الجبائی کا اور ابو علی معتزلہ کے مشائخ میں سے ہے : نتیجہ یہ ہوا کہ اشعریہ نے آخر کار معتزلہ کے استاد سے علم حاصل کیا ۔ اور وہ علی ابن ابی طالب ہیں ۔ اماميہ و زیدیہ کا حضرت علیؓ سے اخذ الٰہیات کرنا ظاہر ہی ہے ۔ دوسرے علوم سے علم فقہ نے لیجئے تو حضرت علیؓ فقہ کے اصلی بانی ہیں ۔ اسلام کا ہر ایک فقیہ حضرت علیؓ کا خوشہ چین ہے اور آپ کے فقہ سے مستفید ہوتا ہے ۔ اصحاب ابو حنیفہؒ ۔ یعنی یوسفؒ و امام محمدؒ وغیرہما نے ابو حنیفہؒ سے اخذ فقہ کیا ہے ۔ اور امام شافعیؒ کا فقہ بھی امام ابو حنیفہؒ کی طرف راجع ہوتا ہے ۔ اور امام احمد بن حنبلؒ نے امام شافعیؒ سے علم فقہ حاصل کیا ہے ۔ لہذا احمد بن حنبلؒ کا فقہ بھی امام ابو حنیفہؒ کی طرف راجع ہوتا ہے ۔ اور امام ابو حنیفہؒ نے علم فقہ حضرت امام جعفر صادق بن محمد باقر العلوم سے حاصل کیا ہے ۔ اور انہوں نے اپنے باپ سے اور آخر کار یہ اخذ علم فقہ حضرت علیؓ پہ منتہی ہوتا ہے ۔ امام مالک ابن انس نے ربیعہ الرائی سے علم فقہ حاصل کیا اور ربیعہ نے عکرمہ سے اور عکرمہ نے عبداللہ بن عباسؓ سے حاصل کیا اور عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت علیؓ کے قدموں میں اس

علم کو سیکھا۔ یہ کہہ بھی سکتے ہیں کہ چونکہ امام شافعیؒ نے امام مالکؒ سے فقہ سیکھا لہذا ان کا علم اس طرح سے بھی حضرت علیؑ پر منتہی ہوتا ہے پس ان چاروں فقہاء اسلام تک علم فقہ حضرت علیؑ سے پہنچا ہے شیعہ لوگوں کا علم فقہ حضرت علیؑ سے لینا تو ظاہر ہی ہے۔

اصحاب رسولؐ میں سے سب سے زیادہ فقہ جاننے والے عبداللہ ابن عباسؓ اور عمر ابن الخطابؓ تھے۔ اور ان دونوں کو علم فقہ حضرت علیؑ نے سکھایا ہے۔ عبداللہ ابن عباسؓ کا حضرت علیؑ سے علم فقہ حاصل کرنا تو ظاہر ہی ہے۔ اور حضرت عمرؓ کی نسبت یہ سب لوگ جانتے ہیں کہ بہت سے مسائل جو حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے روبرو پیش ہوتے تھے۔ اور وہ ان کو حل کرنے سے قاصر ہوتے تھے۔ تو حضرت علیؑ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے بار بار کہا "لولا علی لھلک عمر" اگر حضرت علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ اور فرماتے "لا بقیت لمعضلۃ لیس لھا ابو الحسن" (میں نہ باقی رہوں اس مشکل کے لیے جس کے حل کرنے کے واسطے ابو الحسن (علی ابن ابی طالبؑ) نہ ہوں)۔ اور فرماتے تھے کہ مسجد میں اگر علیؑ موجود ہوں تو ان کی موجودگی میں کوئی اور شخص فتویٰ نہ دیا کرے اس سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کا فقہ حضرت علیؑ پر منتہی ہوتا ہے۔ عوام و خواص نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ فرمایا آپؐ نے "اقضاکم علی والفقہاء ھو الفقہ فلو اذا فقھھم" کہ

تم سب میں سب سے زیادہ صحیح فیصلہ کرنے والے علی ابن ابی طالب ہیں اور تمام لوگوں نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ دعا نقل کی ہے جو آپ نے حضرت علیؓ کے حق میں ان کو یمن میں قاضی مقرر کرنے کے وقت فرمائی تھی: "اللّٰھُمَّ اھدِ قلبہٗ وثبّت لسانہٗ" اے اللہ اس کے دل کو ہدایت دے اور اس کی زبان کو صحیح کر۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے کبھی دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرنے وقت شک واقع نہیں ہوا۔

علوم میں سے علم تفسیر قرآن ہے۔ پس یہ علم بھی حضرت علیؓ سے لیا گیا ہے۔ اور ان سے ہی پھیلا ہے۔ اگر تم کتب تفاسیر کی طرف رجوع کرو گے۔ تو اس مقولہ کی صحت سے آگاہ ہو جاؤ گے۔ کہ تمام تفاسیر یا حضرت علیؓ سے روایت کی گئی ہیں یا عبداللہ ابن عباسؓ سے اور یہ ظاہر ہے کہ عبداللہ ابن عباسؓ نے علم تفسیر حضرت علیؓ کی خدمت میں رہ کر حاصل کیا تھا۔ اور وہ آپ کے شاگرد تھے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے علم کو حضرت علیؓ کے علم سے کیا نسبت ہے۔ تو عبداللہ ابن عباسؓ نے جواب دیا:

"فقال کنسبۃ قطرۃ من المطر الی البحر المحیط" کہ جو ایک قطرہ کو اس بارش عظیم سے ہوتی ہے۔ جو بحر محیط پر برسے۔

اور علوم میں سے ایک علم، علم طریقت وحقیقت اور احوال تصوف ہیں اور آپ لوگوں کو اس علم کا حال معلوم ہے۔ کہ تمام علاک...

اسلامیہ میں اس علم کے عالموں کا علم حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کی تشریح اچھی طرح علامہ شبلیؒ حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت سریؒ و ابو یزید بسطامیؒ و حضرت ابو محفوظ معروف کرخیؒ وغیرہم نے کی ہے۔ اور اس بات کے ثبوت کے لئے یہی ایک امر کافی ہے کہ تصوف کے تمام طریقوں کے لوگ حضرت علیؓ کے خرقہ کو شعار بناتے ہیں اور تمام اسناد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف لے جاتے ہیں اور حضرت علیؓ کے ان باقی علوم میں سے ایک علم النحو، زبان عربی ہے اور تمام لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت علیؓ ہی نے اس علم کو شروع و ایجاد کیا ہے۔ اور آپ نے ابو الاسود کو اس علم کے اصول و قواعد سکھائے چنانچہ آپ نے بتایا کہ ہر کلام تین چیزیں ہوتی ہیں۔ اسم، فعل، حرف اور کلمہ کی دو قسمیں ہیں معرفہ و نکرہ اور آپ نے وہ وجوہات و اسباب بھی بتائے جو اعراب پر اثر ڈالتے ہیں اور ان کو رفع و نصب، جر، جزم کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور جب تم قرات قرآن کی طرف رجوع کرو گے تو تم کو معلوم ہو گا کہ تمام ائمہ قرات مثلاً عمرو بن العلاء، عاصم بن ابی النجود وغیرہما تمام حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور ابو عبد الرحمن السلمی حضرت علیؓ کے شاگرد تھے، اور آپ سے علم قرات و قرآن اخذ کیا تھا۔ پس یہ علم بھی مثل دیگر علوم کے جن کا ذکر پہلے کیا گیا حضرت علی علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ غرض علم القرآن میں بھی اگر رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد کوئی قرآن

ناطق تھا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ قرآن تو حضرت علی علیہ السلام کی خاص دلچسپی کا مضمون تھا۔ تمام امت کو اس پر اتفاق ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات ہی میں حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ اور آنحضرت کے وقت کسی اور نے حفظ نہ کیا تھا۔[۱]

حضرت شیخ فریدالدین عطار تذکرۃ الاولیاء میں لکھتے ہیں کہ امام اعظم (امام ابوحنیفہ) امام جعفر صادق کے شاگردوں میں سے ہیں۔ اور امام شافعی اہل بیت کی مداحی پر فخر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ امام مذکور کا قول ہے۔ شعر

لو کان رفضاً حب آل محمد فلیشهد الثقلان انی رافضی

---

[۱] تاریخ الخلفا سیوطی، اسباب امالی اور تاریخ الخلفاء میں بھی ان روایات کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام ہی وہ شخص تھے جنہوں نے سب سے پہلے قرآن مجید کو جمع کیا تھا۔ اور یہ بھی ہے کہ انہوں نے قرآن کی ایک ایک آیت کا شان نزول اور مقام نزول اپنے پاس لکھ رکھا تھا۔ اور وہ اپنے خطبوں میں فرمایا کرتے تھے کہ پوچھو مجھ سے قرآن مجید کی ایک ایک آیت کے نزول کا وقت اور مقام۔
(غزالی)

ترجمہ:- (اگر آلِ محمدؐ رفض ہے تو دونوں عالم جن و انس گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں)

حضرت معروف کرخیؒ جو شیخنا سید محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ العزیز کے پیروں کے پیر ہیں۔ اور کئی ہزار ولی اللہ ان کے دامنِ دولت سے بہرہ یاب ہوئے ہیں۔ خود حضرت امام علی موسیٰ رضا علیہ السلام کے دربان تھے چنانچہ شاعر کہتا ہے ؎

"بحقِ شیخ دین معروف کرخیؒ کہ دربانِ علی موسیٰ رضا بود"

اور شجرۂ ارادت جس کو صوفیوں کی اصطلاح میں رابطۂ صوری کہتے ہیں حضرت شیخنا سید محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ العزیز نو واسطوں سے امام علی موسیٰ رضا علیہ السلام کے مرید ہیں۔ چنانچہ سوانح عمری حضرت غوث اعظمؒ از سیماب قریشی صفحہ ۳۰ اور "شجرۃ العلیۃ القادریہ" صفحہ ۱۷ میں آپ کا سلسلۂ طریقت اور خرقہ پوشی حسب ذیل ہے:-

جناب قطب العارفین و مرشد السالکین سید شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ نے اپنے شیخ حضرت قاضی ابی سعید المبارک المخزومی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور خرقہ حاصل کیا۔ اور انہوں نے حضرت شیخ ابوالحسن الہنکاری علی بن محمد القرشی قدس سرہٗ سے بیعت کی اور خرقہ حاصل کیا۔ انہوں نے اپنے شیخ حضرت ابی الفرح الطرطوسی قدس سرہٗ سے، آپ نے اپنے شیخ ابوالفضل حضرت عبدالواحد التمیمی

قدس سرہ سے۔ انہوں اپنے شیخ حضرت خواجہ ابی بکر عبداللہ الشبلی قدس سرہ سے، آپ نے اپنے شیخ حضرت خواجہ ابی القاسم جنید بغدادی قدس سرہ سے، انہوں نے اپنے شیخ حضرت سری السقطی قدس سرہ سے انہوں نے اپنے شیخ حضرت خواجہ معروف کرخی قدس سرہ سے اور آپ نے اپنے شیخ و امام قبلۃ الباطن ابی الحسن علی ابن موسیٰ رضا علیہ السلام سے اور حضرت علی موسیٰ رضا علیہ التحیۃ والثنا پانچ واسطوں سے سید شباب اہل الجنت و قرۃ عین اہل السنت حضرت امام حسین علیہ السلام شہید کربلا ابن سرور اولیاء حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا فرزند اور خلیفہ و امام ہے۔

حضرت علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ اپنی تصنیف کشف المحجوب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔ برادرِ مصطفیٰ و غریق بحر بلا و حریق نار ولا، مقتدائے جملہ اولیاء و اصفیاء ابوالحسن علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ او را اندریں طریقت شانے درجۂ رفیع بود۔۔۔ تا حدے کہ جنید گوید رحمۃ اللہ علیہ (شیخنا فی الاصول والبلاء علی مرتضیٰ) شیخ ما اندر اصول واندر بلاکشیدن علی مرتضیٰ است یعنی امام ما اندر علم طریقت و معاملات آں علی مرتضیٰ ست۔۔۔۔ اہل ایں طریقت اقتدا کنند بہ او اندر حقائق عبادات و دقائق اشارات و تجرید از معلوم دنیا و آخرت و نظارہ اندر تقدیر حق و لطائف کلام

دست بیشتر ازاں است کہ بہ عدد اندر آید"

غرض یہ بات روز روشن کی طرح عیاں اور اظہر من الشمس ہے کہ مسلمانوں میں جتنے آئمہ حضرات مجددین، علماء حق، پیران عظام اور اولیاء اللہ ہو گذرے ہیں ان سب کا توسل یا سلسلہ علم بحضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ اور سب کے سب علی مرتضیٰ کے محب و ثناء خواں ہو گذرے ہیں۔ تاریخ ہمیں کسی ایسے شخص کا حوالہ نہیں دے سکتی جو کرامت و ولایت کا حامل تو رہا ہو لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا محب و مدح خواں نہ رہا ہو۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو مشہور ہے کہ ان کا توسل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اصحاب کبار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے سخت پیرو اور معتقد تھے۔ اور چونکہ خلفاء ثلاثہ رضہ خود بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو طریقت و شریعت میں اپنا دلی تصدیق کرتے تھے۔ گو باوجود اس کے کہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہم بعض سیاسی تقاضوں کی بناء پر اجماع امت سے خلیفہ منتخب ہو گئے تھے۔ لیکن روحانی طور پر یہ ہر سہ حضرات علی مرتضیٰ سے متوسل تھے۔ اور اس کا وہ لوگوں کے سامنے بار بار اقرار بھی کرتے تھے۔ چنانچہ تفسیر ثعلبی میں براء ابن عازب سے روایت ہے کہ جب خم غدیر کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نے منبر پر تشریف لے جا کر فرمایا" من کنت مولاہ فہذا علیؑ مولاہ" یعنی جس کا میں مولا ہوں یہ علیؑ اس کا مولا ہے تو حضرت عمر ابن الخطابؓ نے فرمایا" یا علیؑ اصبحت مولائی ومولیٰ کل مومن ومومنۃ" یعنی اے علیؑ آپ کو مژدہ اور بشارت ہو کہ آپ میرے اور تمام مومن مردوں اور عورتوں کے مولا ہو گئے۔

ابن مسعودؓ سے منقول ہے کہ حضرت عمر ابن الخطابؓ فرماتے تھے" نعوذ باللہ من معضلۃ لیس لہا ابوحسن" ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اس مشکل قضیہ سے جس کے حل کرنے کے لئے ابوالحسنؑ موجود نہ ہو۔

اور معجم طبرانی، مستدرک حاکم، صواعق محرقہ اور بحر المعارف میں ابن مسعودؓ سے اور فصل الخطاب میں ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے" قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم النظر الی علی عبادۃ" حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علی مرتضیٰ کی طرف نظر کرنا عبادت ہے۔

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ جب کبھی بھی حضرت علی علیہ السلام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے آتے تو آپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے چہرے مبارک کو بہت زیادہ دیکھتے جب لوگوں نے استفسار کیا کہ آپ ان کو کیوں زیادہ دیکھتے ہیں؟

تو آپ نے مندرجہ صدر حدیث شریف پڑھی (ماخوذ از کوکب دری)
نیز صواعق محرقہ میں شعبی سے مروی ہے کہ ایک روز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی خلافت کے زمانے میں ایک جماعت کے ساتھ بیٹھے تھے کہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ تشریف لائے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کا استقبال کیا اور یہ کہا :-
"من اراد ان ینظر الی اعظم الناس منزلۃً واقربہ قرابۃ وافضلہ حالۃً عنا برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلینظر الی ھٰذا الطالع ۔ یعنی جو کوئی ایسے شخص کو .... دیکھنا چاہے ۔ جو مرتبہ میں سب آدمیوں سے بڑھ کر ہے اور ان کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب تر اور بلحاظ حالت کے ہم سب سے افضل ہو اس کو چاہیئے کہ وہ اس آنے والے یعنی علی مرتضیٰ علیہ السلام کی طرف نظر کرے ۔
لہذا حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت ابوبکر صدیق رض سے توسل بھی حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ پر منتہی ہوگا۔ کیونکہ خود حضرت محبوب ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے سب سے آخری مکتوب میں فرماتے ہیں ۔ "در راہ سلوک عبارت ازیں راہ است بلکہ جذبۂ متحارضہ نیز داخل ہمیں است۔ و توسط و حیلولت درین راہ کابن است و پیشوائے این راہ و سرگروہ اینہا و فیض این بزرگواران علی مرتضیٰ است کرم اللہ وجہہ الکریم ۔ واین منصب

عظیم تعلق بایشاں دارد۔ دریں مقام گویا ہردو قدم مبارک آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام بر فرق مبارک اوست کرم اللہ وجہہ حضرت خاتون جنت قبات و حضرات حسنین علیہم السلام دریں مقام بایشاں شریکند۔ انگارم کہ حضرت امیرؓ قبل از نشاء عنصری نیز ملاذ این مقام بودند۔ ہرکرا فیض و ہدایت برسید بتوسط ایشاں می رسید۔ چہ ایشاں نزد نقطہ منتہائے ایں راہ اند۔ و مرکز ایں مقام بایشاں تعلق دارد چوں دورہ حضرت امیر تمام شد۔ ایں منصب عظیم القدر بحضرات حسنین ترتیباً مفوض و مسلّم گشت و بعد از ایشاں بہ ہریکے از ائمہ اثنا عشر علی الترتیب والتفصیل قرار گرفت و در اعصار ایں بزرگواراں و ہم چنیں بعد از ارتحال ایشاں ہرکرا فیض و ہدایت می رسید بتوسط ایں بزرگواراں بودہ و بحیلولت ایشاں ہرچند اقطاب ...... وقت بودہ باشند و ملاذ و ملجاء ہم ایشاں بودہ اند۔ چہ اطراف را غیر از لحوق بمرکز چارہ نیست۔ تا آنکہ نوبت بہ شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسید۔ چوں نوبت ایں بزرگوار شد۔ منصب مذکور باو رضی اللہ تعالیٰ عنہ مفوض گشت، و مابین ائمہ مذکورین حضرت شیخ ہیچ کس بریں مرکز مشہود نمی گردد و وصول فیض و برکات دریں راہ بہ ہرکہ باشد از اقطاب و نجباء بتوسط شریف رضی اللہ تعالیٰ عنہ مفہوم میشود چہ ایں مرکز بغیر او را میسر نہ شد۔ ازینجا است کہ فرمودہ ؎

افلت شموس الاولین و شمسنا ۔۔۔ ابداً علی افق العلا لا تغرب

ترجمہ:- ہم سے جو پہلے تھے ان کے آفتاب غروب ہو گئے اور ہمارا آفتاب ہمیشہ بر تر ہستی پہ چمکتا رہے گا، ڈوبنے کا نہیں۔

غرض ان تمام تاریخی شواہد اور اسناد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام آئمہ حضرات مجددین اور اولیاء اللہ بالاتفاق حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی روحانی قیادت، علمی فضیلت اور امامت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور اگر ان حقائق کے باوجود کوئی شخص حضرت علی علیہ السلام کی امامت اور روحانی قیادت سے انکار کرتا ہے تو وہ دو باتوں سے خالی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اول یہ کہ وہ اپنی جہالت کی وجہ سے کسی ضد اور ہٹ دھرمی کا شکار ہے۔ دوئم یہ کہ وہ سورج کو دو انگلیوں سے چھپانا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق حضرت قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین خواجہ معین الحق معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ " اگر سالک طریق طریقت مرتضیٰ علی علیہ السلام کی متابعت اور پیروی میں دل و جان سے رابطہ حقیقی اور واقعی تعلق نہ رکھتا ہو اگرچہ علم میں علامہ روزگار ہو جائے اور ہزار سالہ ریاضت اور مجاہدہ میں صرف کرے بیشک و شبہ اس کی جان کا طائر معرفت لاریبی کی خوشبو سے اور اس کے دل کی چشم دیدہ آنکھ شواہد غیبی کے مشاہدہ سے محروم و مجبور رہے گی " (گنج الاسرار)

پس خلافت اور امامت دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ خلافت نظم و نسق اور انتظام داری کو چلانے کا نام ہے۔ اگر یہ نظم و نسق

منہاج النبوۃ کے مطابق چلایا جائے اور پھر خلیفہ بھی کامل، اکمل،
بلکہ اکمل طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع ہو۔ جیسے کہ
صحابہ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت تھی۔ جنہوں نے خود رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تربیت حاصل کی تھی، تو اس کو خلافت
راشدہ کہا جا سکتا ہے۔ اور اگر خلیفہ میں اتباع رسول کامل طور پر موجود
نہ ہو۔ تو اس کی حکومت کو پھر بھی خلافت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ہاں البتہ
اسے خلافت راشدہ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن امامت ایک ایسی چیز ہے
کہ جس کے لئے تقویٰ شرط ہے۔ اور جو کہ اتباع اول کے بنا ملا کرتی ہے
اور امامت کے لئے حکومت بھی شرط نہیں جب تک کہ حکمران طبقہ
اسلامی شریعت کا پابند ہو۔ ہاں اگر حکومت فاجر و فاسق لوگوں کے
ہاتھوں میں آ جائے تو امام پر لازم ہے کہ یا تو اس حکمران کو راہ حق پر آنے
کی دعوت دے اور یا حسین علیہ السلام کی طرح اس کے خلاف علم جہاد
بلند کر دے۔ کیونکہ امامت وراثت نبوت ہے پس جس طرح انبیاء علیہم
الصلوٰۃ والسلام نے اپنے اپنے وقت کے حکمرانوں کو حق کی دعوت دی
تھی بعینہٖ امام کا بھی وہی فرض ہے۔ اور اگر اس وقت کے حکمران
حق کی دعوت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں تو امام کو ان کے خلاف
انارکی پھیلانے، بغاوت کرنے یا اس سے حکومت چھیننے کا کوئی حق
حاصل نہیں ہے۔ جس طرح حضرت علی علیہ السلام خلفاء ثلاثہ کے عہد میں
خاموش رہے ہیں، بعینہٖ اسی طرح امام کو خاموشی کے ساتھ تحفظ اصلاحی

امور کو انجام دینا ہے اور بس۔

ہاں البتہ اگر عوام الناس کسی امام کو خلافت کے لئے مجبور کر دیں۔ یا مسلمانوں کی اکثریت اُس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار ہو تو چونکہ خلافت انسان کا فطری حق ہے لہذا امام بھی اُس کا بدرجۂ اعلیٰ حقدار ہے۔ کیونکہ امام علم و حکمت میں باقی لوگوں سے افضل ترین ہے گو وہ عموماً اتباعِ رسولؐ میں وراثتِ حکومت پر وراثتِ عبدیت کو ترجیح دیتے ہیں۔ جیسے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نبوتِ حکومت کو رد کر کے نبوتِ عبدیت کو اختیار کیا تھا۔ پس اگر ہم حقیقت نبوت یا وراثتِ نبوت کو پانے کے خواہشمند ہوں تو ہمیں حضرت علی علیہ السلام کی روحانی قیادت کو تسلیم کرنا ہوگا اور اہلِ بیتِ اطہارؓ کی مودت و محبت کو اپنے دلوں میں جگہ دینی ہوگی۔ کیونکہ خلافتِ راشدہ یا حکومتِ الٰہیہ کے لئے اگر ایک طرف خلفاءِ ثلاثہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم کو برحق جان کر ان کی طرزِ حکومت اُن کی فراست اور اُن کی سیاست سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے طرزِ عمل پر صحیح معنوں میں اسلامی جمہوریت قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ تو دوسری طرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا روحانی قائد مانتے ہوئے علم طریقت سے مستفیض ہونا بھی لازمی ہے۔ تاکہ مسلمان شریعت اسلامی کے نفاذ کے ساتھ ساتھ رشد و ہدایت کے سرچشمۂ فیض سے بھی سیراب ہو سکیں۔

لیکن افسوس ہے کہ اس دور کے مسلمان علماء، پیرانِ عظام

اور رہنمایانِ قوم و ملک نے آج تک اس اہم فریضے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اور نہ ہی اس کے لئے کوئی عملی تجاویز اختیار کی ہیں۔ تاکہ ایک طرف تو شیعہ اور سنی کے درمیان یہ امامت و خلافت کے جھگڑے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتے اور دوسری طرف مسلمان صحیح معنوں میں حکومت الہیہ کو ظاہری اور باطنی طور پر قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ وما اریدُ الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللّٰہ لا الٰہ الا ھُوَ، علیہ توکلت والیہ اُنیب ہ وما علینا الا البلاغ ہ

شیطانی قوتوں کا تسلّط :- بیسویں اور آخری بات جس نے مجھے سخت پریشان کر رکھا ہے وہ شیطنت کا انسانیت پر اپنی مکارانہ چالوں سے ساحرانہ طور پر چھا جانا ہے۔ آج چاروں طرف شیطان کا بول بالا ہے۔ ہر جگہ شیطان کی ڈگڈگی بج رہی ہے۔ نفس پرست، شہوت زدہ اور حرص کا مارا ہوا انسان اُس کے اشاروں پر ناچ رہا ہے شیطان اپنی پوری فوج کے ساتھ انسانوں پر ٹوٹ پڑا ہے اُس نے انسانوں کے مال اور اولاد میں اپنا ساجھا بنا لیا ہے اور اپنی چیخ و پکار سے جھوٹے وعدوں اور غلط پروپیگنڈوں سے انہیں گمراہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ مگر اُس کے مقابلے میں کوئی ایسی موثر آواز نہیں جو شیطانی جھوٹ کے تمام پلندوں، اُس کی غلط افواہوں اور اُس کی ناروا چیخ و پکار کو بے اثر ثابت کر دے کوئی ایسی شخصیت نہیں جو اپنی لاٹھی سے عصائے موسیٰ کی طرح شیطان کی تمام ساحری کو نگل جائے۔ خدا کے چند مخلص بندوں کی طرف سے حق کی جو آواز اٹھائی جاتی ہے۔ وہ سحر زدہ انسانوں کے ایوانوں تک پہنچتے پہنچتے اُن انسان نما شیطانوں کی طرف سے اس طرح غلط رنگ میں پیش کی جاتی ہے کہ سادہ لوح عوام نہ صرف حق کو حق سمجھنے سے محروم رہ جاتے ہیں بلکہ وہ اُس کا غلط اثر بھی لے لیتے ہیں۔ اور اس طرح حق کی بات سننے والے یا حق کو

حق سمجھنے والے باقی نہیں رہتے۔ لہذا داعیانِ حق اور مصلحین آتے ہیں مسلمانوں کو حق کی دعوت دیتے ہیں مگر اُن کی آواز "نقار خانے میں طوطی کی آواز" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور بقول شاعر ؎

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

شیطان کی شیطنت اُسی طرح ہے اور حق کے طوطی اپنی اپنی بولیاں بول کر اور اپنے وقت تک لوگوں کو حق کی طرف بلا کر چلے جاتے ہیں یہی وہ اصل محرک ہے جو مجھے اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ تو بھی داعیانِ حق کی طرح شیطان کے خلاف قلم اٹھا اور جہاد کر۔ یا تو تو شیطنت کو ختم کر دے اور حق کی آواز کو بلند کر کے شیطنت کا صفایا ہو جائے گا اور یا تو بھی "نقار خانے میں طوطی" کی طرح حق کی راہ میں تڑپ تڑپ کر جان دے دے گا۔"

قبل اس کے کہ شیطان اور اُس کی شیطنت پر اس سلسلے میں کچھ عرض کیا جائے اس بات کی تحقیق ضروری ہے کہ شیطان ہے کیا؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ انسان عناصر اربعہ (یعنی آگ، ہوا، پانی، اور مٹی) کا مرکب ہے، لہذا شیطان ان عناصر میں سے ناری چیز کا نام ہے یعنی شیطان وہ آتشی مادہ ہے جو انسان کے اندر موجود ہے اور جو اُسے برائی پر اُبھارتا رہتا ہے۔ لیکن قرآن اس کی مخالفت کرتا ہے وہ فرماتا ہے کہ شیطان انسان یا دوسری مخلوقات کی طرح ایک علیحدہ

جنی مخلوق ہے جو آگ سے پیدا کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ وَالْجَانَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۝ (پ ۱۴ الحجر ع ۳)
(اور تحقیق ہم نے انسان کو بجتی ہوئی مٹی جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی تھی پیدا کیا اور جن (جنات) کو اس سے قبل شعلہ آتش سے پیدا کر چکے تھے) اور ارشاد ہے۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ (پ ۱۵ الکہف ع ۷)
(اور جبکہ ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو سو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے، وہ جنات میں سے تھا، سو اس نے اپنے رب کے حکم سے عدولی کی۔ سو کیا پھر بھی تم اس کو اور اس کی اولاد کو دوست بناتے ہو مجھ کو چھوڑ کر حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں یہ ظالموں کے لئے بہت برا بدل ہے)

یہاں نہ صرف یہ ثابت ہوا کہ ابلیس (شیطان) جنات کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا بلکہ اس کی ذریت بھی ثابت ہوئی۔ اور جنات کے متعلق تو قرآن میں بہت سی آیتیں آئی ہیں بلکہ قرآن کی ایک سورۃ بھی سورۃ جن کے نام سے موسوم ہے جس میں جنات کا باقاعدہ تذکرہ آیا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔ قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ

نفر من الجن فقالوا انا سمعنا قرانا عجبا لا یهدی
الی الرشد فامنا به ط ولن نشرک بربنا احدا لا
وانه تعالی جد ربنا ما اتخذ صاحبة ولا ولدا لا
وانه کان یقول سفیهنا علی الله شططا لا و
انا ظننا ان لن تقول الانس والجن علی الله کذبا
وانه کان رجال من الانس یعوذون برجال من
الجن فزادوهم رهقا لا وانهم ظنوا کما ظننتم ان
لن یبعث الله احدا لا وانا لمسنا السماء فوجدنها
ملئت حرسا شدیدا وشهبا لا وانا
کنا نقعد منها مقاعد للسمع ط فمن یستمع الان
یجد له شهابا رصدا لا وانا لا ندری اشر ارید
بمن فی الارض ام اراد بهم ربهم رشدا لا و
انا منا الصلحون ومنا دون ذلک ط کنا
طرائق قددا لا وانا ظننا ان لن نعجز الله
فی الارض ولن نعجزه هربا لا وانا لما سمعنا
الهدی امنا به ط فمن یؤمن بربه فلا
یخاف بخسا ولا رهقا لا وانا منا المسلمون
ومنا القسطون ط الخ (پ ۲۹ سورۃ الجن ع ۱)

ترجمہ: اے نبی کہدیجئے (اے رسولؐ) کہ میرے پاس اس بات کی

وحی آئی ہے کہ جنات میں سے ایک جماعت نے قرآن سنا پھر انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔ جو راہ راست بتلاتا ہے سو ہم تو اُس پر ایمان لے آئے اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔ اور ہمارے پروردگار کی بڑی شان ہے۔ اُس نے کسی کو نہ بیوی بنایا اور نہ اولاد، اور ہم میں جو احمق ہوئے ہیں وہ حد سے بڑھی ہوئی باتیں کہتے تھے۔ اور ہمارا یہ خیال تھا کہ انسان اور جنات کبھی خدا کی شان میں جھوٹ بات نہ کہیں گے۔ اور بہت سے لوگ انسانوں میں ایسے تھے کہ وہ جنات میں سے بعضے لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے۔ سو ان آدمیوں نے ان جنات کی بد دماغی اور بڑھا دی اور جیسا تم نے خیال کر رکھا تھا۔ ویسا ہی آدمیوں نے بھی خیال کر رکھا ---- تھا۔ کہ اللہ تعالےٰ کسی کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا۔ اور ہم نے آسمان کی تلاشی لینی چاہی سو ہم نے اُس پر سخت پہرہ اور اسکو شعلوں سے بھرا ہوا پایا۔ اور ہم آسمان کے موقعوں میں سننے کے لئے جا بیٹھا کرتے تھے۔ سو جو کوئی اب سننا چاہتا ہے تو اپنے لئے ایک تیار شعلہ پاتا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کو کوئی تکلیف پہنچانا مقصود ہے۔ یا اُن کے رب نے اُن کو ہدایت کرنے کا قصد فرمایا ہے۔ اور ہم میں بعضے نیک ہیں اور بعضے اور طرح کے ہیں۔ ہم مختلف طریقوں پر تھے اور

ہم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم زمین میں اللہ تعالیٰ کو ہرا نہیں سکتے اور نہ بھاگ کر اُس کو ہرا سکتے ہیں۔ اور ہم نے جب ہدایت کی بات سُن لی تو ہم نے تو اُس کا یقین کر لیا سو جو شخص اپنے رب پر ایمان لے آویگا تو اُس کو نہ کسی کا اندیشہ ہوگا اور نہ زیادتی کا۔ اور ہم میں بعضے تو مسلمان ہیں اور بعضے ہم میں بے راہ ہیں۔

مندرجہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنات ایسی مخلوق ہے کہ جن میں سے ایک جماعت نے قرآن سنا اور وہ اس پر ایمان بھی لے آئے اور وعدہ کر لیا کہ ہم اپنے رب کے ساتھ شریک نہ بنادیں گے۔ اور انہوں نے اس بات کا بھی اقرار کر لیا کہ خدا کی نہ بیوی ہے نہ ہی وہ اولاد رکھتا ہے۔ یعنی عیسائیوں کے عقیدے کی باقاعدہ انہوں نے تردید کی۔ اور پھر انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم میں جو احمق لوگ تھے وہ حد سے بڑھی ہوئی باتیں کہتے تھے اور یہ بات تو خاص طور پر قابل غور ہے کہ جب اُنہوں نے کہا کہ "بہت سے لوگ انسانوں میں ایسے تھے کہ وہ جنات میں سے بعضے لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے" اور پھر یہ بھی بات واضح ہو گئی کہ جنات ایسی مخلوق ہے جو اُڑ بھی سکتی ہے کیونکہ انکا یہ کہنا کہ "ہم نے آسمان کی تلاشی لینی چاہی سو ہم نے اُسکو سخت پہرہ اور شعلوں سے بھرا ہوا پایا۔ اور ہم آسمان کے موقعوں میں سننے کے لیے جا بیٹھا کرتے تھے" اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ

"یہ ہم میں بعضے نیک ہیں اور بعضے اور طرح کے ہیں۔ ہم مختلف طریقوں پر تھے .... اور ہم نے جب ہدایت کی بات سن لی تو ہم نے اُس کا یقین کر لیا .... اور ہم میں بعضے تو مسلمان ہیں اور بعضے بے راہ ہیں"۔

اور اسی طرح قرآن میں بتلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے جنات کو مسخر کر رکھا تھا چنانچہ ارشاد ہے :- وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ۝ پ ۱۹ النمل ع ۲۔

ترجمہ :- اور سلیمان کے لئے اُن کا لشکر جمع کیا گیا۔ جنات میں سے اور انسانوں میں سے اور پرندوں میں سے بھی اور اُن کو روکا جاتا تھا" اور ارشاد ہے : وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ ج وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ ط وَمِنَ الْجِنِّ مَن يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ ط وَمَن يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ ۝ يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِن مَّحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَّاسِيَاتٍ ط پ ۲۲ السبا ع ۲ "اور سلیمان کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا گیا کہ اُس کی صبح کی منزل ایک مہینے بھر کی ہوتی اور اس کی شام کی منزل ایک مہینے بھر کی ہوتی۔ اور ہم نے

تانبے کا چشمہ بہا دیا اور جنات میں بعض وہ تھے جو اُن کے آگے
کام کرتے تھے اُنکے رب کے حکم سے اور ان جنات کو یہ کہا
گیا تھا کہ ان میں سے جو شخص ہمارے حکم سے سرتابی کرے گا
ہم اُس کو دوزخ کا عذاب چکھا دیں گے۔ وہ جنات اُن کے لئے
وہ وہ چیزیں بناتے جو اُن کو منظور ہوتا یعنی بڑی بڑی عمارتیں۔
اور مورتیں اور لگن جیسے حوض اور دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں۔

معلوم ہوا کہ جنات ایک ایسی مخلوق ہے جو سلیمان علیہ السلام
کے لئے فوج کا کام بھی دیتی تھی۔ جنات اُن کے لئے بڑی بڑی عمارتیں
مورتیں، اور بڑے بڑے برتن بھی بنایا کرتے تھے۔ بلکہ قرآن کریم
میں بتلایا ہے کہ بعض جن حضرت سلیمان علیہ السلام کے درباری
بھی تھے۔ چنانچہ جب سلیمان علیہ السلام کو ملکہ سبا کے تخت کو
منگوانے کی ضرورت پڑی تو اپنے درباریوں سے یوں مخاطب
ہوئے: "قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا
قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ
اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ
عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ۝ (پ ۱۹ النمل ع ۳)

" سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ اے اہلِ دربار تم میں کوئی
ایسا ہے جو اس کا تخت قبل اس کے کہ وہ لوگ میرے پاس
مطیع ہو کر آویں حاضر کر دے۔ ایک قوی ہیکل جن نے جواب دیا

عرض کیا کہ میں اُس کو آپ کی خدمت میں حاضر کروں گا قبل اس کے کہ آپ اپنے اجلاس سے اُٹھیں اور میں اس پر طاقت رکھتا ہوں امانت دار ہوں "

غرض قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنات انسانوں سے علیحدہ ایک مخلوقِ خدا ہے اسی لئے قرآن نے بہت سی جگہوں پر " یا معشر الجنّ والانس " سے خطاب فرمایا ہے یعنی اے جنات اور انسانوں کے ٹولو! اور فرمایا " وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ○ رپ الاعراف ع ۲۲) " اور ہم نے ایسے بہت سے جنات اور انسان، دوزخ کے لئے پیدا کیئے ہیں۔ جن کے دل تو ہیں لیکن وہ اُن سے (حق کو) نہیں سمجھتے اُن کی آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے (حق کو) نہیں دیکھتے اُن کے کان تو ہیں لیکن وہ اُن سے (حق بات کو) نہیں سنتے۔ ایسے لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ یہ اُن سے بھی زیادہ بے راہ ہیں یہی لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہیں "

جب یہ ثابت ہوا کہ جنات انسانوں سے علیحدہ

مخلوق ہے تو یہ بھی قرآن ہی سے ثابت ہے کہ بعض جنات کو اللہ تعالیٰ نے شیاطین کے نام سے پکارا ہے چنانچہ حضرت سلیمانؑ ہی کے قصے میں ارشاد خداوندی ہے:

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۝ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۝ (پ۱۷ الانبیاء ع۶) "اور ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے زور کی ہوا کو تابع بنا دیا تھا۔ کہ وہ اُنکے حکم سے اُس سرزمین کی طرف کو چلتی جس میں ہم نے برکت رکھی ہے اور ہم ہر چیز کو جانتے ہیں۔ اور بعض بعض ایسے شیطانوں کو اُن کے لئے مسخر کر رکھا تھا جو اُن کے لئے (سمندروں اور دریاؤں میں) غوطے لگایا کرتے تھے اور وہ اور اور کام بھی اس کے علاوہ کرتے تھے۔ اور ہم ہی نے اُن کو سنبھال رکھا تھا"

اور اسی طرح سورۂ صٓ میں بھی ارشاد ہے:

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَاۗءً حَيْثُ اَصَابَ ۝ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّاۗءٍ وَّغَوَّاصٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۝ (پ۲۳ صٓ ع۳)

ترجمہ: "سو ہم نے ہوا کو اُن کے تابع کر دیا کہ وہ اُن کے

حکم سے جہاں وہ چاہتے نرمی سے چلتی تھی اور سرکش جنات
(یعنی الشیاطین) کو بھی اُن کا تابع کر دیا یعنی تعمیر
بنانے والوں کو بھی اور غوطہ خوروں کو بھی
اور دوسرے (قوی ہیکل) جنات کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے
رہتے تھے ۔

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام
کے آگے اللہ تعالٰے نے بڑے بڑے قوی ہیکل دیو مسخر کر
رکھے تھے جو اُن کے لئے بڑی بڑی عمارتیں، بڑے بڑے
برتن اور حوضوں کی مانند بڑی بڑی دیگیں بنایا کرتے تھے
اور سمندروں میں غوطہ مار کر سمندر کی تہ سے موتی اور مونگا
نکالا کرتے تھے اور چونکہ یہ روایات قرآن سے مطابق حقیقی
ہیں لہذا ہو سکتا ہے کہ انہی دیوؤں ہی کو قرآن کریم نے شیاطین
کے نام سے پکارا ہو۔ پس شیاطین وہ سرکش اور قوی ہیکل
جنات ہیں جنکو ہماری اصطلاح میں "دیو" کہا جاتا ہے اور
شیطان کے نام سے اس لئے موسوم ہوا کہ ان میں کے سب سے
بڑے جن (یا دیو) ابلیس علیہ اللعنۃ نے خدا کے حکم سے
سرکشی کی اور خدا کی رحمت سے دور ہوا (شیطان کے معنی
رحمت سے دور کیا گیا) اس قصے کو قرآن یوں بیان فرماتا ہے
وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ

صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ
وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝
فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ
اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ
مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ لَمْ اَكُنْ
لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ
مَّسْنُوْنٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝
وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ قَالَ
رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ
فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝
قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ
فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ
مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ
مُسْتَقِيْمٌ ۝ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ
سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَاِنَّ
جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ لَهَا سَبْعَةُ
اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ۝

(سیپا الحجر ع ۳) ترجمہ: اور وہ وقت یاد کرنے کے
قابل ہے جب آپ کے رب نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں ایک

بشر کو بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہوگی
پیدا کرنے والا ہوں۔ سو جب میں اُس کو پورا بنا چکوں اور
اُس میں اپنی جان ڈال دوں۔ تو تم سب اُس کے روبرو سجدہ
میں گر پڑنا۔ سو سارے کے سارے فرشتوں نے سجدہ کیا
مگر ابلیس نے اس بات کو قبول نہ کیا کہ سجدہ کرنے والوں کے
ساتھ شامل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابلیس تجھکو
کون امر باعث ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔
کہنے لگا کہ میں ایسا نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جس کو آپ نے
بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہے پیدا
کیا ہے۔ ارشاد ہوا تو آسمان سے نکل جا کیونکہ بیشک تو مردود
ہو گیا۔ اور بیشک تجھ پر لعنت رہے گی قیامت کے دن تک
(ابلیس) کہنے لگا تو مجھ کو مہلت دیجئے قیامت کے دن تک
ارشاد ہوا کہ تجھ کو معین وقت کی تاریخ تک مہلت دی گئی
(ابلیس) کہنے لگا کہ اے میرے رب بسبب اس کے کہ آپ نے
مجھے گمراہ کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں۔ کہ میں دنیا میں اُن کی نظر
میں معاصی کو مرغوب کر کے دکھاؤں گا۔ اور ان سب کو گمراہ
کروں گا۔ بجز آپ کے اُن بندوں کے جو اُن میں مخلص ہیں۔
ارشاد ہوا کہ یہ ایک سیدھا راستہ ہے۔ جو مجھ تک پہنچتا ہے
بیشک جو میرے بندے ہیں اُن پر تیرا کوئی بس نہیں چلے گا۔

ہاں البتہ سوا اُن گمراہ لوگوں کے جو تیری راہ پر چلتے ہیں۔ اور تحقیق اُن سب سے جہنم کا وعدہ ہے۔ جس کے سات دروازے ہیں ہر دروازہ کے لئے اُن لوگوں کے الگ الگ حصے ہیں "

در اصل ابلیس کو جب اللہ تعالےٰ نے تمام ناری علوم عطا کئے اور ان علوم کے ذریعے اُس کو اتنی فضیلت دی کہ وہ آسمان و زمین میں پرواز کرنے لگا۔ اور اُس کی بات ہر جگہ مانی گئی اور اس کے علم کے سامنے فرشتے عاجز آنے لگے۔ (کیونکہ فرشتوں کو ناری علوم حاصل نہ تھے) تو اُسے یہ غلط فہمی ہوئی کہ آگ میں جو تاثیر ہے وہ مٹی میں نہیں حالانکہ انسان آگ، ہوا، پانی مٹی اور روحِ انسانی (و نفخت فیہ من روحی) اپنی نورانی اجزا کا مرکب تھا۔ اور یہ تو ایک مانی ہوئی بات ہے کہ مخلوق پانچ قسم کی ہے ناری، بادی، خاکی، آبی اور نوری۔ اور جب مخلوق پانچ قسم کی ہے تو پھر ان کے علوم بھی پانچ ہی قسم کے ہونے چاہئیں ناری علوم، فضائی علوم، خاکی علوم، آبی علوم اور نوری علوم اور یہ بھی ایک مانا ہوا اُصول ہے کہ ناری مخلوق صرف ناری علوم کی ہی ماہر ہو سکتی ہے اسی طرح بادی، خاکی، آبی، اور نور کی مخلوق اپنے اپنے قسم کی علوم کی ماہر ہو سکتی ہے۔

پس جس طرح پانی کی مخلوق کو آبی علوم ہی حاصل ہو سکتے، ہیں ہوا کی مخلوق کو فضائی علوم حاصل ہوتے ہیں۔ مٹی کی مخلوق کو مٹی کے

علوم حاصل ہوتے ہیں نورانی مخلوق کو نورانی علوم حاصل ہوتے ہیں اسی طرح ناری مخلوق کو بھی ناری علوم ہی حاصل ہو سکتے ہیں مگر انسان چونکہ ان پانچوں اجزا کا مرکب تھا لہٰذا اسے پانچوں علوم حاصل ہو سکتے تھے اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا :۔ "وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا" یعنی ہم نے آدم کو ناری، ہوائی، خاکی، آبی اور نورانی پانچوں قسم کے علوم عطا کئے۔ اور اگر پانچوں قسم کے علوم عطا نہ کئے جاتے تو پھر "الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا" کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

لیکن ابلیس اس غلط فہمی میں مبتلا ہوا کہ مجھے جو "ناری علوم" حاصل ہیں وہ فرشتوں کے پاس نہیں، اور چونکہ فرشتے میرے ان علوم کے سامنے عاجز ہیں لہٰذا میں ان سے اشرف ہوں اور اس طرح اس کے ذہن میں یہ خیال سما گیا کہ نار، نور سے اشرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام علوم سکھا دیئے اور پھر فرشتوں سے ان علوم کے متعلق سوال کیا۔ فرشتے عاجز آ گئے۔ مگر شیطان (ابلیس) اسی تکبر میں رہا کہ نار تو نور سے بھی اشرف ہے وہ کر خاک تو کوئی چیز ہی نہیں غرضیکہ یہاں ابلیس سے دو بڑی غلطیاں سرزد ہوئیں اول یہ کہ اس نے آدم علیہ السلام کے پیدائش کی پوری تحقیق نہیں کی یا بغض و عناد کے باعث خدا کی اس تخلیق میں غور نہیں کیا بلکہ اسے مٹی کا ایک پتلا سمجھا

اور دوم اس نے اطیعوا اللہ سے روگردانی کی یعنی خداوند تعالیٰ کی نافرمانی کی کیونکہ خدا نے اس کو حکم دیا تھا کہ تو آدم کے سامنے سجدہ کر۔ چنانچہ اس حقیقت کو قرآن کریم یوں واضح کرتا ہے:۔ قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ط قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ج خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ۝ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَن تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ۝ قَالَ أَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ۝ قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ ثُمَّ لَآتِيَنَّهُم مِّن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَن شَمَائِلِهِمْ ط وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ۝ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا ط لَّمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكُمْ أَجْمَعِينَ ۝ (پ ۸ الاعراف ع ۲) ترجمہ: حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تو جو سجدہ نہیں کرتا تجھ کو اس سے کون امر مانع ہے جبکہ میں تجھ کو حکم دے چکا۔ (ابلیس) کہنے لگا کہ میں اس سے بہتر ہوں آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو آپ نے خاک سے پیدا کیا ہے۔ ارشاد ہوا

تُو آسمان سے اُتر۔ تجھکو کوئی حق حاصل نہیں کہ تُو آسمان میں رہ کر تکبر کرے۔ سو نکل جا بیشک تو کمینہ ہے (یعنی تو ذلیلوں میں شمار ہونے لگا) وہ کہنے لگا مجھ کو قیامت کے دن تک مہلت دیجئے۔ ارشاد ہوا تجھ کو مہلت دی گئی (ابلیس) کہنے لگا کہ بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو گمراہ کیا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اُن کے لئے آپ کی سیدھی راہ "صراطک المستقیم" پر بیٹھوں گا پھر اُن پر حملے کروں گا اُنکے پیچھے سے بھی اور اُن کی داہنی جانب سے بھی اور اُن کی بائیں جانب سے بھی۔ اور آپ اُن میں اکثروں کو احسان ماننے والا نہ پائینگے۔ ارشاد ہوا کہ یہاں سے ذلیل و خوار ہو کر نکل جا۔ جو شخص اُن میں سے تیرا کہنا مانیگا۔ میں ضرور تم سب سے جہنم بھر دوں گا۔

غرض جب اللہ تعالٰے نے آدمؑ کو فضیلت اور شرافت عطا فرمائی اور ابلیس کو (نافرمانی کے سبب) ذلیل کر دیا۔ تو ابلیس نے نہ صرف اللہ تعالٰے سے بغاوت کی بلکہ انسانوں سے بھی عداوت اختیار کی اور کہا۔ قَالَ اَرَءَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا۝ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا۝ وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ

بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اِنَّ عِبَادِىْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝ (پ ۱۵

بنی اسرائیل ع ۷) ترجمہ ارشاد ابلیس نے کہا کہ اس شخص کو آپ نے مجھ پر فوقیت تو دے دی ہے۔ اگر آپ نے مجھ کو قیامت تک مہلت دے دی۔ تو میں بجز قلیل لوگوں کے اس کی تمام اولاد کو اپنے بس میں کر لوں گا۔ ارشاد ہوا جا جو شخص ان میں سے تیرے ساتھ ہوگا سو تم سب کی سزا جہنم ہے، سزا پوری۔ اور ان میں سے جس جس پر تیرا قابو چلے اپنی چیخ پکار سے اس کا قدم اکھاڑ دینا اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لانا اور ان کے مال اور اولاد میں اپنا ساجھا کر لینا اور ان سے وعدہ کرنا ارشاد ہے اور شیطان ان لوگوں سے بالکل جھوٹے وعدے کرتا ہے (اور آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) میرے خاص بندوں پر تیرا ذرا قابو نہ چلے گا اور آپ کا رب کافی کارساز ہے۔

اور یہاں سے اللہ تعالیٰ اور شیطان کے درمیان کُٹی دشمنی ٹھن گئی۔ ابلیس خبیث لعین نے خدا کی عزت کی قسم کھا کر کہا قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ قَالَ فَالْحَقُّ ؗ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ۝

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ
(پ ۲۳ ص ع ۵) (ابلیس) کہنے لگا تیری عزت کی قسم کہ میں ان سب کو گمراہ کروں گا بجز آپ کے مخلص بندوں کے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ میں سچ کہتا ہوں اور میں تو سچ ہی کہا کرتا ہوں کہ میں تجھ سے اور جو اُن میں سے تیری پیروی کریں گے سب سے دوزخ کو بھر دونگا[1]

---

[1] حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب ابلیس نے اللہ کی عزت کی قسم کھائی کہ میں انسانوں کو اس وقت تک بہکاتا رہوں گا جب تک اُن کی جان میں جان ہے تو اللہ تعالےٰ نے بھی قسم کھائی کہ اگر ان کو نو دن میں جتنے بار بھی دھوکہ دیکر گناہ میں پھنسا دے گا۔ تو پھر بھی اگر پھر بندہ میرے آگے توبہ کریگا تو میں اس کے تمام گناہوں کو معاف کر دونگا (ترجمہ از مسند امام احمد حنبلؒ) اسی لیے تو رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ" (کسی گناہ سے باز آجانے والے کی مثال یوں ہے کہ جیسے اُس نے گناہ کیا ہی نہ ہو) یعنی ایک شخص عمر بھر کا شرابی، زانی، فاسق، فاجر، چور، ڈاکو، سود خور، حرامخور اور رشوت خور کیوں نہ ہو لیکن جس دن سے اُس نے خدا کے آگے توبہ کی اور اُس گناہ سے باز آیا۔ اُس دن سے اللہ تعالےٰ اُس کے تمام پچھلے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے۔ مثلاً چور کے متعلق اللہ تعالےٰ نے فرماتا ہے:

پس ان روشن حقائق اور نصِ قرآنی کے ہوتے ہوئے ہم اسبات کو ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ کہ شیطان محض انسان کے اندر ناری عنصر کا نام ہے

ہاں البتہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ شیطان تمام ناری علوم کا ماہر ہے۔ لہٰذا وہ انسان کے ناری عنصر کو ابھار دے اور اس کی بعض کمزوریوں کے باعث اسے بہکا سکتا ہے۔

بقیہ از صـــ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

پ ۶ المائدہ ع ۶ ۔ اور جو مرد چوری کرے اور جو عورت چوری کرے۔ سو اُن دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو اُن کے کردار کے عوض میں بطور سزا کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ بڑے قوت والے بڑی حکمت والے ہیں۔ پھر جو شخص باز آ جاوے اپنی اس زیادتی کرنے کے بعد (یعنی چوری ترک کر دے) اور اپنے اعمال کی درستی کرے تو بیشک اللہ تعالیٰ اس پر توجہ فرما دیں گے۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے اور بڑی رحمت والے ہیں"

اور یہ بھی ایک مسلّم حقیقت ہے کہ انسان کے ضمیر میں بھی سفاکی اور فسادی مادہ موجود ہے، مگر اس کو قرآن کریم نے نفس سے تعبیر کیا ہے ارشاد ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ (پ ۳۰ الشمس ۱۴):-
(قسم ہے نفس کی جس نے اس کی درستی فرمائی پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری اس کو بتادی۔)

علاوہ ازیں عباد الرحمٰن کے اوصاف میں سے جو قرآن نے بیان کیے ایک یہ بھی ہے کہ:- وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (پ ۱۹ الفرقان ۷۶):-
ترجمہ:- "اور رحمٰن کے بندے وہ بھی ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور نہیں پکارتے۔ اور جس شخص کے قتل کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا سوائے قتل نہیں کرتے ہاں مگر حق پر۔ اور وہ زنا بھی نہیں کرتے۔ اور جو شخص ایسے کام کرے گا تو سزا سے اس کو سابقہ

اور اسی حقیقت کے پیش نظر فرشتوں نے تخلیق آدم کے وقت یہ سوال کیا تھا کہ :- قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ (پ ۱ البقرۃ ع ۴) "فرشتوں نے کہا کیا آپ زمین میں ایسے لوگوں کو پیدا کریں گے جو اس میں فساد مچائیں گے اور خونریزیاں کریں گے ۔"

حالانکہ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی ابلیس خدا کے مقرب بندوں میں شمار تھا اور ابھی اس کی شیطنت اور انسان کو بہکانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا ۔

بقیہ از صفحہ ۔۔۔ پڑھیگا ۔ قیامت تک خدا اس کا نام لے پڑھتا چلا جائیگا وہ دائمی جہنم نشین ہو کر رہیگا ۔ توبہ یا آگاہ ہے اور ایمان لے آئے یعنی اللہ اور رسول کی بات کا یقین کرے اور نیک عمل کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے برے اعمال کو اچھے اعمال سے بدل دیگا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۔ اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ارشاد ہوتا ہے ۔ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (پ ۷ الانعام ع ۷) ترجمہ :- "اور یہ لوگ جب آپ کے پاس آئیں جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں

پس ظاہر ہے کہ فرشتوں نے جو بات کہی تھی وہ انسان کے خمیر میں فسادی اور سفاکی مادہ موجود ہونے کی بنا پر کہی تھی - نہ کہ ابلیس کی بغاوت، نافرمانی، اور تکبر کے متعلق تھی اور دوسری بات یہ ہے کہ نفس سے جن برائیوں کا تعلق ہے اُس کے متعلق قرآن نے ہمیں یہ بتلا دیا کہ " فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا " یعنے ہم نے نفس کو اُس کی بُرائی اور اچھائی بتلا دی ہے - مثلاً چور چوری کرتے وقت یہ سمجھتا ہے کہ میں بُرا کر رہا ہوں ۔ زانی زنا کرتے وقت یہ جانتا ہے کہ میں کسی کی امانت میں خیانت کر رہا ہوں - غرض ہر برائی کرنے والا یہ جانتا ہے کہ میں برا کر رہا ہوں اور ہر اچھا کام کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ میں اچھا کر رہا ہوں - لیکن جن لوگوں کو شیطان نے گمراہ کر رکھا ہے اُن کے متعلق قرآن ہمیں بتلاتا ہے کہ :- لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ط أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ

تو یوں کہہ دیجئے کہ تم پر سلامتی ہے ۔ تمہارے رب نے مہربانی فرمانا اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ جو شخص بھی تم میں سے کوئی برا کام اپنی جہالت سے کر بیٹھے پھر وہ اُس کے بعد (توبہ کر کے) اُس سے باز آ جائے اور اپنی اصلاح کرے تو اللہ تعالےٰ کی یہ شان ہے کہ وہ بڑے مغفرت کرنے والے اور بڑے رحمت والے ہیں ؛

بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ ۔ یعنی
ان کے دل تو ہیں لیکن وہ حق اور باطل کی تمیز نہیں کرتے۔ اُن کی
آنکھیں ہیں مگر وہ (حق کو) نہیں دیکھتے، اُن کے کان ہیں مگر وہ
(حق بات کو) نہیں سنتے ایسے لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ یہ
اُن سے بھی گمراہی کے لحاظ سے زیادہ ہیں یہی لوگ غفلت میں
پڑے ہیں۔

انسان اگر چوری کرتا ہے تو وہ کم از کم یہ سمجھتا تو ہے کہ
میں برا کر رہا ہوں، لیکن حیوان (چوپایہ) اگر کسی پرائے شخص کی
فصل کو کھا رہا ہو یا اُسے برباد کر رہا ہو تو وہ یہ نہیں سمجھ سکتا
کہ میں برا کر رہا ہوں۔ انسان اگر کسی پرائی عورت سے زنا کر رہا ہو
تو وہ کم از کم اتنا ضرور سمجھتا ہے کہ میں جرم کر رہا ہوں۔ لیکن چوپایہ
اگر کسی ہمجنس مادہ کو دیکھ لے تو وہ یہ تمیز نہیں کر سکتا۔ کہ یہ مادہ
اپنی ہے یا پرائی۔

قرآن میں بتلاتا ہے کہ شیطان کے بہکائے ہوئے لوگ
چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ گمراہی میں یہ اُن سے بھی بدتر ہیں۔ بَلْ
هُمْ اَضَلُّ ۔ کیونکہ یہ بھی حق اور باطل کی کوئی تمیز نہیں کر سکتے

(۱) اور چوپاؤں سے بدتر اس لیے ہیں کہ اگر چوپاؤں کو پرائے
مال سے روکنے کی کوشش کی جائے۔ تو وہ رک بھی جاتے ہیں۔
یا اگر ان کو غلط راہ سے ہٹا کر سیدھی راہ پر لگایا جائے تو وہ

آسانی سے اُس پر لگ جاتے ہیں۔ مگر شیطان کے گمراہ کردہ لوگ جب کفر و شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تو پھر نہ صرف یہ کہ وہ اُن میں حق و باطل کی تمیز نہیں کرتے بلکہ وہ اُن غلط راہوں پر چلنے میں لطف بھی محسوس کرتے ہیں۔

یعنی نفس کی برائی تو یہ ہے کہ انسان اُس کو کم از کم برا تو سمجھتا ہے۔ لیکن شیطان کی گمراہی ایسی ہے کہ اس کو انسان برا بھی نہیں سمجھتا۔ وہ شرک اور کفر کرتا ہے مگر اسے برا نہیں جانتا بلکہ اُس کو پھیلانے کے لئے جانی اور مالی قربانیاں دیتا ہے اور اپنے زعم میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج بت پرست کی مورتیاں، گبر کی شعلہ ریاں، برہمن کی تنیا، عیسائی کا ابن خدا، مسلمانوں کے چڑھاوے وغیرہ وغیرہ نہایت عقیدت اور التزام کیساتھ جاری ہیں ہر عقیدہ کے لوگ اپنے اپنے عقائد پر پوری دلجمعی کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں، جاہل، عالم، کم فہم اور عاقل ہر ایک اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے کوئی بھی اپنے عقیدے اور مذہب کے متعلق اُس کے صحیح یا جھوٹ روا یا ناروا ہونے کے بارے میں ایک حرف تک سننے کو تیار نہیں

حالانکہ تقریباً تمام مذاہب کے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ اس کائنات یعنی زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے، آگ، ہوا، پانی، نباتات، جمادات، حیوانات، درند، چرند، پرند

اور انسانوں) کا خالق (پیدا کرنے والا) ایک ہے، ان کی پرورش
کرنے والا "رب العالمین" ایک ہے، ان کو موت و
حیات بخشنے والا "یحیی و یمیت" ایک ہے۔ اس
ساری کائنات کو ایک نظام کے تحت چلانے والا "قیوم"
ایک ہی ہے۔

اور وہ اس حقیقت پر بھی متفق ہیں کہ نوع انسانی ایک
ہی نسل ہے اس کا اب و جد ایک ہے۔ انسان درحقیقت ایک
ہی مطلب کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور ایک ہی منتہا کی طرف لوٹ
رہا ہے بلکہ وہ اس بات پر بھی متفق ہیں کہ یہ باہمی فساد خونریزی جو
قدرت کے منشا کے خلاف ہے ظلم عظیم اور جہالت بلکہ خودکشی
اور ہلاکت ہے۔

لیکن اس کے باوجود انسان ایک دوسرے سے برسرپیکار
ہیں روئے زمین پر ہولناک جنگیں اور خونریزیاں اکثر مذہبی
اختلافات کی بنا پر ہوتی رہی ہیں یہ اقوام عالم کے درمیان
بڑے بڑے حملے اور مقابلے یہ ایک قوم کا دوسری قوم کو
کاٹ کھانا، یہ فسادات خانہ جنگیوں اور جہادوں کی آگ جو
بھی لگی کہ ایک کا مذہب جدا ہے تو دوسرے کا عقیدہ الگ
ہے۔ اور یہی مذہبی تفرقہ دراصل شیطانی عمل ہے، کیونکہ شیطان
کا مادہ "شطن" ہے جس کا مطلب ہے دوری، یعنی حق سے دوری

خدا تک پہنچنے والی صراط المستقیم سے دوری، دینِ فطرت سے دوری۔ پس شیطانی عمل وہ ہے جو انسان کو دینِ فطرت سے دور کر دے یا راہِ حق میں اختلاف پیدا کر کے اُن کے درمیان تفرقہ ڈالدے۔

قرآن ہمیں بتلاتا ہے کہ: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ۗ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ (پ۲ البقرہ ۲۱۳) (ابتدا میں) تمام انسان ایک ہی طریق پر تھے۔ پھر جب ان میں اختلاف پیدا ہوا تو) اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا جو (اچھے کاموں پر) خوشخبری سنانے والے اور (برے کاموں کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے۔ اور اُن کے ساتھ حق کا فیصلہ دینے والی کتابیں بھی نازل فرمائیں اس غرض سے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں میں ان کے امورِ اختلافیہ میں فیصلہ فرما دیں۔

دراصل دینِ فطرت وہ نظامِ حیات ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں (پیغمبروں) کے ذریعے بھیجا تھا اور تمام انسانوں کو اُس پر چلنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ تاکہ لوگ ایک سیدھی راہ (صراط المستقیم) پر چل کر خلافتِ ارضی (تسخیرِ کائنات) کا فریضہ امن و سلامتی سے انجام دے سکیں۔ لیکن شیطان نے اُس راہ میں کھڑے ہو کر انسانوں کے اندر راہِ حق میں اختلاف و افتراق پیدا کیا اور

بعض نفس پرست شہوت زدہ اور ہٹ دھرم لوگوں کو پھسلا کر خودساختہ طور طریقوں پر ڈال دیا اور اسطرح اپنے اس گمان کو پورا کر دکھایا۔ جو اس نے انسانوں کے متعلق قائم کیا تھا۔

کہ :ر لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا ۝ ر اگر آپ نے مجھ کو قیامت تک مہلت دے دی تو میں بجز قدرے قلیل لوگوں کے اس کی تمام اولاد کو اپنے بس میں کر لوں گا

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :ر وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (پ ۲۲ السباء)

اور واقعی ابلیس نے اپنا گمان ان لوگوں کے بارے میں صحیح پایا کہ یہ سب اسی راہ پر ہو لئے مگر ایمان والوں کا گروہ۔

اور فرمایا اللہ تعالےٰ نے کہ :ر وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ ۖ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ۝ (پ الانعام ع ۱۴) اور یقیناً شیاطین اپنے دوستوں کو یہ تعلیم کر رہے ہیں "لیوحون" تاکہ یہ تم سے جدال کریں اور اگر تم نے ان لوگوں کی اطاعت کی (یعنی ان کے ناحق جھگڑوں کے باعث ان کی بات مان لی) تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ گے۔

غرضیکہ شیطان کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنی چال کی سے شرارت اور شور پیدا ہو جاتی [illegible] اسطرح [illegible] راہ [illegible] [illegible] کہ اس [illegible] [illegible] اسکی

خبر بھی نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنے زعم میں یہ سمجھتا ہے کہ میں راہ ہدایت پر ہوں
اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:- وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (پ الزخرف ع ۱۰)
(اور جو شخص اللہ تعالےٰ کی نصیحت سے اندھا بن جائے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں سو وہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اور وہ ان کو راہ (حق) سے روکتے رہتے ہیں اور یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ راہ پر ہیں

اس میں شک نہیں کہ انسان کے خمیر میں جو صفائی اور فسادی مادہ موجود ہے شیطان اپنی لطافت کے باعث ان میں ناری عنصر کے ذریعے حلول کرتا ہے[1] اور پھر انسان کی نفسانی خواہشات کو ابھارتا ہے

[1] شیطان چونکہ آگ سے پیدا ہوا ہے لہذا اس کا حلول حرارت کی مانند لطیف ہے جیسے گرم چیز کے قریب جانے سے انسان کے بدن میں اس کی گرمی آجاتی ہے یا آگ کے قریب بیٹھنے سے وہ گرمی محسوس کر لیتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جب شیطان انسان کے خون میں گرم لو کی طرح حرکت کرتا ہے تو انسان کے حواس خمسہ میں تیزی آجاتی ہے اور نہ اس کا نفس حد سے گذرنے کی کوشش کرتا ہے۔ گو وہ آگ کی مانند حرارت تو محسوس نہیں کرتا لیکن اس کے حواس خمسہ یا خواہشات نفسانی میں تیزی کی حرارت کو ضرور محسوس کر سکتا ہے۔ یہی مثال فرشتوں کی ہے وہ چونکہ نور کے ہیں لہذا (باقی بر صفحہ

اور اس طرح اسے ذاتی اغراض، شہوت رانی، نفس پرستی، ضد اور ہٹ دھرمی میں مبتلا کر کے خونریزی اور فساد پر آمادہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ :- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ (پ ۱۸ النور ع ۳)

(اے ایمان والو! تم شیطان کے قدم بقدم مت چلو (یعنی شہوانی راہوں پر مت چلو) اور جو شخص شیطان کے قدم بہ قدم چلتا ہے تو وہ بے حیائی اور نامعقول کام ہی کرنے کو کہیگا)

لیکن یہ ایسے جرائم ہیں کہ چاہے انسان نفس و شیطان کی ملی بھگت سے ان میں مبتلا ہی کیوں نہ ہو۔ مگر کم از کم اس کا ضمیر تو اسے ملامت کرتا ہے کہ تو مجرم ہے اور یہی احساس جرم ایک وقت انسان کو برائی سے توبہ کرا کے نیک بنا دیتا ہے۔ مگر جس کفر و شرک، ضلالت و گمراہی میں وہ عقیدتاً یا مذہباً مبتلا ہو جاتا ہے اس سے اس کا نجات و چھٹکارا مشکل ہے۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہ

افسوس ہے کہ شیطان کی اس عظیم شیطنت کو ختم کرنے کیلئے دنیائے اسلام میں آج کسی اسلامی جماعت، یا مسلمان مملکت کی

بقیہ فرض منصب :- برقی لہروں کی طرح روح پر اثر انداز ہوتی ہیں جن کی مدد سے انسان کی روحانی طاقت بڑھ جاتی ہے اور جس کی بدولت وہ نفس پر حاوی ہو جاتا ہے۔

کوئی عملی جد و جہد نہیں ہے مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ مسلمانوں میں بعض ایسی جماعتیں تو ہیں جو مسلمانوں ہی کی اصلاح کرنے میں مصروف ہیں۔ لیکن میری نظر میں کوئی ایسی جماعت یا مملکت نہیں ہے جو ستم رسیدہ انسانیت کو کفر و شرک اور ضلالت و گمراہی سے چھڑا کر ابلیس علیہ اللعنۃ کی ساحرانہ چنگل سے نجات دلا دے یا کم از کم وہ شیطان کے خلاف علمِ جہاد بلند کر کے علانیہ طور پر تمام شیطانی طاقتوں کو ختم کرنے کے درپے ہو۔

بیس اہم تقاضے

غرض اس طرح میں نے مسلمانوں کو بیس مختلف راہوں پر سے پھسلتا ہوا پایا، اور یہ محسوس کیا کہ جب تک ملتِ اسلامیہ کے سامنے کوئی ٹھوس لائحہ عمل، نظامِ حیات کی صورت میں پیش نہ کیا جائے، کہ جس پر چل کر مسلمان خود بخود مندرجہ ذیل بیس اہم تقاضوں پر عمل درآمد کر سکیں تب تک قرنِ اول (یعنی عہدِ نبوت کی ۲۳ سالہ زندگی) کا اسلام پیدا کرنا محال بلکہ ناممکن ہے۔

۱۔ اتحادِ اسلامی

گو مسلمانوں کا اصل نصب العین اتحاد و ترقیٔ عالم اور انسانیت کی فلاح و بہبود ہے، لیکن یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جب تک کوئی قوم یا جماعت پہلے اپنے اندر اتحاد پیدا نہ کرے تب تک وہ اقوامِ عالم کے اتحاد و ترقی کے میدان میں امامت و قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتی لہٰذا ہمارے سامنے سب سے اہم تقاضا اس وقت "اتحادِ اسلامی" ہے۔ اتحادِ اسلامی کا وجود عمل میں لانے کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ مسلمانوں کی تمام سیاسی و غیر سیاسی جماعتیں، مذہبی اور روحانی عقائد کی بنا پر بنے ہوئے فرقے، قومی، صوبائی اور لسانی گروہ اپنے اپنے خود ساختہ ناموں اور طور طریقوں کو اتحادِ اسلامی کی خاطر ترک کر کے قرنِ اول یعنی عہدِ نبوت کے ۲۳ سالہ اسلام کو اختیار کر لیں۔ اور اس طرح

سے اس اسلام کی پھر "تجدید" کی جائے جس کو حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ خاتم النبیین رسول رب العالمین اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ و بارک وسلم نے فاران کی چوٹیوں سے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ...... وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ ...... کے خداوندی پیغام سے شروع کیا تھا۔ اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو مذہبی، روحانی اور سیاسی طور پر ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ایک عظیم الشان اسلامی بلاک کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۲ - دعوت و تبلیغ اسلام

اتحادِ اسلامی کے بعد دوسرا اہم تقاضا جو سامنے ہے یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے سامنے دعوت و تبلیغ اسلام کی خصوصی اور منظم تحریک پیش کی جائیں اور تمام علمائے کرام، پیرانِ عظام، اور دوسرے رہنمایانِ قوم کی توجہ اس اہم تقاضے کی طرف مبذول کرائی جائے اور دعوت و تبلیغ اسلام کے وہ تمام ممکن ذرائع اختیار کئے جاویں جن کے ذریعے غیر اسلامی ادیان پر اظہارِ دینِ حق کیا جا سکے۔ مثلاً تمام اسلامی ممالک میں دعوت و تبلیغ اسلام کی خاطر ایسی تربیت گاہیں کھولی جائیں جن میں اردو، بنگالی، عربی، فارسی، ترکی اور انڈونیشی زبانوں کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، روسی، چینی، جاپانی، اور دوسری غیر اسلامی اقوام کی زبانوں میں مبلغینِ اسلام تیار کئے جاویں۔ جو امریکہ

روس، چین، جاپان اور دیگر غیر اسلامی ممالک میں وفود کی صورت میں بھیجے جائیں اور ان تربیت گاہوں میں بعض ایسے مبلغین بھی تیار کئے جائیں اور انہیں شروع سے ہی کسی غیر اسلامی ملک یا علاقے کے لئے نامزد کئے جائیں۔ پھر ان کو تمام ظاہری و باطنی علوم سکھانے کے علاوہ اس ملک یا قوم کی زبان کلچر اور مذہب سے بھی پوری طرح روشناس کئے جاویں۔ تاکہ وہ دعوت و تبلیغ اسلام کی خاطر اس ملک یا قوم میں ہمیشہ کے لئے سکونت پذیر ہو کر روزمرہ کی زندگی میں اسلام کا عملی نمونہ ان کے سامنے پیش کر سکیں اور سابقہ پیران عظام کی طرح اپنی زندگیوں کو دعوت و تبلیغ اسلام کے لئے وقف کر کے صحیح معنوں میں مبلغین اسلام کا وہ سبق پھر سے تازہ کر دیں جسے مسلمان مدت سے بھلا چکے ہیں اور جس طرح دعوت و تبلیغ اسلام کا وہ سرچشمہ فیض جو فاران کی وادیوں سے نکلا تھا۔ ایک بار پھر دنیائے انسانیت کے خشک شجر آباد کر دے اور بنجر صحراؤں کو باران رحمت سے سرسبز و شاداب کر دے۔

۱۴ - توحید: دعوت و تبلیغ اسلام کا سب سے بڑا مقصد عوام الناس کو توحید خداوندی کی طرف بلانا ہے لیکن جب تک مسلمان خود موحد نہ بن جائیں وہ غیر اقوام کو توحید کی طرف بلانے کی صلاحیت ہرگز نہیں رکھ سکتا لہذا تیسرا اہم تقاضا ہمارے سامنے یہ ہے وہ توحید خداوندی کا پیدا کرنا ہے پس ملت اسلامیہ کو موحد بنانے کی خاطر اس بات کی ضرورت ہے کہ قرآن

وسنت کی روشنی میں شرکِ خفی اور شرکِ جلی کی پوری تشریح کی جائے۔ اور عوام الناس کو صحیح معنوں میں توحید سے آگاہ کیا جائے تاکہ سادہ دل عوام استمداد من العباد فی الغیابت کے خطرات سے بھی محفوظ رہیں اور اولیاء اللہ کے فیوض سے بھی محروم نہ ہوں، علاوہ ازیں استخارہ با خواب، مراقبہ اور زیارتِ قبور کے شرعی طریقے واضح کردیئے جائیں تاکہ ان نازک معاملات میں سادہ لوح عوام کسی بڑے نقصان سے بچ کر راہِ حق کو پا سکیں۔

۴۔ پیری مریدی

دراصل مسلمان معاشرے کے شرکِ خفی اور شرکِ جلی میں مبتلا ہوجانے کی وجہ بے سند پیری مریدی ہے۔ کچھ مدت سے مسلمانوں میں پیری مریدی کا صحیح معیار باقی نہ رہ سکا ہے۔ جس کے باعث ہر جھوٹے اور کذاب کو پیر بننے کا موقع مل گیا ہے اور انہی جھوٹے اور کذاب لوگوں نے مسلمان معاشرے کو شرک میں مبتلا کردیا ہے۔ لہذا ہمارے سامنے چوتھا اہم تقاضا یہ ہے کہ بے سند پیری مریدی کو ختم کرکے جھوٹوں اور کذابوں کی ساحرانہ چالوں کو نیست و نابود کردیا جائے اور سچے لوگوں کو صحیح کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ پیری مریدی کی اصل غرض و غایت اور اس کا صحیح نصب العین دنیا کے سامنے واضح کردیا جائے۔ سچے اور حقیقی پیروں کو دعوت و تبلیغ اسلام احیائے سنن اور اصلاحِ عالم کے عظیم کام پر دوبارہ لگایا جائے

تاکہ وہ اپنے عمل و کردار کو نمونہ بنا کر کشف و کرامات اور علوم ظاہری و باطنی سے غیر اسلامی ادیان پر دینِ حق کا اظہار کر کے اسلام کی حقانیت کو دنیا پر ثابت کر سکیں اور آبِ کوثر کے اس روحانی چشمۂ فیض سے ساری دنیا کو مستفیض کر سکیں۔ اس انتخاب میں "قرآن و سنت اور علم فقہ سے پوری واقفیت، محبت رسول ؐ اور عشق الٰہی سے مخمور ہونا، اعمالِ صالح، نماز کی پابندی، تقوی، ایثار جان و مال، اکل حلال، خشیت الٰہی، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، رضائے الٰہی اور قرب خداوندی کی تمنا"، کو معیار بنایا جائے اور اس کے لئے ایسے قابل ترین اور مستند پیرانِ عظام کی ایک شوریٰ بنائی جائے جو سالکین کو مذکورہ بالا معیار پر پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں علاوہ ازیں دینی یونیورسٹیاں (اعلیٰ دار العلوم) بنائی جائیں جہاں قرآن و سنت، فقہ کے علاوہ ہر چار طریقوں کے اسباق بھی پڑھائے جاویں۔ مجاہدے کرائے جائیں، سلوک کے تمام راستے طے کرائے جاویں۔ اور جب سالک تمام ظاہری اور باطنی علوم کے ذریعے اسناد ہو جائے اور وہ تمام اسناد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر اسے کسی علاقہ یا ملک کے لئے مقرر کر دیا جائے اور اس کے تمام اخراجات کی ذمہ داری حکومت اپنے ذمہ لے تاکہ وہ عوام الناس کو لوٹنے اور پیسے بٹورنے سے بلند ہو کر صحیح معنوں میں دعوت و تبلیغ اسلام اور اظہارِ دینِ حق کا کام انجام دے سکے۔ اور ان تمام خود ساختہ طریقوں کو بند کیا جائے جو قرآن و سنت کے خلاف اور اسلام کے نام پر بدنما داغ ہوا۔ لہٰذا اس کے لئے سب سے پہلے ہمیں

پیری مریدی " کو ختم کر کے جھوٹوں اور کذابوں کو اسلام کے نام پر دھوکہ دہی اور فریب و دجل سے باز رکھنا لازمی ہے۔ اور چند مخصوص و مستند خانقاہوں کے علاوہ ان تمام گدیوں کو بند کرنا ہے جو محض روپیہ پیسہ بٹورنے کی خاطر کھولی گئی ہیں جنہوں نے دنیا کی متاع قلیل کی خاطر نیک دل اور سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے معبود حقیقی اللہ تعالیٰ سے نہایت چالاکی کے ساتھ پُر اسرار طور پر ہٹا کر ان سے ساختہ شغل میں اس طرح سے مبتلا کر دیا ہے کہ ان بیچاروں کو اس کی خبر بھی نہ لگ سکی ہے۔

تاکہ حق کو باطل سے ممیز کر کے حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت کر دیا جائے۔

۵۔ نظام تعلیم

ان اہم تقاضوں میں ہمارے سامنے ایک تقاضا ہمارا نظام تعلیم ہے۔ کیونکہ جب تک ہماری قوم دینی اور دنیوی ہر دو علوم کے زیور سے آراستہ نہیں ہوگی تب تک نہ ہم اسلام کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی انسانیت کو۔ لہٰذا ہمارے سامنے پانچواں اہم تقاضا یہ ہے کہ ہم موجودہ نظام تعلیم کو بدل کر اس کی جگہ ایک طرف تو ان تمام فطری علوم و فنون مثلاً ایجادات سائنس، ڈاکٹری، انجینئرنگ، علوم ارضیات، جمادیات، حیوانیات، فلکیات وغیرہ وغیرہ اور وہ تمام ٹیکنیکل اور مکینکل کورسز جن کی قوم اور ملک کو اس وقت ضرورت ہے یا جن سے آج ہم غیر اقوام کی زبان میں متعارف ہیں "کو ان علوم و فنون کے ماہرین کی نگرانی میں اپنی قومی زبان

میں ترجمہ کرا کر سکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں میں عملی طور پر رواج دیں۔ تاکہ ہمارے وہ طالب علم جنہیں ان علوم و فنون کو حاصل کرنے کی غرض سے اپنی عمر کا بیشتر حصہ پہلے صرف غیر اقوام کی زبان، مثلاً انگریزی، فرانسیسی روسی، اور جاپانی، کے سیکھنے میں صرف کر دینا پڑتا ہے۔ اس عظیم مشکل سے بچ کر ان علوم و فنون کو آسان قومی زبان میں جلد حاصل کر سکیں اور ہماری قوم کے بچوں کی عمر کا بیشتر حصہ فضول ضائع ہونے کی بجائے عملی کاموں میں صرف ہو سکے تاکہ وہ جلد سے جلد شاہراہ ترقی پر گامزن ہوں۔ اور دوسری طرف تمام فرقوں کے فقیہہ اور جید علماء کی ایک شوریٰ بنائی جائے جو قرآن و سنت اور تاریخی حقائق کی روشنی میں موجودہ ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک ایسا دینی تعلیمی کورس مرتب کریں جو طالب علموں کے لئے نہ صرف دین کے جلد سمجھنے میں آسانی پیدا کر سکے بلکہ ان کو غیر اسلامی دنیا میں اظہارِ دینِ حق کرنے کے قابل بھی بنا سکے۔

اس طرح ہمارا ہر طالبعلم خود بخود ایک اچھا سائنسدان، ایک اچھا ماہر فلکیات، ایک اچھا ماہر ارضیات، ایک اچھا ماہر طبیعیات، ایک اچھا ماہر حیاتیات، ایک اچھا ماہر حیوانات، ایک اچھا فلاسفر، ایک اچھا جنرل، ایک اچھا انجینئر بننے کے ساتھ ساتھ شریعت اسلامی کا پورا پابند اور متاعِ اخلاق کے زیور سے پوری طرح آراستہ ہو سکےگا

۲۰۔ احسان و خدمت علوم و فنون حاصل کر لینے کے بعد انسان کا اصل نصب العین احسان

خلق ہونا چاہیئے۔ کیونکہ انسان کا مطلب ہی اُنس رکھنے والا، اور اُنس و محبت تو وہی رکھتا ہے جس کے دل میں خدمت کا جذبہ موجود ہو یعنی انسان تب ہی صحیح معنوں میں انسان بن سکتا ہے جبکہ اس کے دل میں احسان و خدمت خلق کا جذبہ پیدا ہو جائے وگرنہ یہ علوم و فنون خود اس کے لئے تباہی کا باعث بن جاتے ہیں۔ پھر وہ ایٹم و ہیڈروجن تو ایجاد کرتا ہے لیکن یہی ایٹم و ہیڈروجن اس کے لئے تباہی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ لہٰذا ہمارے سامنے چھٹا اہم تقاضا یہ ہے کہ :- تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت و صحافت اور ملک کے دیگر داخلی و خارجی معاملات کا نصب العین احسان و خدمتِ خلق رکھا جائے تاکہ ملتِ اسلامیہ کے سامنے ملک اور قوم کی اصلاح و ترقی کے ساتھ ساتھ تمام انسانیت کی فلاح و بہبود بھی پیشِ نظر ہو اور اس طرح سے قوم کو نفس پرستی یعنی سیاسی و غیر سیاسی ذاتی مفادات یا ذاتیات و نفسا نفسی، خود غرضی اور مطلب پرستی سے ہٹا کر قومی، لسانی، صوبائی اور مذہبی تعصبات سے بچایا جا سکے اور اپنی تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت، صحافت اور ملک و قوم کے دیگر داخلی و خارجی معاملات کو اعلیٰ معیار پر پہنچا کر خیر امم بننے کا عملی ثبوت دیا جا سکے اور تاکہ ہم اقوامِ عالم کی امامت و قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینے کی صلاحیت و اہلیت پا سکیں۔

۷- بچوں کی تربیت و اصلاح

احسان و خدمتِ خلق کے جذبہ کے تحت ہمارے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ سب سے پہلے ہم اپنے بچوں کی تربیت اور اصلاح کی طرف توجہ

دیں. کیونکہ تعمیر قوم میں ہمارے بچوں کی حیثیت ایک بنیاد کی ہے. لہذا ساتواں تقاضا ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہم بچوں کے والدین، اساتذہ، اکابرین اور رہنمایانِ قوم بلکہ خود حکومت کی توجہ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کی طرف مبذول کرائیں اور ایک ایسا لائحہ عمل مرتب کرلیں جس پر چلکر ہماری آنے والی نسلیں اور بننے والی قوم میں خود بخود خالدؓ، طارقؒ اور محمد بن قاسمؒ جیسے مجاہد پیدا ہوں اور ہماری قوم کے بچے دنیا کے بہترین ماہرین فن، سائنسدانوں، فلاسفروں، انجینیئروں اور جنرلوں میں شمار ہو سکیں

۸۔ عورت کی آزادی اور اصلاح

بچوں کی اصلاح کے لئے یہ امر بھی ضروری ہے کہ ہم عورتوں کی اصلاح کی طرف بھی پوری توجہ دیں کیونکہ عورت کی گود ہی بچے کا پہلا مدرسہ ہے۔ اگر یہاں سے بچے کو صحیح تعلیم دی گئی تو آئندہ بھی ہمارے بچے صحیح راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں اور اگر یہ ابتدائی مدرسہ درست نہ ہو سکا تو آئندہ بھی بچوں کی اصلاح ناممکن ہے لہذا ہمارے سامنے آٹھواں اہم تقاضا یہ ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان بعض پیچیدہ سوالات کے باعث آج جو خلیج حائل ہو گئی ہے۔ اُن پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔ تعمیرِ قوم میں عورت کا اصل مقام معلوم کیا جائے اور اسے دینِ فطرت کے مطابق اپنے حقوق دیئے جائیں۔ جو عورتیں بعض خود غرض و نفس پرست اور شہوت زدہ انسان نما شیطانوں کے ایما پر یورپ کی اندھی تقلید میں اخلاق و شرافت کی حدود کو پار کر چکی ہیں اور بناؤ

سنگار کر کے رنگین لباسوں میں ملبوس ہو کر بازاروں، دکانوں، اسبر گاہوں، کلبوں، ناچ گھروں اور سینماؤں میں غیر مردوں کے سامنے نت نئے انداز میں اپنی زینت کا اظہار کرتی ہیں انہیں ان ابلیس کے ساتھیوں کی شیطانی چالوں سے خلاصی دلا کر اسلامی شریعت کی حدود میں رکھا جائے۔ اور جو عورتیں بعض مردوں کی تنگ دلی اور کوتاہ نظری کے باعث درکِ اسفل میں رکھی گئی ہیں۔ انہیں حقوق نسواں دلا کر اسلامی شریعت کے مطابق آزادی دلائی جائے تاکہ نہ تو ہمارے آنے والی نسلیں اور موجودہ بچے یورپ کی تقلید میں شہوت رانی اور اخلاق رذیلہ کا شکار رہوں۔ اور نہ ہی کال کوٹھڑیوں (گھروں کی چار دیواری) میں قید رہنے کے باعث غلامانہ ذہنیت، احساس کمتری، بزدلی، اور کاہلی میں مبتلا ہوں۔ علاوہ ازیں تعداد ازواج کے قرآنی مقصد کو واضح کر کے قرآن و سنت کی صحیح تفسیر پیش کی جائے۔ اسلامی پردہ کا بھی صحیح معیار مقرر کیا جائے تاکہ مسلمان قوم آئے دن کے جھگڑوں اور فتنوں سے نجات حاصل کر کے شاہراہ ترقی پر گامزن ہو سکے۔

۹۔ بلند اخلاق

جس طرح آنے والی نسلوں اور پلنے والی قوم کے لئے عورتوں کی اصلاح ضروری ہے اسی طرح عورتوں اور بچوں کی اصلاح کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ سب سے پہلے موجودہ لوگوں کے اندر اخلاق حمیدہ پیدا کیا جائے اگر ہمارا موجودہ معاشرہ با اخلاق نہیں ہو گا، تو ہماری عورتوں اور بچوں میں بلند اخلاق کا پیدا کرنا بھی محال بلکہ ناممکن ہے۔ لہذا ہمارے سامنے نواں

اہم تقاضا یہ ہے۔ کہ ہم ساری قوم کے سامنے ایک ایسا لائحہ عمل پیش کر دیں کہ جس پر چل کر ہمارے حکام ہمارے دفتروں کے کلرک، ہمارے مزدور و محنت کش، ہمارے امیر و غریب، ہماری فوج کے افسران حضرات: ہماری ملٹری کے نوجوان، ہمارے کالجوں کے طالب علم، ہمارے ہسپتالوں میں کام کرنے والے مرد و زن، ہمارے تاجر، کارخانہ دار، زمیندار ہر شخص اپنے اپنے حد کے اندر متاع اخلاق کے زیور سے آراستہ ہو جائے۔ تاکہ دنیا ہمارے اخلاق کی ثناخواں ہو اور قوموں کی امامت و قیادت میں اقوام عالم کا اعتماد ہمیں حاصل ہو سکے۔

۱۰۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

اس میں شک نہیں کہ قوموں کے عروج و زوال کا دارومدار ان کے اخلاق پر منحصر ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ کہ جب تک کوئی قوم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر مضبوطی سے کاربند نہ ہو اس کا اپنے اندر بلند اخلاق کا پیدا کرنا بھی محال ہے۔ کیونکہ جب وہ اپنے بھائی بندھوں کو نیکی پر امر کرنے اور برائی سے روکنے کی صلاحیت نہیں رکھے گی۔ تو معلوم ہے کہ وہ خود اخلاقی طور پر پست ہے تب ہی تو اس میں دوسروں کو نیکی پر امر کرنے اور برائی سے روکنے کی جرأت نہیں۔ لہٰذا ہمارے سامنے دسواں اہم تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے عوام اور حکام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کا مادہ پیدا کریں۔ اور جب دوسروں کو نیکی پر امر کرنے اور برائی سے روکنے کی صلاحیت ان میں

پیدا ہو جائے تو لامحالہ وہ اپنے اندر بھی بلند اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

۱۳۔ اسوۂ رسولؐ یا اتباعِ رسولؐ

جس طرح کسی قوم کا اپنے اندر اخلاق حمیدہ پیدا کرنے کے لئے اس کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہونا لازمی ہے اسی طرح کوئی قوم اس وقت تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کر سکتی جب تک کہ اس میں اسوۂ رسولؐ یا اتباعِ رسولؐ پیدا نہ ہو جائے کیونکہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اسی غرض سے ہوئی تھی کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کریں۔ چنانچہ ارشاد نبویؐ ہے: "ولعثت لاتمم مکارم اخلاق" (میں اس لئے مبعوث کیا گیا ہوں تاکہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں) اور چونکہ مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے امر بالمعروف اور نہی المنکر ہونا لازمی تھا۔ اسی لئے توراۃ اور انجیل میں بھی آپ کی صفت یوں فرمائی گئی ہے۔" الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل یامرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر الخ (الاعراف ع ۱۹)

جو لوگ ایسے رسول کی اتباع کرتے ہیں جو نبی اُمّی ہے جن کو وہ لوگ اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ ان کو نیکی پر امر کرتے ہیں اور برائی سے منع فرماتے ہیں۔

پس چونکہ مکارمِ اخلاق کی تکمیل کرنے والے خود امر بالمعروف نہی

عن المنکر تھے لہذا جو قوم بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بننا چاہیے یا وہ یہ چاہے کہ وہ بلند اخلاق کی مالک ہو جائے تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اسوہ رسولؐ یا اتباعِ رسولؐ یا اطاعتِ رسولؐ کی پیروی کرے۔

لیکن چونکہ ہمارے علماء نے احادیثِ نبویؐ کی جزوی اور فروعی اختلاف کو آڑ بنا کر اپنے اپنے اغراض و مقاصد کی برابری یا آپس میں ایک دوسرے سے ضد و ہٹ دھرمی، یا اپنی علمیت و برتری کو ظاہر کرنے کی خاطر اپنے اپنے فکر و خیال کے مطابق نئے نئے طور طریقے ایجاد کئے ہیں اور مسلمانوں کو علیحدہ علیحدہ گروہوں، فرقوں اور جماعتوں میں تقسیم کر کے افراط و تفریط کی چکر میں ڈال کر صراط المستقیم سے دور پھینک دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ ہر گروہ اور جماعت نے اپنے لئے چند حدیثوں کو مخصوص کر لیا ہے اور اسی کو اسوۂ رسولؐ، اتباع رسولؐ اور اطاعت رسولؐ سمجھ کر رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ۲۳ سالہ زندگی پر غور کرنے سے سبکدوش ہو گئے اور اس طرح نہ صرف سنتِ رسولؐ پر کامل و اکمل طریقے سے عمل کرنے سے محروم ہو گئے بلکہ قرآن پر عمل کرنے سے بھی قاصر ہو گئے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بعض لوگوں نے احادیثِ نبویؐ میں علماء کا اختلاف اور ان کی گروہ بندی اور قرآن پر عمل کرنے سے دوری کو دیکھ کر یہ تصور کر لیا ہے کہ چونکہ علماء کا ایک دوسرے سے اختلاف اور دھڑہ بندیوں کی وجہ احادیث نبویؐ ہے لہذا بہتر یہی ہوگا۔ کہ احادیثِ نبویؐ کو ترک کر کے صرف قرآن مجید پر اکتفا کیا جائے۔ مگر چونکہ سنتِ رسولؐ

کی پیروی کے بغیر قرآن پر عمل کرنا محال بلکہ ناممکن ہے لہذا یہ طریقہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لہذا جب تک قرآن و سنت اور تاریخی حقائق کی روشنی میں مسلمان قوم کے سامنے اسوۂ رسولؐ کو ایک مکمل نظام حیات کی صورت میں پیش نہ کر دیا جائے اس وقت تک مسلمان کا نہ صرف قرآن پر عمل کرنا محال ہے بلکہ وہ امر بالمعروف اور ناہی عن المنکر بننے یا مکارم اخلاق کے زیور سے آراستہ ہونے کی صلاحیت بھی نہیں پا سکتا۔

پس ہمارے سامنے گیارھواں اہم تقاضا یہ ہے کہ قرآن کریم اور تاریخی شواہد کی روشنی میں احادیث نبوی کی دوبارہ چھان بین کی جائے۔ جو احادیث اسوۂ رسولؐ یا اتباع رسول یا اطاعت رسولؐ سے تعلق رکھتی ہوں اور قرآن کی عین تفسیر ہوں ان کو اختیار کیا جائے۔ کیوں قرآن کی آیت "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ"، "قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی الخ" اور "من یطع الرسول فقد اطاع اللہ" سے صاف ظاہر ہے کہ ہم صرف ان اعمال کے مکلف ہیں جو رسولؐ سے ظہور پذیر ہوئے یا جن کے کرنے کا انہوںؐ نے حکم دیا ہو۔ یعنی جن اعمال کو رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انفرادی یا اجتماعی زندگی کے لئے ایک رویہ، ایک مسلک اور ایک عملی پروگرام کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے رکھا ہو اور اسی حیثیت سے اُن پر عمل کیا اور کرایا ہو۔ یا جن کی اہمیت کے ساتھ تاکید فرمائی ہو وہ اطاعت رسولؐ اور اسوۂ رسولؐ اور اتباع رسولؐ ہے جن پر عمل کرنا ہمارے لئے ضروری امر ہے۔ اور جو احادیث

عمل سے تعلق نہیں رکھتیں یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان پہ عمل کرتے نہیں پایا گیا ہو یا وہ قرآن کے مطابق نہ ہوں تو ایسے مجموعے کو جمع کر کے رکھ دینے سے سوا اس کے اور کیا ہوگا۔ کہ قوم کو ایک طرف تو ذہنی انتشار میں مبتلا کیا جائے گا اور دوسری طرف آپس میں ایک دوسرے سے بحث وتمحیص اور مناظروں کی صورت پیدا کی جائے گی جس کا نتیجہ معلوم ہی ہے کہ خانہ جنگی اور فرقہ بندی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ لہذا احادیث کی دوبارہ چھان بین سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ تمام فرقوں اور گروہوں کے بڑے بڑے جید علماء اور محدثین کی ایک شوریٰ بنائی جائے جو احادیث کی تمام کتب کو سامنے رکھ کر قرآن اور تاریخی شواہد کی روشنی میں احادیث نبوی کا ایک ایسا متفق علیہ مجموعہ تدوین فرمادیں جو تمام مسلمانوں کے لئے ایک ہی لائحہ عمل کا کام دے سکے۔ تاکہ ایک طرف تو مسلمان اساتذہ اور طالب علموں کو احادیث کی گیارہ بڑی بڑی کتابیں پڑھنے کی بجائے صرف ایک ہی کتاب پڑھنی پڑے اور اس طرح ان کی عمر کا بیشتر حصہ بچ کر معیاری کاموں میں لگ سکے اور دوسری طرف اختلاف فیہ احادیث کی بجائے متفق علیہ احادیث کا مجموعہ سامنے آجائے تاکہ مسلمان مختلف الخیال، مختلف العقائد، مختلف المذاہب؛ فرقوں، گروہوں اور جماعتوں میں تقسیم ہونے کی بجائے صرف ایک ہی راہ (صراط المستقیم) پر گامزن ہوسکیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کی بھی آسانی ہو جائے کہ اس وقت اسلامی شریعت رائج کرنے کیلئے کونسی فقہ پر عمل درآمد کیا جائے۔

۱۲۔ قرآن مجید کو عملی طور پر پڑھانا

جس طرح کسی چیز کا علم حاصل کرنے کے لئے قلم اور مشاہدہ ہر دو کی ضرورت ہے۔ اسی طرح قرآن کو عملی طور پر پڑھانے کے لئے بھی ہر دو سے کام لینا ہوگا۔ مثلاً اگر ایک شخص ڈاکٹری علوم سیکھنا چاہتا ہے تو وہ یہ علوم دو طریقوں سے حاصل کرے گا۔ اول یہ کہ وہ ڈاکٹری علوم کو کتابوں میں پڑھے۔ اسے "علم بالقلم" کہتے ہیں۔ دوم یہ کہ وہ ان علوم کو کسی کے دیکھا دیکھی سیکھ لے۔ اسے "علم بالمشاہدہ" کہتے ہیں۔ کوئی شخص اس وقت تک سرجن یا ڈاکٹر صحیح معنوں میں نہیں بن سکتا جب تک کہ اس نے ان ہر دو طریقوں سے ڈاکٹری علوم کو حاصل کرنے کا درس نہ لیا ہو بعینہ اسی طرح قرآن کو عملی طور پر پڑھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھیجا اور فرمایا و انزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون ۝ (۱۴/۱۴ ، النحل ۶) ترجمہ: "اور آپ پر بھی یہ قرآن آتارا ہے تاکہ جو مضامین لوگوں کے پاس بھیجے گئے ہیں، ان کو آپ ان سے ظاہر کر دیں اور تاکہ وہ فکر کیا کریں۔"

لہذا ہمارے سامنے جو اہم تقاضا ہے وہ علم بالمشاہدہ کو حاصل کرنا اور قرآن کو عملی طور پر پڑھنے کا ہے کہ آیا آج ہم علم بالمشاہدہ کن حضرات سے حاصل کریں؟ جبکہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام خود موجود نہیں ہیں۔ اور قرآن مجید کو عملی طور پر پھر کس طرح پڑھ سکتے ہیں؟ سو علم بالمشاہدہ تو ہمیں ان لوگوں سے حاصل کرنا ہوگا جن میں اتباع رسولؐ کامل و اکمل طریقہ

پر موجود ہو یعنی جو اسوۂ حسنہ کا پیرو ہو اور رسولؐ کا اسوہ حسنہ خود قرآن ہے یعنی جو شخص قرآن مجید کی ایک ایک آیت پر عمل کرتا ہو وہی اس قابل ہے کہ اس کی پیروی میں علم بالمشاہدہ حاصل کر لیا جائے۔ اور جہاں تک قرآن کو اجتماعی صورت میں عملی طور پر پڑھنے یا پڑھانے کا تعلق ہے تو اس کے لئے ہمیں مندرجہ ذیل تجاویز پر عمل درآمد کرنا ہوگا:۔

۱۔ اول یہ کہ اس وقت ہمارے سامنے قرآن مجید کی کئی تفاسیر موجود ہیں عوام الناس کے سامنے سب سے پیچیدہ مسئلہ یہی ہے کہ آیا قرآن مجید کے فلاں فلاں لفظ کا صحیح ترجمہ کیا ہے؟ اس کی تفسیر اور اس کا صحیح مفہوم صحابہ کرامؓ نے کیا لیا تھا؟ اس کے لئے ہمیں سب سے پہلے یہ کرنا ہوگا کہ تمام فرقوں، گروہوں اور جماعتوں کے جید علماء اور مفسرین حضرات کو بٹھا کر ایک ایسا متفقہ مجموعہ تیار کرایا جائے کہ جس کے ترجمہ پر تمام علماء اور مفسرین حضرات متفق ہوں۔ پھر اس ترجمے کے علاوہ باقی تمام ترجمے اور تفاسیر بند کر دی جائیں تاکہ تمام دنیا کے سامنے قرآن مجید کا صرف ایک ہی ترجمہ، ایک ہی مفہوم آجائے۔ اور قرآن کو منطقی الجھنوں، انسانی تخیلات اور وہم کی آمیزش سے نجات دلا کر اس کے لپیٹے ہوئے مضامین اور اپنے فطری احکام کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ قرآن کی قرأت کا صحیح تعین کیا جائے دنیائے اسلام کے بڑے بڑے قاریوں اور عربی زبان کے ادیبوں کا ایک اجتماع بلایا جائے۔ اور پھر اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ آیا یہ قرآن مجید نثر

ہے یا شعر؟ تقریر ہے یا گیت؟ اور اس کی صحیح فطری قرأت کیسی تھی؟ یا پھر اس کی ایک ایسی نئی قرأت ایجاد کی جائے جو فطرت کے عین مطابق بھی ہو اور معروف، منکر، بشارت، نذارت، مکالمہ، قصص اور دعا جیسے مضامین بھی اس میں پوری طرح ادا ہو سکیں۔ تاکہ نہ تو شامی، حجازی، مصری اور دیگر قسم کی قرأتوں کا جھگڑا رہے اور نہ ہی عجمی لوگ قرآن مجید کو گیت بنا کر گانے کا طریقہ اختیار کر سکیں اور ساتھ ہی ساتھ ان الفاظ کا بھی تصفیہ ہو جائے جس پر علماء حضرات نے پارٹی بازیاں بنا بنا کر قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ چونکہ مدت سے ملت اسلامیہ کے بعض ممالک نے عربی زبان کو ترک کر دیا ہے۔ اور حکومت کی ملازمتوں کا معیار قرآن سے ہٹا کر حکومت کی سرکاری زبان کو ملازمتوں کا معیار قرار دیدیا ہے۔ لہذا عربی زبان کو سیکھنے یا قرآن کو باترجمہ پڑھنے کی دنیوی ضرورت چند اں مسلمان معاشرے کے سامنے باقی نہیں رہی ہے۔ لہذا اس بات کی ضرورت ہے کہ تمام ممالک اسلامیہ میں سرکاری زبان عربی قرار دی جائے اور ملازمتوں میں ترقی کا معیار قرآن و سنت کی اتباع اور قرآن کا زیادہ سے زیادہ باترجمہ جاننا رکھا جائے تمام سکولوں، مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں قرآن مجید کو لازمی مضمون رکھا جائے تاکہ قرآن ایک دفعہ پھر مسلمانوں کی دلچسپی کا مضمون بن سکے اور مسلم معاشرہ فتوے باز ملاؤں کی زد سے بچکر خود اپنے اندر دین اسلام کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرے تاکہ

ہمارا ہر طالب علم ہر سرکاری ملازم اور ہمارے تمام حکام اظہارِ دین حق کی صلاحیت اپنے اندر خود بھی رکھ سکیں۔

۴۔ اور چوتھے یہ کہ قرآن مجید کو منہاج النبوت (یعنی فطری تنزیل) کے مطابق پھر ایک ایک مسئلہ کی صورت میں ملت اسلامیہ کے سامنے بالترتیب پیش کیا جائے اور تمام مسلم معاشرے کو اجتماعی اور انفرادی طور پر صرف اور صرف اسی ایک مسئلہ کی آیتوں کی حامل و عامل بنایا جائے جو امیر کی طرف سے پیش ہو۔ تاکہ ایک طرف تو تمام مسلمان قوم میں اتحاد عمل پیدا ہو۔ اور دوسری طرف قرآن اپنی فطری تنزیل اور منہاجِ نبوت کے مطابق دنیا کے سامنے ایک ایک آیت کی صورت میں پیش ہو۔

غرض بارھواں تقاضا جو ہمارے سامنے ہے وہ قرآن کو منہاجِ نبوت کے مطابق قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح اپنی فطری تنزیل کے ساتھ عملی طور پر پڑھنا اور پڑھانا ہے۔

۱۳۔ اقامتِ دین

تیرھواں تقاضا جو ہمارے سامنے ہے وہ شریعتِ اسلامی کا نفاذ ہے

الحمدللہ ہمیں اس بات کا فخر حاصل ہے کہ ہماری حکومت نے قرآن وسنت کے مطابق ملک کا آئین بنانے کا قانون منظور کر لیا ہے لیکن جب تک اس بات کا فیصلہ نہیں ہوا ہو کہ آیا ہمارے ملک کی فقہ کیا ہو گی تب تک ہم ایسا قانون بنانے سے قاصر ہیں۔ جو تمام فرقوں جماعتوں اور گروہوں کو قابلِ قبول ہو۔ چونکہ حکومت کی فقہ

اس ملک کے باشندوں کی فقہ ہوتی ہے لہذا اس بات کی ضرورت ہے کہ
ہم تمام جماعتوں، گروہوں اور فرقوں کے جید علماء کو بٹھلا کر متفق علیہ
احادیث، قرآن، تاریخ اور سابقہ فقہا کی کتب کی روشنی میں ایک ایسی
فقہ تیار کر لیں جو تمام جماعتوں، فرقوں اور گروہوں کے افراد کو قبول
ہو سکے لیکن یہ کام تب انجام پذیر ہو سکتا ہے کہ ہم پہلے تمام جماعتوں،
فرقوں اور گروہوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ان تمام کے اتفاق
سے صالح قیادت کو برسر اقتدار لے آئیں اور وہ برسر اقتدار طبقہ ایسا
ہو جس کو تمام جماعتوں اور گروہوں کا تعاون حاصل ہو تاکہ وہ عوام کے
تعاون اور اپنی مخلصانہ خدمات سے مخلص ترین علماء کا ایک اجتماع
بلا کر ان کی وساطت سے ایک ایسی فقہ بنا سکے جو تمام جماعتوں اور گروہوں
کو قبول ہو سکیں۔ اقامت دین میں ہمارے سامنے اول تقاضا یہ ہے کہ
ہم تمام جماعتوں کے تعاون سے صالح قیادت کو برسر اقتدار لا کر
اسلامی شریعت کا اعمل کا کام سرانجام دیں۔
دوم کام اس سلسلہ میں ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہم معاشرے کو بھی
اس شریعت کی پیروی کے لئے تیار کر لیں جو قرآن و سنت کی روشنی میں بنائی
جائے گی۔ کیونکہ جب تک معاشرہ ایک قانون کو ماننے اور اس پر خلوص
نیت سے عمل کرنے کے لئے تیار نہ ہو تب تک کسی قانون کا کما حقہ رائج
ہونا محال بلکہ ناممکن ہے، اور اس کے لئے ہمیں مہذبین و صالحین کی ایسی
باعمل جماعت بنانی ہو گی جو اپنے عمل و کردار سے نمونہ بن کر عوام اس

کی اصلاح کا کام انجام دے کر اسلامی شریعت کو نافذ کرنے کے لئے میدان ہموار کر دے۔

۱۴۔ مسلمانوں کے دلوں میں جہاد کا ولولہ پیدا کرنا

کسی قانون کو باسانی رائج و نافذ کرنے کا واحد علاج سپاہیانہ زندگی ہے۔ جس قوم میں سپاہیانہ زندگی موجود ہوگی وہ نہ صرف یہ کہ ایک زندہ قوم شمار ہوگی بلکہ اس میں بلا چون وچرا اطاعت کا مادہ بھی پیدا ہوگا اور جس قوم میں بلا چون وچرا اطاعت کا مادہ پیدا ہو جائے اس پر کسی قانون کا نفاذ کرنا بھی بہت آسان ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں جس قوم میں فوجی زندگی موجود ہو اس سے دشمن قومیں بھی مرعوب ہوتی ہیں۔ تمام ہمسایہ طاقتیں ان کی فوجی طاقت اور سپاہیانہ یا جنگجویانہ زندگی پر نظر رکھتی ہیں اور چونکہ قرآن کا یہ حکم ہے کہ: یا ایہا النبی حرض المومنین علی القتال ․ اے نبی مومنوں کو قتال (جنگ) کے لئے تیار کرو۔ لہذا چودھواں اہم تقاضا ہمارے سامنے یہ ہے کہ عوام الناس کو سپاہیانہ زندگی کی تعلیم دیں اور ان کے دلوں میں جہاد فی سبیل اللہ کا ولولہ پیدا کر دیں کیونکہ منہاج النبوۃ کے اتباع کی خاطر بھی ہم پر یہ فرض ہے کہ ہم تمام مسلمانوں کو جہاد فی سبیل کے لئے تیار کریں۔ اس بارے میں ہمیں مندرجہ ذیل تجاویز پر عمل درآمد کرنا ہوگا۔

(۱) اول تمام سکولوں، مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں

فوجی تعلیم لازمی کرنا ہوگی۔

۲۔ دوم تمام غیر سرکاری اداروں، کارخانوں، ملوں، کانوں وغیرہ میں ملازمین کو فوجی تعلیم دینی ہوگی۔

۳۔ سوم تمام محلوں اور چوکوں میں فوجی پریڈ اور فوجی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔

۴۔ چہارم تمام سول محکموں کو فوجی محکموں کے ساتھ مشترک کرنا ہوگا۔ تاکہ بروقت ضرورت ہمارے سول دفاتر کے ملازم بھی فوجی نوجوان کا کام دے سکیں اور اخراجات میں بھی کمی واقع ہو۔

۵۔ پنجم یہ کہ ملک بھر میں عوام الناس کو رائفل، ریوالور، اور دوسرے جنگی آلات رکھنے کی آسانی دی جائے۔ تاکہ عوام کو جدید جنگی سامان اور جنگ کے جدید طور طریقے سے دلچسپی رہے۔ اور وقت آنے پر تھوڑی تعلیم بھی ان کو ایک تعلیم یافتہ فوجی سپاہی کے برابر بنا سکے، ہاں البتہ عوام الناس کو ساتھ ساتھ یہ قرآنی تعلیم بھی دی جایا کرے کہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو ناحق قتل کرے گا تو قرآن مجید کی رُو سے اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور وہ خدا کے غضب کا مستحق ہوگا۔

۶۔ اور چھٹے یہ کہ ملک بھر میں تمام کھیلوں اور ورزش کے طریقوں کو جنگی کرتبوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ تاکہ کھیل کا کھیل اور ساتھ ہی ساتھ قوم کے نوجوان فوجی سپاہی اور جنگجو یا نہ قوم کے افراد بھی بنتے جائیں۔ قرونِ اولیٰ میں مسلمان اسی طرح جنگجو بن گئے تھے کہ رسول علیہ

الصلوٰۃ والسلام نے ان کو مسجد نبوی میں بھی گتکہ بازی، شمشیر زنی، اور تیروں سے نشانہ بازی کی اجازت دی تھی اور صبح و شام قوم کے نوجوانوں کو یہی تعلیم دیجاتی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو وہ خود جنگجو اور بہادر بنتے گئے اور دوسری طرف دشمن ان کے جنگی کرتبوں سے مرعوب ہوتے گئے۔

۷۔ اور ساتویں یہ کہ عوام الناس کو بھی فوجی لباس میں رہنے کی تعلیم دی جائے۔ بلکہ فوجی لباس کو قومی لباس کا رنگ دیا جائے تا کہ دوسرے ملکوں کے باشندے جب ہمارے ملک میں آئیں تو ان کو ہماری تمام قوم فوجی ہی فوجی نظر آئیں اور اس طرح ہماری سپاہیانہ زندگی، ہمارا فوجی لباس، ہمارے جنگ کے طریقوں کا سیکھنا۔ ہمارے عام و خاص کا جنگی اسلحہ کو استعمال کرنا۔ دنیا والوں پر ہماری دھاک بٹھا دے۔

۱۵۔ اسلامی معاشی انقلاب

اس وقت روئے زمین پر دو قسم کا نظام اپنی شان و شوکت کے ساتھ کارفرما ہے۔ ایک طرف سرمایہ دارانہ سامراجیت کا تسلط ہے۔ جس نے اکثر حکومتوں کو اپنے زیر اثر رکھا ہوا ہے اور دوسری طرف کمیونزم نے آدھی دنیا سے زیادہ علاقے کو اپنے اثر کے اندر لے لیا ہے۔ دنیائے اسلام بھی ان ہر دو اثرات سے بری طرح متاثر ہو چکی ہے ایک طرف تو بعض مسلمان ممالک روس کی اسلام دشمنی کے جال میں پھنس کر دجالیت و لادینی کے فلسفے کو دیدہ و دانستہ اسلامی ممالک

میں اُٹھنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

اور دوسری طرف بعض اسلامی ممالک سرمایہ دارانہ سامراجیت سے متاثر ہو کر ایک اسلامی بلاک کو بنانے کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں۔

لہذا ہمارے سامنے پندرھواں مگر اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ ہم ایک طرف اسلامی طرز پر معاشی انقلاب برپا کر کے نہ صرف مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی کو دور کر دیں اور مسلم ممالک کے مسلمان، کسانوں، مزدوروں، محنت کشوں اور مسلم معاشرے کو کمیونزم کے لادینی فلسفہ سے بھی بچائیں۔ اور سرمایہ دارانہ نظام کے تسلط سے بھی آزاد کریں بلکہ سارے عالم کو کمیونزم اور سرمایہ داری کے آہنی پنجوں سے نجات دلا دیں۔

پس اگر ہم اسلامی طرز کے اس معاشی انقلاب (جس کا مقصد ملت اسلامیہ اور عالم انسانیت کو روسی اشتراکی نظام اور مغربی سرمایہ دارانہ نظام ہائے سے نجات دلانا ہے) کو برپا کرنے کے لئے تیار ہوں تو پھر ہمیں نہایت مخلصانہ انداز میں ذیل کی تجاویز پر غور و فکر کرنا چاہئے جو دراصل اسلامی، معاشی انقلاب کے لئے ایک عارضی خاکہ کی صورت میں پیش کی جا رہی ہیں:

۱۔ **عوامی حکومت کا قیام**:۔ پہلی تجویز یہ ہے کہ ہر اسلامی ملک میں عوامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ آج کل عوامی حکومت سے جو مراد لی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مغربی طرز کے جمہوری نظام کے تحت عوام سے ووٹ لے کر نمائندے چنے جاتے ہیں۔ اور پھر یہ نمائندے

قومی اسمبلی میں اپنا ایک لیڈر منتخب کر لیتے ہیں اور اس طرح صدر، وزیر اعظم، اور دیگر وزراء وجود میں آجاتے ہیں۔ ہم اس طریقۂ انتخاب پہ مغربی جمہوریت کی شق میں کچھ بحث کر چکے ہیں۔ مزید مفصل بحث سیاسی انقلاب کی شق میں ہوگی جو اس سلسلے کی دوسری تصنیف "جمعیت تجدید الاسلام کا منشور" میں آپ کے سامنے آئے گی۔ سر دست ہمارے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ غریب عوام کی نمائندگی کیسے ہو؟ اس سوال کا جواب دینے سے قبل موجودہ جمہوری نظام کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہے۔ تاکہ ہم پہلے جان لیں کہ شخصی نظام حکومت جمہوری طرز حکومت میں کیونکر تبدیل ہوا۔

یہ تو بتلایا جا چکا ہے کہ پہلے فرانس اور امریکہ کے مطلق العنان حکمرانوں اور بعد میں زار شاہی جیسے حکمرانوں سے جب خلق خدا تنگ آگئی اور عوام کے بعض مفکرین نے اپنی تحریر و تقریر سے غریبوں کو للکارا اور انہیں اس بات کے لئے منظم کرنا شروع کر دیا کہ یہ حکومتیں اور یہ بڑی بڑی عمارتیں تمہاری ہڈیوں پہ کھڑی کی جا رہی ہیں۔ تمہارا ہی خون پسینہ ان پر خشک ہو رہا ہے۔ لہذا ان پہ اقتدار بھی تمہارا ہی ہونا چاہیئے۔ مزدوروں نے ان باتوں پر یقین کر کے ان کا ساتھ دیا اور اپنے حقوق کو سرمایہ داروں سے چھیننے کے لئے آگے بڑھے جب یہ مسئلہ حکمرانوں کے سامنے آیا تو انہوں نے غریب عوام کو مطمئن کرنے کے لئے عوامی، جمہوری حکومت بنانے کا اعلان ان الفاظ میں کیا کہ آئندہ کوئی شخص عوام کی مرضی کے خلاف حکمران نہ بن سکے گا۔ ہر شخص عوام ہی کی رائے

سے حکومت کی گدی تک پہنچ سکے گا۔ یہ بظاہر بڑا رنگین نعرہ تھا، اور اس نے عوام کو بڑی حد تک مطمئن کر دیا۔ ان کا خیال ہوا کہ اب تو بس جو بھی حکومت قائم ہوگی وہ عوامی حکومت ہی ہوگی۔ ہمارے اپنے ووٹوں سے ہماری مرضی کے مطابق لوگ برسر اقتدار آویں گے۔ مگر سرمایہ دار حکمران اندر ہی اندر سادہ لوح عوام کی اس بیوقوفی اور سادہ دلی پہ قہقہے مارا کرتے تھے۔ کیونکہ انہیں خوب علم تھا کہ نانِ شبینہ کا محتاج مزدور، افلاس و تنگدستی کا مارا ہوا تباہ حال غریب، اور اپنے آپ پہ قدرت نہ رکھنے والا، احساس کمتری میں مبتلا ملازم، ووٹ کی قدر کیا جانے؟ یہ ووٹ تو ہم ان سادہ عوام سے چند کوڑیوں کے بدلے خرید کر پھر ان پر حکمران ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آج تک ہو رہا ہے۔ کہ جمہوری عوامی حکومتوں میں برسر اقتدار طبقہ اپنی حکومت کے زور سے سیاسی لیڈر اپنی سیاسی چالوں سے، سرمایہ دار اپنی دولت کے بل بوتے پر جاگیر دار، کارخانہ دار اور زمیندار، مزدوروں، محنت کشوں اور کسانوں کو کام سے ہٹا دینے کے رعب و داب سے غریب و بے بس عوام کے ووٹ خریدتے ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ کسی ملازم کو اپنے مالک کے خلاف کسی کسان کو زمیندار و جاگیردار کے خلاف کسی غریب کو امیر کے خلاف آواز تک اٹھانے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ اور ان کے دیکھتے دیکھتے وہی جاگیردار، کارخانہ دار، زمیندار سرمایہ دار اور وہی سیاسی حکمران جن سے کل دنیا تنگ تھی آج پھر برسر اقتدار ہے غریب اور متوسط درجے کے لوگوں میں سے کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا

اور دعوئی یہ ہے کہ یہ حکومت عوامی جمہوری حکومت ہے۔ ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

اور یہ سلسلہ ختم ہوتا نظر نہیں آتا، اگر یہی حال رہا تو ناممکن ہے کہ کسی بھی ملک میں صحیح قسم کی عوامی حکومت قائم ہو یا کسی بھی ملک میں غریب و متوسط درجے کے لوگوں کو نمائندگی مل سکے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ غریبوں کے اپنے نمائندے علیحدہ ہوں اور سرمایہ داروں کے علیحدہ۔ اس کا طریقہ یہ ہو کہ غریب اور متوسط درجے کے لوگوں کے ووٹ ان کے اپنے نمائندوں کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں۔ جو انہی میں سے ہوں۔ اور امیروں، جاگیرداروں، کارخانہ داروں، سرمایہ داروں اور ہزاروں روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والوں کے ووٹ ان کے اپنے نمائندوں کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں جو انہی میں سے ہوں۔ ووٹروں کی فہرستیں بھی الگ الگ مرتب کی جائیں۔ غریب اور متوسط طبقے کے ووٹر صرف غریب و متوسط طبقے کے نمائندوں کو ووٹ دیں اور اسی طرح سرمایہ والے سرمایہ دار نمائندے کو چنیں۔ انتخابی حلقے طبقات کی تعداد کے لحاظ سے بنائے جائیں اور تعداد کے لحاظ ہی سے نمائندگی دی جائے۔

اس طرح امیروں کے نمائندے امیر۔ اور غریب و متوسط درجے کے لوگوں کے نمائندے غریب و متوسط درجے کے لوگ ہوں۔ اور وہ ایک دوسرے سے دولت، غربت، امارت اور ملازمت کی وجہ سے متاثر نہ ہو سکیں۔ تاکہ حق حقدار کو ملے۔ صحیح معنوں میں عوامی حکومت کا قیام

وجود میں آ سکے اور ایسی ہی حکومت میں تمام طبقات کی صحیح نمائندگی ان کی تعداد کے مطابق ہو سکے گی اور ان کے حقوق محفوظ رہ سکیں گے اور ایسی ہی حکومت صحیح معنوں میں عوامی حکومت کہلائی جا سکے گی۔

۲۔ قومی ملکیت :۔ سرمایہ داروں اور مزدوروں میں یہ صبح و شام کے جھگڑے مدتوں سے چلے آ رہے ہیں۔ اگر لاکھ تدابیر کیوں نہ کی جائیں، خود حکومت ان کی اصلاح میں دلچسپی کیوں نہ لے۔ مگر سرمایہ دار اور مزدور کا یہ فطری جھگڑا جو ابتداء سے چلا آ رہا ہے نئی سے نئی صورت اختیار کرتا چلا جائے گا۔ اور ختم ہونے کا نام تک نہ لے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مزدور اور سرمایہ دار اپنی اپنی جگہ حرص اور لالچ میں مبتلا ہیں۔ سرمایہ دار کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ دولت کما لوں اور مزدور کی خواہش یہ ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ اجرت پا سکوں اور حرص چونکہ فطری چیز ہے جو انسان کے خمیر میں موجود ہے۔ لہذا اس کشمکش کا علاج اس کے سوا نہیں کہ بڑی بڑی سرمایہ داریوں اور سرمایہ کاریوں کو ختم کرنے اور مزدوروں کو اپنا جائز حق دلانے کی خاطر صنعت و حرفت کے تمام بڑے بڑے اداروں کارخانوں، ملوں، معدنیات کی کانوں، جاگیروں اور بڑی بڑی تجارتوں کو حکومت قومی ملکیت قرار دے کر اپنے قبضہ میں لے لے۔ اور ان کے مالکوں کو پورا پورا معاوضہ دے تاکہ انہیں بھی اپنا لگایا ہوا سرمایہ ہاتھ آ کر مزید کسی کام کو کرنے کا موقع ملے اور اس طرح انہیں بھی تباہی سے بچایا جا سکے اس کاروبار سے جو اصل منافع ہوا اس کا خمس یعنی بیس[20] فیصدی

حکومت خود لے کر باقی اسّی فیصدی منافع میں سے بیس فیصدی منافع اس صنعت کے چلانے والوں، ملازموں اور کارندوں میں تنخواہ کے تناسب کے لحاظ سے تنخواہ کے علاوہ سالانہ بونس کے طور پر تقسیم کیا جائے۔ بیس فی صدی منافع محفوظ رکھا جائے تاکہ اگر کسی وقت صنعت میں نقصان واقع ہو جائے تو اسے اس جمع شدہ رقم سے پورا کیا جا سکے۔ اور اگر دس سال تک کوئی نقصان نہ ہو تو پھر اس جمع شدہ رقم کو دوبارہ صنعت پر ڈالا جائے تاکہ صنعت میں مزید ترقی ہو۔ مذکورہ بالا منافع میں سے جو چالیس فیصدی منافع بچتا ہے اس میں سے بیس فیصدی تو کارندوں و ملازموں وغیرہ کے لئے مخصوص کیا جائے اور باقی بیس فیصدی کو معاوضہ اوقات اور پنشن وغیرہ کے لئے محفوظ کیا جائے۔ اس طرح نہ تو کبھی سرمایہ داری بڑھ سکے گی اور نہ ہی مزدور و محنت کش کو کسی قسم کی شکایت رہ سکے گی اور جب مزدور کو شکایت ہی نہ رہے گی۔ تو وہ اشتراکیت کے جال میں پھنس کر کمیونزم کے دجل کا شکار بھی نہ ہوگا اور نہ ہی لادینی کے فلسفہ کو اسلام پر ترجیح دے گا۔

۳۔ لیبر ویلفیر (بہبودی مزدوران): کچھ مدت سے مزدور یونینوں کی میں ہڑتالوں، شر فساد برپا کرنے، انتشار پھیلانے اور ملک میں تخریبی کاروائی کرنے کا خوب رواج پڑ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر ملکی ایجنٹ (ففتھ کالمسٹ) عموماً ان انجمنوں، یونینوں، کمیٹیوں، ایسوسی ایشنوں اور اداروں میں گھس جایا کرتے ہیں۔ جہاں تخریبی عناصر پائے جاویں۔ پھر ان تخریبی عناصر کے ذریعہ یہ لوگ ملک بھر میں فساد برپا کرتے ہیں، انتشار پھیلاتے ہیں۔ بات بات پر مزدوروں

سے ہڑتالیں کرواتے ہیں اور ان ہنگامہ آرائیوں سے فائدہ اٹھا کر وہ تخریبی کاروائیاں کر کرا کے ملک کے اقتصادیات کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کا علاج یہ ہے کہ ان تمام انجمنوں، یونینوں، کمیٹیوں اور اداروں کو ختم کیا جائے جو آئے دن ملک میں فساد برپا کرنے اور انتشار پھیلانے کا موجب بنتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سخت سزا دی جائے جو تخریبی کاروائیاں کر کے ملک اور قوم کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اور ایسی تمام ہڑتالوں کو جرم قرار دیا جائے جو غیر ضروری طور پر آئے دن کی جاتی ہیں اور ملک کی اقتصادیات کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ اور ان سب کے بجائے لیبر و یلفر کے اصولوں پر خود مزدوروں ہی پر مشتمل "بہبودیٔ مزدوران" کے نام سے ایک ایسا بورڈ بنایا جائے جو مزدوروں کے مطالبات پر غور کرنے اور ان کو آگے تک پہنچانے کا کام سرانجام دے۔

۴۔ **تنخواہوں کی معیار بندی**:۔ قوم اور ملک کی اقتصادی بدحالی کی ایک وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ تو حد سے زیادہ تنخواہ پا کر نہ صرف قوم اور ملک پر بوجھ ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اپنی زائد از ضرورت آمدنی کے بل پر ناچ گھروں کلبوں، قحبہ خانوں میں رنگ رلیاں مناتے اور قوم کے اخلاق کا دیوالہ نکالنے کا موجب بنتے ہیں۔ لہذا اس کا بہترین علاج یہی ہے کہ مثلاً آج کل کے معیار کے لحاظ سے چار سو روپے سے کم تنخواہ پانے والوں کی تنخواہ تو زیادہ کر دی جائے اور ایک ہزار روپے سے زائد تنخواہ پانے والوں کی تنخواہ اسی نسبت سے کم کر دی جائے تاکہ "خیر الامور اوسطہا" کے مطابق ایک طرف تو مزدور پیشہ لوگوں کو انتہائی غربت سے بچایا جا سکے اور

دوسری طرف امیروں کو انتہائی امیر ہونے سے روکا جا سکے۔

۵۔ محصولات :۔ عوام الناس کی اقتصادی خوشحالی کی خاطر سب سے بڑا اقدام ان ٹیکسوں اور محصولات کا ختم کرنا ہے، جو غیر ضروری طور پر ان پر عائد کئے گئے ہیں۔ دراصل ان ٹیکسوں کا نہ صرف ملک کی اقتصادیات پر ہی برا اثر پڑتا ہے۔ اور عام استعمال کی ضروری اشیاء ان ٹیکسوں اور محصولات کی وجہ سے حد سے زیادہ مہنگی ہو جاتی ہیں، بلکہ منشی اشیاء اور غیر ضروری چیزوں کا رواج بھی ان ٹیکسوں کی وجہ سے جاری رہتا ہے مثلاً حکومت شراب اس لئے بند نہیں کرتی کہ اسے اس سے کافی ٹیکس مل جاتا ہے۔ تمباکو کے اگانے اور بیچنے پر پابندی اس لئے نہیں لگائی کہ اس سے اکسائز ڈیوٹی آتی ہے۔ اس کے علاوہ آئے دن ان نام نہاد امدادی کمیٹیوں وغیرہ کی قسم کے اداروں سے عوام الناس کو لوٹا جاتا ہے حکومت کو ان کے نیت اور قوم کی دولت کو لوٹ لینے کا خوب علم ہے مگر چونکہ حکومت ان سے ٹیکس وصول کرتی ہے لہٰذا ان کو بند کرنے کا نام نہیں لیتی۔ غرض حکومت کے کارندے ٹیکس اور محصول کی خاطر ایسی اکثر چیزوں کو رواج دینے سے باز نہیں رکھتے جن کا حقیقت میں نفع سے نقصان زیادہ ہوتا ہے اور جو قوم اور ملک کے لئے نہایت ہی مضر ہوتے ہیں۔

لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ کسٹم ڈیوٹی کے علاوہ تمام نامناسب اور غیر ضروری ٹیکسوں اور محصولوں کو ختم کر دیا جائے۔ انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس کے بجائے زکوٰۃ ٹیکس مقرر کیا جائے اور یہ رقم قوم اور ملک کے دفاع اور فلاح و بہبود پر لگایا جائے۔ محصول چنگی صرف ایک دفعہ لی جایا کرے اور

جس مال پر ایک دفعہ چنگی لی جائے اس پہ باقاعدہ مہر لگائی جائے تاکہ دوبارہ اس پر محصول وصول نہ ہو۔

۴۔ **صدقات و خیرات** : مسلمانوں نے کچھ مدت سے خدمت خلق کا اصل نصب العین بھلا کر چند دار العلوم، شفا خانوں، تییم خانوں، کو عوام کے خرچ پہ چلانے کا نام خدمت خلق رکھ دیا ہے حالانکہ اگر ذرا ان اداروں کو اندر سے جا کر مشاہدہ کیا جائے، تو ان میں بیشتر ادارے ایسے بھی ملیں گے جن میں یا تو چند افراد کے ذاتی مفاد پنہاں ہوتے ہیں اور یا وہ کسی گروہ کو فروغ دینے کے ذرائع کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ مگر ان سب سے بڑھ کر جو بات قابل غور ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان اداروں کا اکثر دارومدار، زکوٰۃ، صدقات فطرانہ اور قربانی کی کھالوں پہ ہے۔ جو اسلام نے صرف غریب، قرابت دار ہمسایہ اور بے آسرا لوگوں کی اقتصادی بدحالی کو دور کرنے کی خاطر سرمایہ داروں کے ذمہ لگایا تھا۔ تاکہ غریب اور امیر کے درمیان اخوت، مساوات کا ایک رابطہ قائم رہ سکے۔ اور غریب عوام سرمایہ داروں سے مایوس ہو کر کمیونزم جیسی تحریکوں کا شکار نہ ہو سکیں نیز افلاس و ناداری اور معاشی تنگ حالی کے باعث چوری، ڈکیتی اور رشوت خوری جیسے جرائم کے مرتکب نہ ہوں۔ لیکن جب یہ صدقات، خیرات، فطرانہ اور قربانی کی کھالیں یہ ادارے، انجمنیں اور گروہ لے جائیں۔ تو پھر امیر اور غریب کے درمیان اخوت و مساوات اور باہمی رابطہ قائم کرنے کا کون سا وسیلہ باقی رہ جاتا ہے؟ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فلاح و بہبود کے کام شلاً مدرسے، ہسپتال، یتیموں

اور اداروں کی سرپرستی وغیرہ وغیرہ حکومت کی ذمہ داری میں شامل نہیں ؟ کیا حکومت عوام الناس سے محصول ٹیکس وغیرہ فلاح و بہبود ہی کے کاموں کے انجام دہی کی غرض سے وصول نہیں کر رہی ہے ؟ اور اگر یہ ایسی حقیقت ہے جس میں ذرا برابر مبالغہ نہیں۔ تو پھر کیوں نہ ان تمام اداروں، انجمنوں اور سوسائٹیوں کو حکومت لازماً ایسی اعانت دے کہ یہ خیرات و صدقات کے محتاج نہ رہیں اور عوام الناس کے متمول افراد صدقات، فطرانہ، قربانی اور دیگر خیر خیرات کرتے ہیں ان اداروں، انجمنوں اور جماعتوں کے واسطے سے آزاد ہو جائیں۔ تاکہ ان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر ان صدقات و خیرات سے اپنے قرابت داروں، ہمسایہ داروں اور غریب عوام کی براہ راست خدمت کرنے کا موقع مل سکے۔

اس طرح ایک طرف تو غریب اور امیر کے درمیان اخوت، محبت اور مساوات کا ایک فطری رابطہ پھر سے قائم ہو سکتا ہے۔ اور دوسری طرف صدقات، خیرات، فطرانہ اور قربانی کو غیر ضروری طور طریقوں پر صرف کرنے کی بجائے صحیح مصرف پر لگایا جا سکتا ہے۔

۷۔ بے روزگاری کا خاتمہ:۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں بھوک اور بیکاری کو دور کرنا ایک ضروری اور اہم مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں لیڈر حضرات، اخبارات کے ایڈیٹر، اور حکمران اس مسئلے کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ دنیا کے دوسرے متمدن ممالک میں مرد و زن جھوٹے بڑے اور خاندان کے تمام اہل قوت اپنی اپنی استطاعت کے مطابق یا تو کام

کر کے اپنی روزی خود کماتے ہیں یا کسب و ہنر سیکھنے کی جد و جہد میں مصروف رہتے ہیں۔ لیکن ہمارے عوام کی حالت یہ ہے کہ خاندان میں ایک یا دو افراد کمانے والے اور دس کھانے والے ہوتے ہیں۔ حالانکہ اسلام نے ہر اہل قوت فرد کو اپنی استطاعت کے مطابق اپنی روزی آپ کمانے کا حکم دیا ہے۔ داعیٔ اسلام (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کا ارشادِ گرامی ہے:-

"جائز وسائل سے اپنے لئے معاش پیدا کرنا (فرض) عبادت کے بعد تمہارا سب سے پہلا فرض[1]"۔ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:- "صبح کی عبادت سے فارغ ہونے کے بعد اپنی روزی پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ اور اس کے لئے محنت و مشقت کئے بغیر رات کو بستر پہ نہ جاؤ[2]"۔ ایک موقع پر معاشی جد و جہد کو بہت اہم قرار دیتے ہوئے فرمایا:- "تمہارے بہت سے گناہوں کا کفارہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب تم محنت و مشقت سے اپنی روزی آپ پیدا کرنے کی کوشش کرو[3]"۔ خلیفۂ دوم (حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا قول ہے:- "خبردار! طلب معاش کی جد و جہد سے غافل ہو کر کبھی نہ بیٹھنا چاہیئے[4]"۔

---

[1] کنز العمال جلد دوم۔

[2] " " "

[3] الاوسط طبرانی اور الحلیہ نعیم

[4] احیاء العلوم جلد دوم صفحہ ۵۴

اس قول کی تشریح میں غزالیؒ کی مشہور تصنیف "احیاء العلوم" کے شارح علامہ مرتضےٰ زبیدی لکھتے ہیں "آدمی پر فرض ہے کہ وہ معاش حاصل کرنے کے رائج الوقت پیشوں میں سے کسی پیشے کو ضرور اختیار کرے اور اس طرف سے غفلت ہرگز نہ برتے"۔[1]

لیکن افسوس! کہ ہمارے مسلمان اس اہم فریضے کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں خام اشیاء کی کمی نہیں اگر انہی کو قابلِ استعمال بنانے کے لئے کارخانے کھولے جائیں تو بے روزگاری میں بہت کمی واقع ہو سکتی ہے۔ ہمارے ہاں کوئلہ، پٹرول، گندم، گندھک، لوہا، سرمہ، پنسل اور دیا سلائی بنانے کی لکڑی، پٹ سن، کپاس، ریشم، کچا چمڑہ اور پھل وغیرہ کی فراوانی ہے۔ لیکن افسوس! کہ ان اشیاء سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے ہمارے یہاں اتنے کارخانے نہیں بنائے گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا بیشتر خام مال باہر چلا جاتا ہے۔ جو وہاں خام صورت میں تو کوڑیوں کے بھاؤ دیا جاتا ہے مگر صنعت کاری کے بعد وہی مال دوبارہ سونے کے بھاؤ خریدنا پڑتا ہے۔

پس ان تمام خامیوں کو دور کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ حکومت صنعت وحرفت اور تجارت وغیرہ کے شعبے میں اصلاح کرے اور اس شعبے کے ذمہ مندرجہ ذیل فرائض عائد کر دے:-

---

[1] اتحاف السادۃ جلد ۵ صفحہ ۴۱۶

(ا) ملک بھر میں بڑے پیمانے پر کارخانے اور انڈسٹریز کھولی جائیں تاکہ ملک کی کچی پیداوار ملک میں استعمال کی جاسکے۔ اور ملک کی صنعت وحرفت اور تجارت میں ترقی ہو۔

(ب) ہر بڑے شہر اور قصبے میں صنعتی درسگاہیں کھولی جائیں تاکہ عوام کا بیشتر حصہ کسب و ہنر کا مالک بن کر اپنی روزی آپ کمانے کے قابل ہو سکے۔

(ج) ہنر آرٹ اور دستکاری کے آلات زیادہ سے زیادہ تعداد میں بنائے جائیں یا درآمد کئے جائیں تاکہ ہر فرد کو یہ فنون سیکھنے میں آسانی ہو۔

(د) کسی صنعتی درسگاہ، ٹیکنیکل سکول، یا دستکاری کے ادارے میں کسی قسم کی فیس یا اُجرت نہ لی جائے تاکہ غریب شخص بھی کسی ہنر آرٹ یا دستکاری کے سیکھنے سے اپنی غربت کے باعث محروم نہ رہ سکے۔

(ہ) صنعت کاروں اور چھوٹے کارخانہ داروں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کے لئے ہر قسم کی آسانیاں مہیا کی جائیں۔

(و) ملک بھر میں دستکاری کو فروغ دیا جائے اور قوم کے ہر فرد کو یہ ہدایت کی جائے کہ حتی الوسع اپنے ملک کی چیزیں استعمال کیا کرے چاہے وہ قیمت میں دوسرے ملک کی اشیاء سے کتنی ہی زیادہ اور بناوٹ میں کتنی ہی ہلکی کیوں نہ ہو۔ بلکہ اس بات کو سیاسی، رسمی اور معاشرتی طور پر رواج دیا جائے کہ ہر فرد اپنے ملک کی بنی ہوئی چیز کو استعمال

کرنے میں فخر محسوس کرے۔ تاکہ ملک کی صنعت ترقی کر سکے۔

(ز) تمام غیر ضروری درآمد کو بند کر کے ملکی صنعت کو فروغ دیا جائے اور ملک کا روپیہ غیر ضروری طور پر کسی حالت میں بھی ملک سے باہر نہ جانے دیا جائے۔

(ح) صنعتوں کو ترقی دینے اور پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے علیحدہ بورڈ مقرر کئے جائیں۔ تاکہ وہ نئے نئے منصوبے بناتے رہیں اور کاریگروں اور کاشتکاروں کو مشورے دیتے رہیں۔

(ط) کاشتکاروں اور کسانوں کو جدید آلاتِ زراعت ارزاں نرخوں پر مہیا کئے جائیں اور انہیں ان کے استعمال کرنے کی تعلیم دی جائے اور آبپاشی کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔ تاکہ خام پیداوار میں اضافہ ہو اور عوام الناس اور کاشتکاروں کی بے چینی دور ہو۔

(ی) ہر بے روزگار فرد کو اس کی لیاقت کے مطابق کام دلایا جائے اور اسے اتنی معقول اجرت دلائی جائے جس پر اس کا اور اس پر انحصار رکھنے والوں کا اچھا گذارہ ہو سکے اور جب تک اسے اپنی لیاقت کے مطابق کام مہیا نہ ہو تب تک اسے عارضی کام دلایا جائے۔ یا بصورتِ دیگر اس کا اور اس پر منحصر افراد کو خرچ و خوراک قرض کے طور پر دیا جائے جو بعد میں بالاقساط اس کی تنخواہ میں سے وضع کیا جائے۔

(ک) ہر ملازم کو کام پر لگا دینے کے بعد بھی اگر پہلے مہینے میں اس کے پاس خرچ و خوراک کی کمی ہو تو اسے اتنی رقم بطور قرض بلا سود دی جائے

جس پر اس کا انحصار رکھنے والوں کا اچھا گذارہ ہو سکے۔

(ل) ملازمین کو وہ تمام مراعات دی جائیں جو ایک آزاد حکمران قوم کے افراد کو دی جاتی ہیں تاکہ وہ صحت مند اور خوشحال رہ کر رشوت خوری بے ایمانی اور چوری کی قسم کی بیماریوں سے بچ سکیں۔

(م) خاندان کے ہر فرد کو اپنی استطاعت کے مطابق کام کرنے کی ہدایت کی جائے۔ اور اس بات کو رواج دیا جائے کہ ہر مرد و زن اپنی اپنی حدود کے اندر کوئی نہ کوئی ایسا روزگار ضرور کرتا رہے جس سے وہ اپنی روزی آپ کما سکے۔ دوسرے کی کمائی پر بیٹھے رہنا معاشرے میں عیب سمجھا جائے۔ خود حکمران، علماء اور تمام بڑے لوگوں پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنی اولاد کو بھی والدین کی کمائی پر بیٹھنے کی عادت نہ سکھائیں۔ بلکہ ہر شخص اپنی اولاد کو یہی تعلیم دے کہ وہ اپنی روزی آپ کمانے کا عادی بنے۔

۴۔ بنیادی ضروریات زندگی:۔ اچھی خوراک، اچھی پوشاک، اچھا مکان، ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان صرف کھانے پینے اور عیش و عشرت کے لئے پیدا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی زندگی کا مقصود خدا شناسی اور خدا رسی ہے۔ لیکن خدا شناسی اور خدا رسی کا راستہ بھی جسم سے ہو کر گذرتا ہے۔ اس لئے جسم کی ضروری پرورش اور فطری نگہداشت ہر انسان کے لئے لازمی ہے۔

تمام دنیا کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ انسانی دل و دماغ کو فطرت کی منشا کے مطابق تندرست و توانا رکھنے کے لئے صرف جسم کی روٹی اور جوانہ کا

دلیہ کافی نہیں ہے اور نہ ہی یہ کافی ہے کہ وہ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں اینٹ کے تکیے پر سر رکھ کر سو جائے بلکہ علم الانسان کے ماہرین کہتے ہیں کہ ہر انسان کیلئے صاف اور کھلی ہوا، صاف پانی، ہوا دار مکان اور ایسی مناسب غذا کی ضرورت ہے جس میں شکریت، دھنیت، وٹامن اور پروٹین وغیرہ موجود ہوں۔ اگر ان میں سے کسی ایک کی بھی کمی ہے تو انسانی صحت منشائے قدرت کے مطابق قائم نہیں رہ سکتی اور جب کسی کی صحت ہی بگڑ جائے تو اس کے دل و دماغ کا نظام بھی ضرور غارت ہوگا۔

داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "انسانی ترقی بیمار رہنے اور خود کو پژمردہ و افسردہ بنا لینے میں نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کی لذتوں سے منشائے فطرت کے مطابق فائدہ اٹھانے میں ہے۔" اسلام دنیا کی پہلی مؤثر آواز ہے جس نے اچھی خوراک، ستھری پوشاک، اور ستھرے مکانات انسانی زندگی کا اعلیٰ معیار قرار دیا ہے، اور صاف صاف الفاظ میں فرما دیا ہے کہ روئے زمین پر جتنی حلال اور طیب چیزیں ہیں، ان سے خوب جی بھر کر فائدہ اٹھاؤ البتہ شیطانی طریقوں سے دوسروں کا حق مارنے کی کوشش نہ کرو۔ ارشاد خداوندی ہے:- یٰایھا الناس کلوا مما فی الارض حلالاً طیباً ولا تتبعوا خطوات الشیطان ط انہ لکم عدو مبین o انما یامرکم بالسوء والفحشاء وان تقولوا علی اللہ ما لا تعلمون o (پ۲ البقرہ ع ۲۱) اے لوگو! (تمام انسانوں سے خطاب ہے) جو چیزیں زمین میں موجود ہیں، ان میں سے حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔ اور شیطان کے راستے

پر مت چلو تحقیق وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ وہ تو تم کو ان ہی باتوں کی تعلیم دیگا جو بُری اور فحش ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ وہ باتیں مت لگاؤ جن کی تمہارے پاس کوئی سند نہیں (یعنی اس روئے زمین پر جو کچھ تمہارا جائز حق ہے "حلال" اس میں سے اچھی چیزیں کھاؤ اور شیطانی طریقوں سے دوسروں کا حق "حرام" مت کھاؤ کیونکہ حرام کھانے سے تم بُری باتوں اور خواہشات نفسانی کے باعث فحش میں مبتلا ہو جاؤ گے اور پھر اللہ تعالیٰ پر ایسی باتیں باندھو گے جنکی تمہارے پاس کوئی سند نہ ہوگی) اکثر لوگ جب رشوت خوری، سود خوری یا دوسری حرامخوری کے باعث برائیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو پھر کہتے ہیں کہ ہماری قسمت میں ہی قدرت نے بُرائی لکھی ہے حالانکہ یہ برائی ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہی ان پر مسلط ہوئی ہوتی ہے۔ مگر وہ لوگ ناسمجھی سے یہ بات اللہ تعالیٰ پر باندھ لیتے ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:- یاایھا الرسل کلوا من الطیبٰت واعملوا صالحا انی بما تعملون علیم ○ (پ ۱۸ المومنون ع ۴) اے پیغمبرو! تم نفیس چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ میں تم سب کے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتا ہوں۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:-

"اے لوگو! اللہ پاک ہے، نہیں قبول کرتا مگر پاک کو اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس چیز کا حکم دیا جس چیز کا اس نے رسولوں کو حکم دیا ہے فرمایا اے رسولو! کھاؤ نفیس چیزیں جو تم کو عطا کیں ہم نے۔ پھر آپ نے بیان فرمایا۔ اس آدمی کا کیا حال ہوگا جو لمبا سفر کرتا ہے، پراگندہ بال،

پاؤں پر خاک پڑی ہے حالانکہ اس کا کھانا اور اس کا پہننا حرام کا ہے حرام کھا کر پلا ہے اور پھر اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتا ہے آسمان کی طرف (اور کہتا ہے) اے میرے رب! اے میرے رب! (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں) اس آدمی کی دعا کیونکر قبول ہو۔ (مسلم) ابن کثیر۔

مطلب یہ ہے کہ زمین کی پیداوار سے لطف اندوز ہونے سے تمہیں کوئی نہیں روکتا بشرطیکہ تم نیکی کی راہ سے نہ ہٹو اور حرام خوری میں نہ پھنس جاؤ۔ اسلام افلاس اور فاقہ کشی کی اجازت نہیں دیتا ایسے لوگ جو اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو کمزور خوراک اور گندی پوشاک میں رکھ کر تقویٰ اور پرہیزگاری کا ڈھونگ رچاتے ہیں، قرآن ان کے اس فعل کو حرام ٹھہرا کر سخت تنبیہ کرتا ہے۔ ارشاد ہے:۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ط اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ وَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْٓ اَنْتُمْ بِہٖ مُؤْمِنُوْنَ o (پ المائدہ)

اے مومنو! اللہ تعالیٰ نے جو لذیذ اور پاک چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں ان کو حرام مت بناؤ۔ اور حد سے آگے مت نکلو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور خدا نے جو چیزیں تمہیں دی ہیں ان میں حلال مرغوب چیزیں کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس پر تمہارا ایمان ہے۔ اور آگے ارشاد ہے۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط قُلْ ھِیَ

لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا خَالِصَۃً یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِکُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (پ ۸ الاعراف ع ۴) ترجمہ:- کہہ دیجئے اے حبیبؐ! کہ کس نے حرام کی ہیں؟ تم پر اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی اچھی پوشاک جس کو اس نے اپنے بندوں ہی کے واسطے بنایا ہے اور اچھی کھانے پینے کی چیزیں؟ آپ فرما دیجئے! کہ یہ اشیاء تو مومنین ہی کے لئے خاص کی گئی ہیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور ہم اس طرح سے سمجھدار لوگوں کے لئے تمام آیات (نشانیاں) کھول کھول کر مفصل بیان فرماتے ہیں اور آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے تو صرف حرام کی ہیں تمام فحش باتیں چاہے وہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ، اور ہر گناہ کی بات کو، اور ناحق کی زیادتی کو (جیسے امیر اپنی دولت کے نشے میں غریب پر کر لیتا ہے) اور اس بات کو حرام ٹھہرایا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرو جس کی اللہ تعالیٰ کے پاس سے کوئی سند نازل نہیں ہوئی، اور تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی باتوں کو لگا دو جس کا تم علم نہیں رکھتے۔"

اسی طرح مجاہدین کو جہاد کرنے کی بشارت میں فرمایا ہے:- وَیُدْخِلْکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۝ (الصّف ۲۸ع ۱۱) "اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کر دے گا

جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور تمہیں عمدہ و پاکیزہ مکانات دے گا جو باغات عدن میں ہوں گے" یعنی اگر تم جہاد کرو گے تو میں تمہیں فاتح اقوام کی طرح ایسے باغات عطا کروں گا جن میں عمدہ اور پاکیزہ بنگلے ہوں گے۔

غرض یہ ہے کہ اچھی خوراک اچھی پوشاک اور اچھے ستھرے مکانات کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مرتبہ آیا ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خدا کے نزدیک یہ چیزیں دنیا و آخرت کی زندگی میں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ لہذا ہر اسلامی مملکت کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کے باشندوں کو اچھی خوراک اچھی پوشاک اور اچھے مکانات ہر ممکن ذرائع سے مہیا کرے۔

۹۔ **ضعیف العمر مرد و زن کے لئے وظائف:** متمدن دنیا میں جب کوئی مرد یا عورت ضعیف العمری کی حالت تک پہنچ جائے اور اس کا کوئی معقول ذریعہ معاش نہ ہو تو وہاں کی حکومت ان کو باقاعدہ طور پر وظیفہ دیتی ہے تاکہ وہ رذالت و محتاجی سے بچا رہے لیکن ہمارے ہاں اس کا کوئی انتظام نہیں۔ جب ہمارے مرد و زن ضعیف العمر ہو جاتے ہیں تو پھر اگر انکا اپنے رشتہ داروں میں کوئی خاطر خواہ انتظام نہ ہو تو وہ بیچارے بھیک منگی پر اتر آتے ہیں۔ بسا اوقات تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی عورت یا مرد کمائی سے رہ جاتا ہے اور اس کے ہاں کچھ چھوٹے بچے بھی ہوتے ہیں تو وہ ان بچوں سے بھیک منگی کا پیشہ شروع کرا دیتے ہیں۔ اور اس طرح وہ بچے نہ صرف تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے بھیک منگے بن کر قوم پر لعنت کا دھبہ بن جاتے ہیں۔ پس ایسی حالت میں حکومت کا یہ فرض ہے کہ

وہ ہر ضعیف العمر مرد و زن کے لئے جو کسی روزگار کے قابل نہ ہو چکے ہوں اور ان کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔ اور ہر بیوہ و لاوارث عورت کے لئے جب تک کہ اس کی روزی کا معاشرہ میں کوئی خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکے معقول وظیفہ مقرر کرے تاکہ وہ خرچ و خوراک کی پریشانیوں سے محفوظ رہ سکے۔

۱۰۔ **اطباء کی تربیت:۔** صحتِ عامہ کو ترقی دینے اور امراض کے سد باب و دفعیہ کے لئے حکومت تمام رائج الوقت طبی سائنسوں (ہومیوپیتھی، طب اسلامی، طب جدید) کو اعلیٰ پیمانے پر لے جانے کی حوصلہ افزائی کی کوشش کرے اور ہر گاؤں میں طبی ڈسپنسریاں قائم کرے اس کے ساتھ ساتھ اطبا کی تربیت کا بندوبست کرے۔ غیر تربیت یافتہ اطبا کو تربیت حاصل کرنے کا پابند کیا جائے۔ ان تمام بازاری طبیبوں، ڈاکٹروں اور کیمسٹوں کو بند کر دیا جائے۔ جو حکومت کے مقرر کردہ ڈاکٹری کورس کے سند یافتہ نہ ہوں، یا ان کے پاس کم از کم ایک سند یافتہ ڈاکٹر موجود نہ ہو جو ادویات کے نسخہ جات بنانے کا ماہر ہو تاکہ غلط طور پر دوا فروشی کا سد باب کیا جا سکے، بازاروں میں مجمع لگانے والے دھوکہ باز طبیبوں کو بند کر دیا جائے اور فضول قسم کی اشتہاری دواؤں اور اشتہار بازی سے سادہ لوح عوام کا روپیہ پیسہ بٹورنے کا کام بند کر دیا جائے۔ تاکہ ایک طرف تو عوام الناس کا روپیہ پیسہ فضول قسم کی ادویات سے مزید خراب ہونے سے بچ سکے۔ اور دوسری طرف انکی صحت غلط قسم کی ادویات سے مزید خراب ہونے سے بچ سکے۔

۱۱۔ **گداگری کا انسداد:۔** ہمارے ہاں گداگری کے انسداد کی کوشش

بسا اوقات بعض انجمنوں اور خود حکومت کی طرف سے کی گئی ہے مگر تجربے نے یہ بتلایا ہے کہ ان کی یہ کوششیں چنداں کارگر ثابت ہوتی نظر نہیں آتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات بھیک منگوں کے لئے محتاج خانے اور خیرات خانے کھلوا دیتے ہیں جن میں محتاجوں اور بھیک منگوں کو زبردستی رکھا جاتا ہے۔ گو ان محتاج خانوں میں بھیک منگوں اور محتاجوں کی تمام ضروریات حتیٰ کہ منتشی اشیاء تک پوری کی جاتی ہیں۔ مگر پھر بھی محتاج اور بھیک منگے ان میں رہنا پسند نہیں کرتے بلکہ ان محتاج خانوں کو وہ ایک قیدخانہ تصور کرتے ہیں جن سے وہ ہر ممکن طریقہ پر جان چھڑانے اور فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل انسان فطری طور پر کسی ایسی پابندی کو قبول کرنا نہیں چاہتا جو اس کی اپنی مرضی اور خواہش کے خلاف ہو۔ اور یہ بھیک منگے تو ہیں ہی مادر پدر آزاد ان کو کہاں محتاج خانوں میں صبر آسکتا ہے۔

میرے نزدیک اس کا علاج یہ ہے کہ ان میں جو لوگ کام کرنے کے قابل ہوں ان کو تو مناسب کام پر لگایا جائے تاکہ وہ آزاد بھی رہیں اور بھیک منگی سے بھی بچے رہیں۔ اور جو لوگ کام کرنے کے قابل نہیں ہیں ان مستحقین کو حکومت باقاعدہ وظائف دیا کرے۔ اس کام کے لئے ہر شہر میں ایک پنچائیت بنائی جائے جو محتاجوں کو کام پر لگانے اور مستحقین کو حکومت سے وظائف دلانے کا کام انجام دیا کرے اور پھر تمام عوام کو ہدایت کی جائے کہ وہ جب کسی شخص کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھ لے تو اسے فوراً اس محلے کی پنچائت کے حوالے کر دے۔ اس طرح امید ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ہماری قوم

سے بھیک منگی کی لعنت دُور ہو جائے گی۔

۱۲۔ غلہ اگاؤ کی مہم :- اس میں شک نہیں کہ کسی ملک کی اقتصادی ترقی کا دارو مدار اس ملک کی معدنی پیداوار یا اس میں زیادہ سے زیادہ کارخانے بنانے اور اس کی صنعت وحرفت کو ترقی دینے میں ہے۔ لیکن جب تک اس ملک کے باشندوں کو غلہ کی فراوانی حاصل نہ ہوگی سکون اور اطمینان قلب کا حاصل ہونا محال ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس ملک میں غلہ کی فراوانی ہوگی وہاں کے باشندے مطمئن اور پُرسکون ہوں گے۔ یا یوں کہیئے کہ جس ملک میں غلہ جس قدر سستا ہوگا وہاں کے باشندے اسی قدر پُرسکون اور خوشحال زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔

لہٰذا حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ملک بھر میں غلہ اگاؤ کی مہم چلا کر زیادہ سے زیادہ غلہ پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے لئے آبپاشی کا خاطر خواہ انتظام کرنا۔ زمینداروں کے لئے ہر قسم کے آلات مہیا کرنا۔ ان کے کام میں ہر قسم کی آسانیاں پیدا کرنا یعنی غلہ اگانے میں زمینداروں کی پوری مدد کرنا۔ ان کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کرنا۔ حکومت کی ذمہ داری میں شامل ہے۔

۱۳۔ جوا بازی کی ممانعت :- اس بات سے کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا کہ جوا بازی ایک فعل بد ہے۔ بلکہ خود جوا کھیلنے والے بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بُرا کر رہے ہیں۔ مگر اس کی برائی کی تحقیق کم لوگوں نے کی ہوگی۔ آؤ ہم اس میں ذرا غور کر لیں کہ آخر اس میں وہ کون سی ایسی برائی ہے جس کو

ہر شخص پر اسمجھتا ہے :۔

اول تو جوا بازی ایک ایسی عادت ہے جو ہر نشے سے زیادہ نشہ رکھتی ہے۔ قرآن نے ہمیں بتلایا ہے کہ "اس میں کم فائدہ اور زیادہ نقصان ہے" مگر اس کا جو کم فائدہ ہے وہ اتنا میٹھا ہے کہ کوئی مٹھاس بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ تھوڑی رقم کے بدلے زیادہ رقم کا آنا ہے۔ یعنی کم منزل زیادہ اجرت۔ یہ مٹھاس اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ آدمی کو پھر پانے کی امید میں زیادہ سے زیادہ نقصان کرتا چلا جاتا ہے مگر پھر بھی امید یہ آس رہتی ہے کہ شائد اسی طرح کا ایک چانس پھر مل جائے اور اس طرح وہ نقصان تو زیادہ کر جاتا ہے مگر نفع کم ہونے کے باوجود اتنا میٹھا ہوتا ہے کہ نقصان کی تمام تلخیوں کو ایک دم بھول جاتا ہے۔

۲۔ دوسرا نقصان جوا بازی، سٹہ، کار نیوال اور ریس وغیرہ میں یہ ہے کہ جب انسان کم رقم پر زیادہ کمانے کی امید باندھ لیتا ہے اور پھر اسی امید میں زیادہ نقصان کر جاتا ہے۔ تو پھر اس نقصان شدہ رقم کو پورا کرنے کے لئے چوری، رشوت، ڈکیتی، دھوکہ دہی، جھوٹ، فریب، حرامخوری کسی چیز سے منہ نہیں موڑتا۔ کیونکہ اپنی عزت کو رکھنے کی خاطر اس نقصان شدہ رقم کا پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔

۳۔ تیسرا نقصان جوا بازی سے یہ ہے کہ جب وہ چوری، رشوت، یا کسی اور طرح سے اس نقصان شدہ رقم کو پورا نہ کر سکے یا جوا بازی کی عادت کو پورا کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی رقم نہ ہو۔ تو وہ اپنی جائداد، باغات

موٹر، گاڑی، حتیٰ کہ گھر کا سامان، بیوی کے کپڑے اور زیورات تک کو فروخت کر جاتا ہے، اور اس طرح سے اس کی زندگی معاشرے کو تباہ کرنے کا موجب بن جاتی ہے۔ لہذا اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر قسم کی جوا بازی سٹہ، کارنیوال اور ریس وغیرہ کو قطعی طور پہ ممنوع قرار دے۔

۱۴۔ **ملک سے باہر دولت جمع کرنے کی ممانعت:۔** ہمارے ملک کے اکثر بڑے بڑے سرمایہ داروں، لیڈروں، سرکاری آفیسروں اور برسر اقتدار طبقہ میں سے بعض حکام بالا نے اپنی دولت باہر کے ملکوں کے بینکوں میں جمع کر رکھی ہے۔ جس سے ایک تو ملک کی کرنسی پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ اور دوسرے یہ رقومات ملک میں استعمال نہ ہونے کے باعث ملک کی اقتصادیات میں نقصان دہ اثرات پیدا کر رہی ہیں۔ لہذا حکومت کو چاہیئے کہ وہ اس تمام دولت کو جو باہر کے بینکوں میں جمع پڑی ہے حکماً واپس اپنے ملک میں منتقل کرا دے یا ان لوگوں کو کسٹم ڈیوٹی میں رعایت دے کر یہ ہدایت کی جائے کہ وہ باہر کے ملکوں سے ایسا مال درآمد کریں جس کی ہمارے ملک کو ضرورت ہو۔ تاکہ حکومت کی کرنسی بھی نقصان سے بچ سکے اور ملک کی صنعت اور تجارت میں بھی ترقی ہو۔ اور اس کی درآمد کے لئے کوئی خاص مدت مقرر کی جائے تاکہ اگر اس مدت کے اندر باہر کے ملکوں میں جمع شدہ سرمایہ اپنے ملک میں منتقل نہ کیا گیا تو حکومت اسے اپنے حق میں ضبط کر لے۔ تاکہ ملک کی دولت ملک پر خرچ ہو اور ناجائز طور پر ملک کا سرمایہ غیر ممالک میں جمع رکھنے کی بیماری ختم ہو جائے۔

۱۵۔ سودی کاروبار کی بندش :۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سودی کاروبار نہ صرف انسانی تمدن و معیشت میں ایک تخریبی طاقت، اور صالح معاشرے کی اخلاقی و مادی زندگی میں بگاڑ پیدا کرنے کا موجب ہے۔ بلکہ غریب اور امیر کے درمیان اخوت و مساوات کو منقطع کرنے کا سبب بھی ہے۔ کیونکہ امیر اور غریب کے درمیان اخوت و مساوات اور محبت کا رابطہ پیدا کرنے کا واحد ذریعہ قرض حسنہ ہے جب غریب اقتصادی بدحالی میں مبتلا ہو جاتا ہے یا اسے کوئی ایسا حادثہ پیش آجاتا ہے، جس کا سدباب روپے پیسے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ یا اس کے ہاں کوئی شادی، بیاہ کے قسم کی کوئی خوشی آجائے یا موت و بیماری جیسی غمی آجائے اور اسے روپے پیسے کی سخت ضرورت پڑے تو وہ امیر کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اب اگر امیر اس موقع پر کچھ رقم بطور قرض حسن اسے دے دے اور اس کی اس تنگی میں مدد کرے تو وہ غریب اس امیر کا اتنا ممنون ہو جاتا کہ اسے اپنی جان سے بھی پیارا سمجھتا ہے۔ اور اگر امیر باوجود قدرت رکھنے کے اس تنگی و پریشانی کے وقت اس کی مدد کرنے سے انکار کر دے تو غریب کے دل میں لامحالہ اس کے خلاف ایک نفرت سی پیدا ہو جاتی ہے اور یہی نفرت بڑھتے بڑھتے غریبوں کو امیروں اور سرمایہ داروں کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کرتی ہے بلکہ یہی نفرت بالآخر کمیونزم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اب جب امیر لوگ اپنی دولت سود پر دینا شروع کر دیتے ہیں تو پھر تو علی الاعلان وہ ایسا موقع ڈھونڈا کرتے چاہتے ہیں کہ غریب کو کوئی حادثہ پیش آئے اس کے ہاں کوئی ماتم یا خوشی ہو

تاکہ وہ مجبور ہو کر ہم سے کچھ رقم سود پر لے لے ۔ اور پھر جب اس کی دولت سودی کاروبار میں لگ جائے تو پھر اسے کیا غرض پڑی ہے کہ کسی کو قرض حسنہ دے کر اپنی دولت کو ظاہری منافع سے روک لے ۔ غرض اس طرح نہ صرف قرض حسنہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا ہے بلکہ امیروں کو غریبوں پر ناروا مظالم ڈھانے کا موقع بھی ہاتھ آ جاتا ہے جس کا نتیجہ امیر اور غریب کے درمیان ابدی دشمنی اور کمیونزم کے پیدا ہونے کے سوا کچھ نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا ہے کہ اگر تم نے سودی کاروبار بند نہ کر دیا تو پھر سن لو کہ خدا اور رسول کا تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے اور دوسری طرف قرض حسنہ کو اتنی فضیلت دی کہ فرمایا ۔ اَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا " اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دو " یعنی قرض حسنہ اللہ تعالیٰ کو اتنا پیارا ہے کہ اگر تم نے کسی غریب کو قرض حسنہ دیا تو گویا تم نے اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دے دیا ۔

لہٰذا ایک اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر سودی کاروبار کو قطعی طور پر بند کر دے ۔ بلکہ قرآن کی آیت کے بموجب سودی کاروبار کو خدا اور رسول کے خلاف جنگ مانتے ہوئے اس کی ہر شکل کے خلاف آہنی طور پر اعلان جہاد کر دے اور ہر ممکن ذرائع سے اسے بند کرنے کی سعی کرے تاکہ امیر اور غریب کے درمیان قرض حسنہ اسلامی طریقہ پر رائج ہو کر ان کے دلوں میں اخوت و محبت کے جذبات بیدار کر کے وحدت اسلامی کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے آ جائے ۔

۱۶ - امدادی سکیمیں : کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں امدادی سکیموں

کے نام پر عوام کو لوٹنے والے بے شمار ادارے بنائے گئے ہیں۔ بعض اداروں کے منتظمین تو عوام سے لاکھوں روپے وصول کرکے غائب بھی ہو چکے ہیں اور اس وقت بہترین کاروں اور کوٹھیوں کے مالک ہیں۔ گذشتہ چند سالوں سے ان اداروں کے منتظمین نے اس فراڈ کے نام پر حکومت کی آنکھوں میں دھول جھونک کر عوام کی جیبوں پر ڈاکہ ڈال کر لاکھوں اور کروڑوں روپے وصول کئے ہیں۔ اگر ان اداروں کا اندر سے بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں بہت سے ایسے ہیں جن کا دارو مدار محض دھوکہ دہی، سود خوری، اور جوئے بازی پر ہے۔ لہذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ان اداروں کی اصلاح کی جائے ان کے غیر شرعی طریقوں کو اسلامی طرز پر قرآن وسنت کے مطابق بنایا جائے تاکہ یہ صحیح معنوں میں اداری کمپنیاں ثابت ہو سکیں اور ملک وقوم کی خدمت کر سکیں۔

۱۶۔ منافقت کا خاتمہ

سولھواں اہم نقاضا ہمارے سامنے منافقت کا خاتمہ ہے۔ چونکہ منافقت کا مادہ نفاق سے لیا گیا ہے۔ لہذا ہر وہ بات یا ہر وہ عمل جو مسلمانوں کی اخوت، یکجہتی، اور اتحاد کو توڑنے کا موجب ہو۔ یا ہر وہ تخریبی کارروائی جو ملک اور قوم کے لئے تباہی لانے والی ہو منافقت تصور کی جائے اور اسے ہر ممکن ذرائع سے ختم کرنے کی کوشش کی جائے اور اس اہم کام کو پورا کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز عمل میں لائی جائیں:

۱۔ نسلی، لسانی، اور صوبائی تعصبات ختم کر دئے جائیں۔

۲۔ مختلف الخیال، مختلف العقائد، فرقے، گروہ اور جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف نفاق پھیلانا یا ایک دوسرے کے خلاف تقریر یا تحریر میں زہر افشانی یا کسی کی دل آزاری کرنا بند کر دیں۔

۳۔ کوئی سیاسی پارٹی کسی دوسری سیاسی پارٹی کے خلاف نفرت انگیزی اور اکھاڑہ بازی نہ کرے۔

۴۔ حکومت کے خلاف نفرت پھیلانا یا تخریبی کارروائیاں کرنا جس میں سول نافرمانی اور بغاوت بھی شامل ہے۔ اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ حکمران طبقہ صریح کفر پہ نہ اُتر آئے۔ لہٰذا اس قسم کی کارروائیوں کو قطعاً بند کر دیا جائے۔

۵۔ فوجوں میں قومی، لسانی اور مذہبی تعصبات کو کسی صورت میں بھی پھیلنے نہ دیا جائے۔ اور ان کے درمیان اخوت و محبت پیدا کرنے کی پوری جدوجہد کی جائے۔

۶۔ ملک بھر میں کسی صورت میں بھی مذہبی یا سیاسی اکھاڑہ بندی کی اجازت نہ دی جائے

۷۔ مزدوروں، محنت کشوں، کی جماعتوں، یونینوں اور انجمنوں میں انتشار پھیلانے کو ہر ممکن ذرائع سے روکا جائے۔ ان کے جائز مطالبات ہر وقت تسلیم کئے جائیں اور انہیں کسی حالت میں ہڑتال کی اجازت نہ دی جائے۔ کیونکہ ہڑتال کی آڑ میں منافقت پھیلانے والے مخبر ملک کے ایجنٹ عوام الناس کو حد سے تجاوز کرنے پر اکساتے

کرتے ہیں

۸۔ غلط افواہیں پھیلانے والوں کو سخت سزا دی جایا کرے اور اخبارات کو بھی تاکید کی جائے کہ وہ غیر مصدقہ خبروں کو چھاپنے سے گریز کریں۔

غرض ہر اس طریقے کو استعمال کیا جائے جس سے منافقت کا خاتمہ کیا جا سکے۔ کیونکہ اس میں قوم کی تباہی ہے۔

۱۷۔ اطاعت امیر

منافقت کا خاتمہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ پوری قوم میں اطاعت امیر کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ کیونکہ بلا چون و چرا اطاعت ہی مسلمانوں کو اپنی حکومت کی وفاداری پر مجبور کر سکتی ہے۔ اور حکومت کی وفاداری ہی در اصل منافقت کو ختم کرنے کا اصل موجب ہے۔ لہٰذا ہمارے سامنے سنارھواں تقاضا بلا چون و چرا اطاعت امیر کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔

۱۸۔ اسلامی جمہوریت کا نفاذ

اس میں شک نہیں کہ جمہوری طرز حکومت انسانی نظام معاشرت کے لئے ایک بہترین قسم کی حکومت ہے۔ اگر اس کو اسلامی شوریٰ کی طرز پر چلایا جائے۔ اس کے نظام حیات کو قرآن و سنت کے مطابق مرتب کر کے مغربی طرز معاشرت اور مغرب کے خود ساختہ طور طریقوں سے آزاد کیا جائے۔ تو پھر ہم اسے صحیح معنوں میں اسلامی جمہوریہ کا نام دے سکیں گے۔ اور چونکہ ہماری حکومت اور ہماری اسمبلی نے ہماری جمہوریہ کا نام ہی اسلامی جمہوریہ منظور کر لیا ہے۔ لہٰذا ہمارے سامنے

اٹھارواں اہم تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی جمہوریہ کو مغربی طرز کی جمہوریت سے ہٹا کر اسلامی طرز کی جمہوریہ بنانے کی سعی کریں۔ اس کے لئے ہمیں مندرجہ ذیل تجاویز پر غور کرنا ہوگا۔

۱۔ قانون :- اسلامی جمہوریہ کا قانون ایک نظام حیات کی صورت میں مرتب کیا جائے جو قرآن و سنت کے عین مطابق ہو۔ اور حکومت کو عدلیہ کے سامنے جوابدہ ہونا چاہیے تاکہ اگر خلیفہ یا صدر جمہوریہ بھی قرآن و سنت کے خلاف کوئی قدم اٹھائے تو عدلیہ اس سے باز پرس کر سکے۔

۲۔ قومیت :- اسلامی جمہوریہ میں نسلی، لسانی اور علاقائی تعصبات کو یک قلم ختم کر دینا چاہیے تاکہ تمام جمہوریہ کے باشندے ایک قوم اور ایک ملت شمار ہوں۔

۳۔ حزب مخالف :- اسلام حزب مخالف یا اپوزیشن پارٹی کی اجازت نہیں دیتا۔ ہاں البتہ مجلس مشاورت میں ہر شخص کو اپنی رائے آزادی سے دینے کی اجازت ہے چاہے وہ کسی بڑے سے بڑے شخص کے خلاف کیوں نہ ہو۔ لیکن رائے کو قبول کرنے یا رد کر دینے کے پورے اختیارات امیر یا صدر کو حاصل ہوتے ہیں تاکہ وہ حق و باطل کی تمیز کر کے حق کو اختیار کر سکے۔ لہٰذا اسلامی جمہوریہ میں حزب مخالف یا اپوزیشن پارٹی نہیں ہونی چاہیے۔ میرے نزدیک اس کا علاج یہ ہے کہ تمام سیاسی پارٹیاں ایک ہی جماعت میں مدغم ہو جائیں۔

۴۔ آزادی رائے :- اسلام عوام الناس کو مادر پدر آزاد رہنے اور جو کچھ جی میں آئے کہہ دینے کی اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ جب کسی کو کوئی بات پوچھنی ہو وہ اس بات کو جاننے والوں سے پوچھ

کہ اپنی تسلی کر لیا کرے۔ اگر اس نے کوئی تنقید بھی کرنی ہو تو پوری تحقیق ومعلومات کے بعد کرے تاکہ نہ تو ناحق کے جھگڑے برپا ہوں اور نہ ہی دوسروں کو ذہنی پریشانیوں میں مبتلا کیا جائے۔

۵۔ صدر کا اختیار:۔ اسلام خلیفہ یا صدر مملکت کو پورے اختیارات دیتا ہے۔ مسلمانوں کا خلیفہ شوریٰ (اسمبلی) کی اکثریت کی رائے کا پابند نہیں ہوتا کیونکہ کسی قومی مسئلہ کے نفع ونقصان کا واحد ذمہ دار شخص خلیفہ (صدر مملکت) ہے۔ ہاں البتہ اسے اسمبلی کو توڑنے کا اختیار نہیں بلکہ اسمبلی دو تہائی کی اکثریت سے صدر کو ہٹا سکتی ہے۔ کیونکہ صدر اسمبلی ہی کا منتخب شدہ ہوتا ہے۔ پس اسلامی جمہوریہ میں صدر مملکت کو پورے اختیارات ملنے چاہئیں تاکہ اسے اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہو اور وہ اپنی ذمہ داری اسمبلی پر نہ ڈال سکے۔

۶۔ وزارت:۔ وزارتوں کا انتخاب شوریٰ خاص سے وجود میں آنا چاہیئے اور شوریٰ خاص ان سرکاری اعلیٰ افسروں پر مشتمل ہونا چاہیئے جو اپنے اپنے شعبوں میں سے ترقی کر کے اعلیٰ عہدوں پہ فائز ہو گئے ہوں۔ تاکہ ایک طرف تو ملک کو اپنے اپنے شعبوں سے اعلیٰ افسروں پر مشتمل قابل ترین وزراء مل سکیں اور دوسری طرف عوام الناس کو ان وزارتوں کے جلد جلد ٹوٹنے اور بننے کی بیماری سے نجات حاصل ہو۔

۷۔ انتخاب:۔ اس میں شک نہیں کہ ہر بالغ کو رائے دینے اور ہر شخص کو اپنا ووٹ آزادانہ طور پر استعمال کرنے کا حق ملنا چاہیئے۔ مگر انتخاب

میں کھڑے ہونے والوں کے لئے علمی، اخلاقی اور سیاسی صلاحیت کا معیار
مقرر کرنا بھی لازمی ہے اور اس کا طریقہ یوں ہو کہ ہر علاقہ میں سنجیدہ اور تعلیم یافتہ
طبقہ کی ایک پنچایت بنائی جائے۔ پھر ان تمام حضرات کو جو انتخاب میں کھڑے
ہو گئے ہوں اس پنچایت کے روبرو پیش کیا جائے۔ اور یہ پنچایت ان سے
پولنگ آفیسر یا کسی مجسٹریٹ کی حضوری میں تحریری و زبانی امتحان لے
اور انہیں باقاعدہ امتحانی پرچوں پر نمبر دیں۔ پس جو شخص بھی اول درجہ پر
کامیاب ہو۔ اس کو انتخاب لڑنے کی اجازت دے۔ پھر وہ شخص عوام
الناس سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے انتخاب لڑے اگر عوام الناس
کی اکثریت کا ووٹ اسے حاصل ہو گیا تو تب اسے عوام کا منتخب شدہ
نمائندہ تسلیم کیا جائے اور اگر اسے عوام الناس کی اکثریت کا ووٹ حاصل
نہ ہو تو پھر اس کے بعد دوسرے نمبر پر کامیاب شدہ ممبر کو اپنی قسمت
آزمائی کا موقع دیا جائے۔

اس طرح نہ تو ایک ممبر کو دوسرے ممبر کے خلاف لڑنے جھگڑنے اور
شر فساد برپا کرنے کا موقع ملے گا اور نہ ہی ناجائز طریقہ پر ووٹ خریدنے
کی نوبت آئے گی۔ بلکہ علمی، اخلاقی اور سیاسی معیار پر پورے اترنے
والے نمائندے قوم اور ملک کو نصیب ہو جائیں گے اور اس طرح
صالح قیادت برسر اقتدار آ جائے گی۔

۱۹۔ حکومت الٰہیہ

حکومت الٰہیہ سے مراد کامل، مکمل، اور اکمل
طور پر خدا کی عبودیت کو اختیار کرنا

ہے یعنی زندگی کے تمام شعبوں میں ظاہری اور باطنی طور پر ہر وقت ہر مقام اور ہر معاملہ میں خدا کی اُلوہیت اور حکومت کو تسلیم کرنا ہے۔ صرف حکومت کے نظام کو اسلامی شریعت کے مطابق چلانے کا نام حکومتِ الٰہیہ نہیں بلکہ وراثت نبوت کو پاکر کامل، مکمل اور اکمل طور پر اپنے اور اپنی قوم کے اندر اتباع رسولؐ اور اسوۂ رسولؐ کا پیدا کرنا حکومتِ الٰہیہ ہے۔ اور چونکہ نبوت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے۔ ظاہر سے مراد نبوت حکومت ہے۔ یعنی قرآنی احکام کے مطابق حکومت کا چلانا۔ اور باطن سے مراد نبوت عبدیت ہے اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے چونکہ نبوت حکومت کو رد کرکے نبوتِ عبدیت کو قبول کر لیا تھا۔ لہٰذا آپ کی ظاہری وراثت ہر اس شخص کو ملتی ہے جو قرآن و سنت کے مطابق اسلامی حکومت قائم کرے۔ جیسے خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اور اصل وراثت یعنی نبوتِ عبدیت کی وراثت صرف حضرت علی علیہ السلام کو ملی تھی جو اجماع سے ثابت ہے۔ لہٰذا تیسواں اہم تقاضا جو ہمارے سامنے ہے وہ حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے۔ اس کے لئے ہمیں ایک طرف تو خلفائے ثلاثہ کی حقانیت کو تسلیم کرنا ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے قرآن و سنت کے مطابق یعنی منہاج النبوۃ کے عین مطابق خلافت قائم کی تھی اور ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ یہ جو کچھ ہوا خدا کی مرضی کے مطابق ہوا ہے اور خدا کی رضا میں ہماری رضا ہے۔ خداوند تعالیٰ کی حکمت اسی میں تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بہتان و افتراء سے پاک رکھا جائے جو بعد میں آنے والے غیر اسلامی

تاریخ نویس لگاتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مقصد صرف یہ تھا کہ عرب کی حکومت ان کے خاندان میں منتقل ہو جائے یعنی ان کے بعد حضرت علی علیہ السلام حکمران ہوں اور حضرت علی علیہ السلام کے بعد اولادِ علیؑ حتیٰ کہ یہ حکومت پشت در پشت بنو فاطمی میں چلتی رہے۔ اور دوسرے یہ کہ حکومت کو وراثت میں لے جانے والی رسم ختم ہو کر جمہور کے حوالے ہو تاکہ قیصریت و کسرایت کا خاتمہ ہو اور اس طرح خلافت انتہی اخلاقی علمی اور سیاسی لحاظ سے قابل ترین لوگوں کو خود جمہور کے ہاتھ سے سونپی جایا کرے یا اس وقت کے تقاضا کے مطابق وہی شخص حکمران ہو جس پر امت کا اجماع ہو سکے اور جس کے حکمران بننے سے شر و فساد کے برپا ہونے اور اتحادِ اسلامی کے پارہ پارہ ہو جانے کا خدشہ نہ ہو۔

اور دوسری طرف مودت اہلِ بیتؑ اور حضرت علی علیہ السلام کی روحانی قیادت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا۔ کیونکہ جس طرح ظاہری خلافت کو اللہ تعالیٰ نے جمہور پر چھوڑ دیا ہے۔ اور انہیں اختیار دے دیا ہے کہ تم میں سے جس کسی کو تم مناسب سمجھو اس کو اپنا امیر منتخب کر لو۔ اسی طرح باطنی خلافت جو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی وراثت ہے۔ یا جس کو قرآن نے امامت کے نام سے بھی موسوم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے قبضہ میں رکھا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق تزکیہ نفس اور تقویٰ سے ہے یہ ہر دو چیزیں چونکہ باطن سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے ظاہر کو دیکھنے والے اس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے کہ آیا فلاں شخص جو بظاہر بڑا متقی اور پرہیز گار ہے باطن

ہیں خدا سے کتنا قریب رہتا ہے۔ یا ان ہر دو متقیوں میں سے کون خدا کے زیادہ قریب ہے۔ بلکہ اس وراثت کو سونپنے کا تعلق اس شخص سے بھی ہے جو وراثت چھوڑ رہا ہو۔ اگر ایک پیر، ولی، یا نبی کے بہت سے بیٹے ہوں اور تمام کے تمام متقی و پرہیزگار ہوں تو لازمی نہیں کہ وہ اپنا وصی سب کو مقرر کرے بلکہ اُس کو جو سب سے زیادہ عزیز ہوگا یا اُس کو ان سب میں سے جس کسی سے بھی زیادہ محبت ہوگی اُسی کو اپنی وراثت کا وصی ٹھہرائے گا۔

بعینہٖ یہی بات حضرت علی علیہ السلام اور دوسرے اصحابِ کبار کی ہے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو محبت تو سب سے تھی مگر حضرت علیہ السلام سے ان کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی اسی لئے اُن کو نبوت کی وراثت سونپ کر وصی مقرر فرمایا۔ سو اب اگر ہم نبوت کے روحانی فیض کو حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں تو ہمیں آپ کو ثر کے سرچشمۂ فیض باب علم نبوت، قطب الاقطاب عندہٗ علم الکتاب، امام المہدیین الذی مصباح الہدایۃ، وصی المصطفیٰ وامام الاوصیا ابوالائمۃ ووارث الانبیاء، ترجمان وحی اللہ و نور اللہ الذی لا یُطفیٰ، امام الاولیا الذی باب اللہ منہ یوتیٰ و مشکوٰۃ فیہا نور المصطفیٰ زوج بتول، حیدر کرار غیر فرار اسد اللہ الغالب علی ابن ابیطالب کرم اللہ وجہہٗ کو اپنا روحانی قائد تسلیم کر لیں۔

اس طرح سے ایک طرف تو شیعہ اور سنی کا وہ جھگڑا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

ختم ہو جائے گا۔ جس میں وہ ایک پارٹی کو جائز حقدار اور دوسری پارٹی کو غاصب تصور کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف حضرت علی علیہ السلام کی روحانی قیادت کو تسلیم کرنے کے باعث ہم ظاہری اور باطنی ہر دو لحاظ سے خلافتِ ارضی اور حکومتِ الٰہیہ کے صحیح وارث اور جائز حقدار بن جاویں گے۔

۲۰۔ شیطنت کا خاتمہ

بیسواں اور آخری تقاضا ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہم شیطان کے خلاف علمِ جہاد بلند کر دیں اور ان تمام شیطانی طاقتوں کو ختم کرنے کے درپے ہو جائیں جو عالمِ انسانیت کو کسی طرح سے بھی مضر یا راہ ہدایت سے ہٹانے کا موجب ہو یا جو انسانی معاشرے کو اخلاقی طور پر گرانے کا سبب ہو۔

وما توفیقی الا باللہ

باعمل صالح جماعت کی ضرورت

لیکن اس وقت جبکہ چاروں طرف ظلمتوں کے بادل چھائے ہوئے ہیں ہر طرف گھپ اندھیرا ہے۔ شیطنت کا دیو انسانیت کے کندھوں پر منڈلا رہا ہے۔ شیطان اپنی مکارانہ چالوں سے ساحرانہ انداز میں شہوت زدہ اور نفس پرست انسانوں کو اپنی انگلیوں پر نچا رہا ہے۔ کلبوں، ناچ گھروں، ہوٹلوں، سینماؤں، چوراہوں، گلی کوچوں اور گھر گھر کی چار دیواریوں میں شیطان نہایت ہی سُریلی آواز میں اپنی

ڈگڈگی بجا رہا ہے، اور انسانوں کو اپنے سحر میں مبتلا کر کے خدا کی نافرمانی بلکہ پر اسرار طور پر خدا اور رسول سے بغاوت پر آمادہ کر رہا ہے۔ ان تقاضوں کا پورا کرنا کوئی آسان بات نہیں۔

ہاں البتہ اگر خدائے رحمان و رحیم کی طرف سے کسی ایسی شخصیت کا ظہور عمل میں آجائے جس کی لاٹھی عصائے موسیٰ کی طرح اژدہا بن کر شیطان کی تمام ساحری کو نگل جائے اور حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت کر دے یا مسیحا بن کر مردہ دلوں کے اندر زندگی کی روح پھونک دے۔ اور مومنین الصالحین کی ایک ایسی باعمل جماعت پیدا کر دے جو اپنے کردار کے دامن میں کئی بے پناہ سیلابوں، طوفانوں اور طغیانیوں کو چھپا کر اور خدائے قاہر و مقتدر کا آہنی ہاتھ بن کر قیصر و کسریٰ کے ایوانوں کو ایک دفعہ پھر خاک میں ملا دینے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا کا سر انقلاب و تغیر ہمیشہ صدائے عمل کے سامنے جھکا ہے نہ کہ صدائے قول کے آگے۔ جب تک مصلح اپنے اندر اصلاح کا نمونہ نہیں رکھیگا، اس کی تعلیم دلوں کی قبولیت اور روحوں کی اطاعت سے محروم رہے گی۔

تاریخ اصلاح عالم سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اقوام عالم کی ہر دعوت و انقلاب اصلاح نے سب سے پہلے ایک ایسی جماعت ہی پیدا کی ہے جس نے اپنے اعمال و کردار کو ہی نمونہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ جب

کبھی کوئی اصلاحی تغیر ہوا ہے محض تعلیمات سے نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس جماعت کے اعمال سے ہوا ہے جو ان تعلیمات کی حامل و محافظ تھی۔ وہ صدائیں جو محض زبانوں سے اٹھتی ہیں، ہوا کی منجمد سطح میں تموج تو پیدا کر سکتی ہیں۔ مگر دلوں کے سمندر میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا طوفاں برپا نہیں کر سکتیں۔ کان اُن کو سنتے ہیں۔ مگر دل ان کے آگے مسخر نہیں ہوتے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جب کبھی بھی مصلحین کا ظہور ہوا ہے خواہ وہ ظہور انبیاء کرام کا تھا۔ یا ان کے متبعین، مجددین، اور نائبین کا۔ مگر ہمیشہ ان کا پہلا کام یہی رہا ہے۔ کہ انہوں نے اپنی تعلیم و دعوت کا نمونہ ایک جماعت کی صورت میں پیش کیا ہے اور پھر یہ بنیاد جتنی محکم و استوار بن سکی، اتنا ہی استحکام بعد کی تعلیمات کو بھی حاصل ہوا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے "قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ" بیشک تمہارے واسطے اتباع اور پیروی کے لئے ایک بہترین نمونہ اور نصب العین حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی زندگی ہے۔

ذرا غور کیجئے! فرمایا "وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ" اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھی ہیں۔ دراصل یہی وہ معیت تھی۔ جو اعمالِ صالح کی حامل و محافظ ہوتی ہے۔ اور اس امانتِ اصلاح و دعوت کو دنیا میں پھیلانے کے لئے سنبھال لیتی ہے جو انبیائے کرام لے کر دنیا میں آتے ہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ان کی جماعت کے اوصاف قرآن میں یوں بیان

ہوئے ہیں: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط ذٰلِکَ مَثَلُھُمْ فِی التَّوْرٰۃِ ج وَمَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ج کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَہٗ فَاٰزَرَہٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِھِمُ الْکُفَّارَ ٥ الخ (پ س ع)

ترجمہ: محمدؐ اللہ کے رسول، اور جو لوگ ان کے ساتھی ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں بڑے سخت ہیں اور آپس میں بڑے مشفق مہربان و رحمدل (اے مخاطب) اگر تو ان کو دیکھے، تو کبھی رکوع کر رہے ہوں گے۔ کبھی سجدہ میں پڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل اور رضامندی کی جستجو کرتے ہوں گے ان کے چہروں پر تاثیر سجدہ کے آثار نمایاں ہوں گے ان کے یہ اوصاف، توریت میں بھی بیان ہو چکے اور انجیل میں بھی ان کی مثال ایسی بیان ہوئی ہے کہ جیسے کھیتی (درخت) کہ اس نے اپنی سوئی نکالی پھر اس نے اس کو قوی کیا پھر وہ درخت موٹا ہوا اور اپنے تنہ پر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ کہ باغبانوں کو بھی بھلا معلوم ہونے لگا۔ تاکہ ان سے (اس جماعت کے) منکرین کو جلا دے۔"

اس کی تمثیل متی انجیل میں حضرت مسیح ابن مریم علیہا السلام نے یوں فرمائی ہے "آسمان کی بادشاہت رائی کے دانے کی مانند ہے جسے ایک شخص نے لیکر اپنے کھیت میں بو دیا وہ سب بیجوں سے

چھوٹا ہے پر جب اگتا ہے تب سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے اور ایسا درخت ہوتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس پر بسیرا لیتے ہیں" متی ۱۳ : ۳۲

دراصل یہی وہ کلمہ طیبہ کا بیج تھا۔ ایمانی نور کی وہ جھلک تھی جو بظاہر رائی کے دانے کے برابر تھا۔ لیکن بارآور ہونے کے بعد ایک تنا ور درخت بننے والا تھا۔ وَكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝ اور کلمہ طیبہ کی مثال اس اچھے درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین کے اندر مضبوط اور ٹہنیاں آسمان تک پہنچی ہوئی ہوں توۃ الہیہ کی نشو و نمائی سے وہ ہر وقت کامیابی کا پھل لاتا رہتا ہے اور یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تاکہ لوگ سوچیں اور غور کریں۔

پس یہی وہ ایک چھوٹی سی جماعت تھی جس کو قرآن مجید نے کزرع اخرج شطأہ کے نام سے تمثیلاً بیان فرمایا ہے جو نہ صرف تعلیم بلکہ ایک عملی نمونہ لے کر دنیا میں بڑھی اور آسمان کی بادشاہت (حکومت الہیہ) کا وہ مقدس تخم جس کی منادی شام کے مرغزاروں میں ہوئی تھی۔ حجاز کے ریگستانوں میں نشو و نما پانے لگا۔ تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا۔ کہ ایک سرسبز و تنا ور درخت نے اپنی ڈالیوں سے کرۂ ارض کو چھپا لیا۔ اور

---

[1] یہ اقتباس مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک مضمون سے لیا گیا ہے جو غالباً کسی رسالے میں چھپا تھا (قائم افغانی)

" فَآزَرَہٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ "
پھر اس نے اسے قوی کیا اور ایک تناور درخت بنایا پھر ہوا کے پرندوں نے اس کی شاخوں میں نشیمن بنائے اور زمین کی مخلوقات نے اس کے سایہ میں پناہ لی۔

اور اسی چھوٹی سی جماعت کے اعمالِ حسنہ کے ذریعہ دنیا میں حکومت الٰہیہ کا قیام وجود میں آیا۔ تب قرآن مجید نے فرمایا " وکذالک جعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شھدآء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا ؕ " ترجمہ:- اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک اعتدال پر چلنے والی جماعت بنایا۔ تاکہ تمہاری زندگیاں جہاں والوں کے لئے تمثیل بن کر رہیں اور رسولؐ کی زندگی تمہارے لئے حجت، نمونہ، اور مثال ہو۔

پس مدت کے غور و خوض کے بعد میں اس نتیجہ پہ پہنچا کہ ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مومنین الصالحین کی ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو دعوت و تبلیغ اسلام اور اصلاح عالم کا کام خود نمونہ بن کر اپنے اعمالِ حسنہ اور بلند کردار سے انجام دے سکے۔ اور وہ اس قدر صالح ترین افراد پر مشتمل ہو کہ اتحاد و ترقیٔ عالم اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے میدان میں اقوام عالم کی امامت و قیادت کی باگ ڈور بھی اپنے ہاتھوں میں لے سکے۔

کیا اس وقت منہاج النبوت کے مطابق کلی ہمہ گیر انقلاب برپا کرنے والی کوئی جماعت موجود ہے؟

مگر ایسی بین الاقوامی تحریک برپا کرنے کے لئے میرے سامنے چند مشکلات تھیں :- اول یہ کہ اس تحریک کو چلانے کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو علامۂ وقت ہو۔ تاکہ تجدید اسلام کرتے وقت دین کے اندر سے افراط و تفریط کو مٹانے میں وہ عالم دین، مُلا صاحب یا مولوی صاحب جو محض کورانہ تقلید کا قائل ہو اس کے سامنے زبان نہ کھول سکے۔

دوم یہ کہ وہ بہت بڑی دولت رکھنے کے ساتھ ساتھ موجودہ سیاست میں بھی ایک اہم حیثیت کا مالک ہو۔ تاکہ دنیا کے سیاست دان اس کے سامنے چون و چرا نہ کر سکیں اور

تیسرے یہ کہ وہ اتنی بڑی قومیت کا مالک ہو کہ اگر اسے اپنے اصولوں کی خاطر کوئی قربانی دینی پڑے تو اس کی ساری قوم اس کی پشت پر ہو۔ لیکن افسوس! کہ میرے پاس ان تینوں باتوں میں کوئی بھی نہیں۔ نہ میں علامہ ہوں نہ میرے پاس دولت ہے اور نہ ہی میں قومیت کے لحاظ سے کوئی نواب، سردار ہوں جس کا مجھے فخر حاصل ہو۔ اور میں یہ خیال کروں کہ میری علمیت میری دولت میری سیاست دانی اور میری قومیت اس قدر ہے کہ جس کے بل بوتے پر میں ایک ایسی جماعت بنا سکتا ہوں جو مجھے کسی منزل تک پہنچائے بلکہ میں خداوند تعالیٰ کا صرف ایک عاجز ترین بندہ ہوں۔ میرے پاس تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں دین اسلام کو تمام دنیا کے ادیان پر غالب کرنے کا جذبہ رکھتا ہوں تاکہ تمام

انسان ایک ہی راہ پر آکر امن و سلامتی کی زندگی بسر کر سکیں اور یہ جذبہ میرے دل میں بچپن سے موجزن ہے ۔ اور دوسرے یہ کہ میں ستم رسیدہ انسانیت کو ابلیس علیہ اللعنت و جنود ہ کی ساحری اور شیطنت سے نجات دلانا چاہتا ہوں ۔ یہی وہ مطالبات میں نے شروع سے اپنے معبود حقیقی کے سامنے رکھے ہیں ۔ اور اب بھی یہی وہ مطالبات میرے مد نظر ہیں ۔ لیکن چونکہ یہ مطالبات ان بیس تقاضوں کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے اور یہ بیس تقاضے جماعتی طاقت کے بغیر پورے ہونے مشکل ہیں ۔

لہذا مجھے خیال آیا کہ اس بارے میں کسی ایسی جماعت کے ساتھ اشتراک کیا جائے جو ان تقاضوں کو پورا کرنے کا پروگرام رکھتی ہو یا جس نے ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کوئی عملی اقدام کیا ہو پس میں نے بعض ایسی جماعتوں کو اپنے ہاں پایا جو اسلام کو صحیح معنوں میں غالب کرنے کا دعویٰ رکھتی ہیں :-

لہذا میں نے یہ بہتر جانا کہ ان موجودہ جماعتوں میں شامل ہونے سے پہلے پہلے ان کو منہاج النبوۃ کی کسوٹی پر پرکھ لوں کہ کیا ان میں کوئی ایسی جماعت ہے جو قرآن وسنت کے تقاضوں کے مطابق ایک عالمگیر اسلامی انقلاب برپا کرنے اور ان بیس تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو تا کہ کسی جماعت میں شامل ہوتے یا اپنی علیحدہ جماعت بنانے میں صحیح فیصلہ کر سکوں ۔

۱۔ مسلم لیگ :- ان میں سے پہلی جماعت مسلم لیگ ہے ۔ ہم مسلم لیگ کو پہلا درجہ اس لئے دیتے ہیں کہ یہی وہ تحریک ہے جس کی کمائی پر آج ہم صحیح اسلام کو قائم کرنے کی بنیاد رکھتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر قائداعظم علیہ

الرحمتہ (محمد علی جناح صاحب) محمد علی جوہرؒ اور شوکت علیؒ کے نقش قدم پر نہ چلتے یا انہیں مسلمانوں سے کمال محبت اور ہمدردی نہ ہوتی، تو وہ کانگریس والوں سے مل کر مشترکہ حکومت یا متحدہ قومیت پر راضی ہو جاتے اور اگر ایسا ہو جاتا تو آج ہم حکومت الٰہیہ کا قیام اور اسلامی شریعت کے نفاذ کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا ہوگا کہ قائداعظمؒ اور اس کی جماعت مسلم لیگ نے نہ صرف پاکستان بلکہ دنیائے جہان کے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا اور آئندہ بھی پاکستان جس قدر ترقی کرے گا اور مسلمانانِ عالم کو جتنے فائدے پہنچائے گا۔ ان تمام کے ثواب میں قائداعظم اور ان کے مخلص رفقاء برابر کے شریک ہوں گے۔

لیکن افسوس ہے کہ اب مسلم لیگ میں وہ طاقت اور صلاحیت باقی نہیں رہی کہ ہم اس سے ان بیس اہم تقاضوں کو پورا کرنے کی توقع رکھ سکیں۔ گو ابتداء میں مسلم لیگ نے اتحادِ اسلامی کے لئے بڑا ٹھوس کام کیا۔ لیکن بعد میں چونکہ نفس پرست جاہ طلب اور ذاتی اغراض و مقاصد رکھنے والے لوگ مسلم لیگ میں زیادہ گھس آئے اور مسلم لیگ کی زمامِ کار مخلص اصحاب کے ہاتھوں سے نکل کر ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی۔ لہٰذا جوں جوں مسلم لیگ بے عمل ہوتی گئی توں توں عوام الناس کی نظروں سے گرتی گئی اور رفتہ رفتہ اس سطح پر پہنچ گئی ہے کہ اب اس سے یہ توقع رکھنا کہ یہ ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کچھ کر سکے گی۔ محض اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا ہے۔

۲۔ **اسلام لیگ**:۔ دوسری جماعت میرے سامنے اسلام لیگ

(یا علامہ مشرقی کی مسلم لیگ) ہے۔ یہ تحریک پاکستان بننے سے قبل خاکسار تحریک
کے نام سے کام کرتی رہی ہے۔ جہاں تک خاکسار تحریک کا تعلق ہے وہ ایک عسکری
تحریک تھی جس کا نصب العین روئے زمین کی بادشاہت اور خلق خدا کی خدمت
یا غلبہ اسلام تھا۔ میں خود اس تحریک سے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک وابستہ
رہا لیکن ۱۹۳۹ء میں جب بعض علماء نے کہا کہ اس تحریک کے خلاف اقدامات
کئے اور اسے کفر کے فتوؤں سے نوازا تو میں بھی مجبور ہو کر بظاہر علیحدہ ہو گیا تھا۔
لیکن ۱۹۴۴ء میں پھر دوبارہ اس تحریک کا ایک سرگرم رکن بن گیا۔ غرض یہ ہے کہ خاکسار
تحریک سے مجھے انس و محبت اور دلی عقیدت اس لئے ہے کہ یہ وہ تحریک ہے جس نے سب سے
پہلے میرے دینی جذبات کو ۱۹۳۷ء میں ابھارا اور مجھے دین کی خاطر میدان عمل میں کودنے
کا موقعہ مہیا کیا۔ اور خاکسار تحریک ہی کی بدولت قدرت نے مجھے سیاسی میدان
میں بڑا اشتعال پیش آئے لیکن اور ان کا مقابلہ کرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ سب
سے پہلے تو مجھے اپنے شہر لیشین میں علماء کے کفر کے فتوؤں اور خویش و اقارب کی دشمنی
اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی بار متزلزل ہو ہو کر مجھے پھر میدان میں ڈٹ کر
آنا پڑا جس نے میرے ایمان کو بہت مضبوط بنایا اور مجھے نڈر کر دیا۔ اور دین کی
خاطر بڑی سے بڑی طاقت سے مقابلہ کرنے کی استطاعت مجھ میں پیدا ہو گئی۔ بعد ازاں
۱۹۴۵ء میں مجھے سندھ کے انتخابات میں خاکسار امیدواروں کے لئے مسلم لیگ کے خلاف کام
کرنا پڑا۔ جب ہم سب اکھاڑے تھے ہمارے طرف مسلم لیگ زوروں پر تھی۔ گو ہمیں شکست پر
شکست ہی کھانی پڑی لیکن ... میں مضبوط ہوتا گیا۔ پھر مجھے بنگال جانا پڑا وہاں تقریروں
کا موقعہ بھی ملا۔ گو یہاں بھی اکثر محاذوں پر شکست ہی کھانی پڑی لیکن مسلم لیگ کے خلاف علی الاعلان تقریریں

کرکرنے میں اتنا دلیر ہو گیا کہ عین محمد علی پارک (کلکتہ) میں مسلم لیگ کے جلسہ میں جاکر
کسی بلوچ پٹھانی کے نام سے اجازت لیتا اور پھر ان کی سٹیج پر ان کے خلاف تقریر
کرتا۔ اس کے بعد مجھے فضل الحق کی سیٹ پر بھیجا گیا وہاں بھی شاندار کامیابی بھی
نصیب ہوئی اور ہم نے شہید حسین سہروردی سابق وزیر اعظم بنگال کے ہوتے
ہوئے جن کی اس وقت بنگال میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے ساتھی کو فضل الحق
صاحب کے مقابلے میں شکست فاش دی۔ ۱۹۴۷ء کے اوائل میں مجھے خاکسار وفد میں
انٹیرم گورنمنٹ (عبوری حکومت) کے وزیر اعظم مسٹر نہرو اور ان کے دوسرے
ساتھیوں پٹیل، راجندر پرشاد، اور ابوالکلام آزاد وغیرہ سے بہار کے تباہ
گھروں کو دوبارہ آباد کرنے کے سلسلے میں کئی بار ملنا پڑا۔ اور اس طرح مجھے
بڑے وزیروں سے گفتگو کرنے کا سلیقہ آ گیا۔ اور میرے اندر سے احساس کمتری مٹ
گیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ آف بہار سے پورے ساڑھے چار ماہ مذاکرات
کرنے کے لئے مجھے پٹنہ بھیجا گیا۔ پھر مجھے اسی وفد کے ہمراہ نواکھلی میں مہاتما گاندھی
سے ملنے بھی جانا پڑا اور پھر ان کو بہار لا کر ان سے بھی متواتر کئی دفعہ ملنے سے میں بہت
ہی سیاسی چالوں سے واقف ہو گیا۔ غرض ان چار پانچ سالوں میں میں نے تمام
ہندوستان کا ایک ایک علاقہ دیکھا اور ہر جگہ مختلف الخیال اور مختلف الزبان
لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا اور بالآخر قدرت نے مجھے اس سٹیج پر پہنچایا کہ جب
علامہ مشرقی اعلیٰ حضرت نے دہلی میں ۳۰ جون ۱۹۴۷ء کو تین لاکھ خاکساروں کا اجتماع
بلایا تو مجھے اس اجتماع کا سالار اول مقرر کیا۔ اور بعد ازاں دہلی کے انقلاب کا پروگرام
بھی میرے سپرد کیا گیا گو وہ انقلاب ناکام ہوا۔ اور اس کے ناکام ہو جانے

کی چند خاص وجوہات تھیں جنکا اظہار میں مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ آج جبکہ قدرت نے مجھے اس قابل بنا دیا ہے کہ میں دنیا کے سامنے ایک عظیم الشان انقلابی تحریک کا پروگرام رکھ رہا ہوں۔ اس کا پہلا محرک خاکسار تحریک ہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خاکسار تحریک نے جو عسکری تنظیم اور جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ مسلمان قوم میں پیدا کیا۔ آج تک ہندوستان میں کسی تحریک نے پیدا نہیں کیا ہے۔ لیکن افسوس! کہ وہ تحریک ۳۰ جون ۱۹۴۷ء کو ختم کر دی گئی۔ اور یہ اقدام منہاج النبوۃ کے قطعاً خلاف تھا۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جب بھی خدا اور اسلام کے نام سے لوگوں کو پکارا ہے یا انہوں نے جب بھی کوئی تحریک پیش کی ہے پھر اس پر آخر دم تک ڈٹے رہے ہیں اسی تحریک کے باعث قتل کئے گئے ہیں، سولی چڑھائے گئے ہیں، آگ میں ڈالے گئے ہیں۔ پتھروں سے کوٹے گئے ہیں طرح طرح کی اذیتوں اور مصیبتوں میں مبتلا کئے گئے ہیں۔ اور یہاں تک ان کو اور ان کے ساتھیوں کو تکلیفیں دی گئی ہیں کہ خود قرآن ان کی گواہی دیتا ہے۔ ارشاد ہے:۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ط مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ط اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ o (۲/۱۰ البقرہ ع ۲۶) ترجمہ:۔ "کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں جا داخل ہو گے حالانکہ تم کو ہنوز ان لوگوں کا سا کوئی عجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم

سے پہلے گذرے ہیں ان پر ایسی ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی اور ان کو یہاں تک جنبش ہوئی کہ پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ تھے بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد کب ہوگی یاد رکھو بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد نزدیک ہے "

حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس اپنی قوم کو حق کی دعوت دی مگر ان کی قوم نے ان کی ایک بات بھی نہ مانی سوائے چند افراد کے خود حضرت نوح علیہ السلام کی زبانی قرآن مجید فرماتا ہے " قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ۝ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ۝ وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝

(۲۹/۹ نوح ع ۱) نوح علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کو رات کو بھی اور دن کو بھی بلایا۔ سو میرے بلانے پر وہ اور زیادہ بھاگتے رہے اور میں نے جب بھی ان کو بلایا تاکہ آپ تعالیٰ ان کو بخش دیں۔ تو ان لوگوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیں، اور اپنے کپڑے لپیٹ لیے اور اصرار کیا اور غایت درجہ کا تکبر کیا "

اور اسی طرح سے قوم " عاد " کے پاس ہود علیہ السلام، قوم " ثمود " کے پاس صالح علیہ السلام اور " مدین " والوں کے پاس شعیب علیہ السلام بھیجے گئے۔ الغرض ہر قوم کے پاس اسی قوم میں سے نبیین بھیجے گئے۔ مگر اُن کی قوم نے ان کی کوئی بات نہ مانی بلکہ الٹا اُن کو اذیتیں اور تکلیفیں پہنچاتے رہے۔ غرض تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تاریخ ان حکایتوں سے بھرپور ہے کہ وہ قوم کو حق

کی دعوت دیتے رہے اور قوم نے ان کو دکھوں اور دردوں میں مبتلا کیا لیکن انہوں نے اُف تک نہ کی۔ اور جو حق کی بات انہوں نے قوم کے سامنے پیش کی تھی اس پر آخر دم تک ڈٹے رہے۔ اور یہ بھی ہوا کہ باوجود اتنی تکلیفوں اور مصیبتوں کے بعض انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ایک بھی حق کا ساتھی نہ مل سکا اور بعض ایسے بھی نبی ہو گزرے ہیں جن کو صرف ایک رفیق نصیب ہو سکا ہے۔ رسول علیہ الصلوٰۃ و السلام فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ایسے بھی نبی آئیں گے جو تن تنہا ہوں گے اور بعض ایسے بھی آئیں گے جن کے ہمراہ صرف ایک امتی ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ علامہ مشرقی صاحب کو ہزاروں ایسے جاں نثاران اسلام نصیب ہوئے تھے جو ان کے ایک اشارے پر جان مال بیوی بچوں تک کو خدا کے نام پر قربان کرنے کو تیار تھے۔ مگر علامہ صاحب نے پھر بھی ان کی قدر نہ کی۔ اور محض اس لئے تحریک کو ختم کرنے پر آمادہ ہوئے کہ ان کی تعداد تین لاکھ کیوں نہیں۔ کیا خدا، رسول، قرآن یا انبیاء کرام کی کسی تاریخ یا کسی دور کا علامہ صاحب کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ کب اور کس وقت خدا نے تین لاکھ کی شرط رکھی تھی جس کے اتباع میں علامہ صاحب نے ان مخلص جانبازوں کے سامنے یہ شرط پیش کی؟ اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ تحریک خدائی تحریک تھی اور اسلام کو غالب کرنے کے لئے بنائی گئی تھی تو کیا علامہ صاحب کو اسے توڑ دینے کا اختیار تھا؟ جماعت کی مثال ایک مسجد کی ہے کہ جس کو کوئی بھی شخص بنا سکتا ہے۔ مگر بنا چکنے کے بعد وہ خدا کی ملکیت ہو جاتی ہے اس شخص کو پھر اسلام یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس مسجد کو توڑ پھوڑ کر ختم کر دے۔ بعینہ یہی مثال ایک اسلامی جماعت کی ہے کہ اسے بنانے کو تو

ہر شخص بنا سکتا ہے لیکن اسے توڑنے کا اختیار پھر اُسے نہیں۔ اور اگر وہ اسے توڑتا ہے تو وہ اس کی تحریک ہوگی خدا کی تحریک نہیں۔

پس جو شخص اپنی مرضی کے مطابق جب چاہے تحریک کو ختم کر دیتا ہے اور مسلم نوجوانوں کی امنگوں اور کئی سالوں کی محنتوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ جب چاہتا ہے وہ تحریک کا نام بدل کر کچھ کا کچھ رکھ دیتا ہے۔ تو ایسے شخص پر کیا اعتبار کیا جا سکتا ہے کہ کب وہ بنے بنائے کھیل کو لات مار کر مسلمانوں کی کئی سالوں کی محنت پر پانی پھیر دے یا اپنی ڈکٹیٹرانہ انداز میں اس کی ایک پالیسی کو بدل کر کوئی اور پالیسی اختیار کر لے۔ لہٰذا ایسے لیڈر یا اس کی تحریک سے یہ توقع رکھنا کہ وہ واقعی منہاج النبوۃ کے مطابق ایک عالمگیر اسلامی انقلاب برپا کر سکے گا۔ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا ہے۔

۳۔ تبلیغی جماعت :۔ اور تیسری جماعت میرے سامنے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ (نظام الدین دہلی) کی تبلیغی جماعت ہے۔ یہ تزکیۂ نفس اور اخلاقی اصلاح کے لئے نہایت بہتر جماعت ثابت ہوئی ہے میں نے خود اس جماعت میں کچھ مدت تک کام کیا ہے۔ اس جماعت میں رہ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ قدرت نے اس جماعت کی برکت سے میرے ذہن کے دروازے ایک ایک کر کے کھولے ہیں۔ میں نے اس میں نہ صرف تزکیہ نفس اور اصلاح خلق کے صحیح طریقے سیکھے ہیں۔ بلکہ یہ سبق بھی حاصل کر چکا ہوں کہ دعوت وتبلیغ اسلام اور جہاد فی سبیل اللہ میں مومنین الصالحین کی جماعت کو کیا کچھ کرنا چاہیے۔ گو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کوئی عملی پروگرام اس جماعت میں نہیں ہے۔

لیکن اس جماعت کے اکابرین کا خیال ہے کہ جب ایک محلے سے ایک شخص ایک چلہ (چالیس دن) یا تین چلے (چار ماہ) یا سات چلے (نو مہینے دس دن) کے لئے اپنے گھر بار، دنیوی کاروبار اور اس دنیوی ماحول سے نکل کر دین کی طرف ہجرت کرے اور اپنے علاقے سے کہیں دور تبلیغی جماعتوں کے ساتھ ذکر و فکر، شب بیداری اور دعوت و تبلیغ کے کاموں میں مصروف رہے گا۔ تو اس کی ذاتی اصلاح ہو جائے گی کہ پھر وہ نہ صرف اپنے گھر کے ماحول کو درست کرنے کے لئے کافی ہو گا۔ بلکہ وہ اپنے محلے کی اصلاح کرنے کی صلاحیت بھی پا جائیگا۔

گو یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ یا مبالغہ نہیں ہے۔ لیکن یہ اتنا سخت اور کٹھن کام ہے کہ ہزاروں میں سے کوئی ایک خدا کا بندہ ہی ایسا نکلے گا جو اس طرح سے دنیوی کاروبار اور تمام دنیاداری، ملازمت، بیوی بچے اور ملک وطن کو چھوڑ کر اپنے آپ کو اس کام کے لئے فارغ کرے۔ اس طرح کے کام تو اکثر دو ہی صورتوں میں آسانی سے ہو سکتے ہیں اول یہ کہ حکومت کی طرف سے جہاد فی سبیل اللہ کا اعلان ہو۔ میدان جنگ سامنے ہو اور مجاہدین کو جذبہ جہاد کے تحت بھرتی کیا جائے اور پھر محاذ کی طرف روانگی اس طرح ہو کہ تبلیغی جماعتوں کی طرح گاؤں گاؤں، قریہ بہ قریہ جنگ کے نقارے بجاتے ہوئے جنگی ترانے گاتے ہوئے جایا جائے۔ اور ہر گاؤں میں فضا نعرۂ تکبیر سے گونجتی رہے تب جا کر مسلم نوجوان جوق در جوق اس میں حصہ لیں گے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ تبلیغی جماعتوں کے لئے باقاعدہ تربیت گاہیں کھولی جائیں۔ اور پھر ان میں سے تربیت یافتہ لوگوں کی جماعتیں دعوت و تبلیغ کے لئے

بھیجی جائیں. تاکہ وہ ایک نصب العین کے تحت اپنی منزل مقصود تک پہنچنے میں کوشاں رہیں (لیکن تبلیغی جماعت میں اس کے لئے کوئی انتظام نہیں. نہ ان کے ہاں کوئی تربیت گاہ ہے اور نہ ہی اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ تربیت یافتہ لوگوں کو اس اہم کام پر لگانا چاہیئے۔ بلکہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ غیر تربیت یافتہ لوگوں کی ایک بھیڑ جمع کی جاتی ہے اور پھر ان ہی میں سے کسی ایک کو امیر منتخب کر لیتے ہیں۔ اور جب کسی مسجد میں پہنچتے ہیں تو سب سے پہلے خصوصی گشت کرتے ہیں جس میں بڑے بڑے لوگوں سے ملنے کا پروگرام بنایا جاتا ہے عصر کی نماز کے بعد عمومی گشت کو نکلتے ہیں۔ اس میں عموماً لوگوں کو کلمہ پڑھوانے کا پروگرام ہوتا ہے گھر گھر پہنچتے ہیں، اور ہر فرد یا راہ چلتے صاحب کو پکڑتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ دیکھیں صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم آپس میں مل جایا کرو تو اپنا ایمان تازہ کر لیا کرو اور اس طرح کچھ اور بھی کلمے کی تعریف کر کے پھر کہہ دیتے ہیں کہ اچھا جی اب پہلے میں کلمہ پڑھتا ہوں پھر آپ بھی کلمہ شریف پڑھ کر اپنا ایمان تازہ کر لیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس میں امیر صاحب کبھی کسی شخص کو بات کرنے کے لئے مقرر فرماتا ہے اور کبھی کسی صاحب کو اور باقی لوگوں کو یہ حکم ہوتا ہے کہ تم اذکار کرتے رہو۔ یہ اتنا مشکل کام ہے کہ اس کے لئے بات کرنے والا بھی نہایت تربیت یافتہ۔ بارعب، سنجیدہ اور باسلیقہ شخص ہونا چاہیئے۔ مگر ان کے ہاں اس بات کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ امیر صاحب اپنی مرضی کے مطابق کبھی کسی کو بات کرنے کا حکم دیتا ہے کبھی کسی کو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر لوگ آگے سے ڈٹ جاتے ہیں اور

پوچھنے پر برہم ہو جاتے ہیں کہ تم کون ہو مجھ سے کلمہ پڑھوانے والے؟ کیا تم مجھے مسلمان نہیں سمجھتے؟ یا میرے کلمے میں تمہیں شک ہے؟ اور بعض لوگ ان کی طرزِ گفتگو سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح پھر جب مسجد واپس آ جاتے ہیں تو مغرب کی نماز کے دوران کی تقریر کا پروگرام ہوتا ہے۔ مگر اس میں بھی امیر جماعت کی مرضی جس کسی کو چاہیں وہ تقریر کے لئے کھڑا کر دیتے ہیں ان میں اکثر ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو تبلیغی جماعت کے اغراض و مقاصد تک سے بے خبر ہوتے ہیں اور اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے عمر بھر کبھی تقریر نہیں کی ہوتی ہے۔ اب کیا ایسے لوگ کس طرح سے لوگوں کو متاثر کر سکتے ہیں۔ اور پھر تقریر کے بعد مذاکرہ ہوتا ہے جس میں یہ لوگ خواہ مخواہ ان لوگوں کو باہر نکلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس وقت نہیں ہوتا لیکن شرم کے مارے اقرار کر لیتے ہیں جو بعد میں ان پر بوجھ ہو جاتا ہے۔

ابھی پچھلے دنوں کوہاٹ سے ایک جماعت پشاور تک پیدل جانے کو تیار ہوئی۔ میں نے بھی چار مہینے کے لئے اپنا نام پیش کر دیا چنانچہ مجھے اس جماعت کا امیر مقرر کیا گیا۔ اس راستے میں پشاور تک اکثر لوگوں نے مجھ سے یہی سوالات کئے کہ یہ تبلیغی جماعت والے لوگوں کو راستے میں پکڑ کر زبردستی کلمہ کیوں پڑھواتے ہیں۔ یہ لوگ مذاکرات میں لوگوں سے چمٹ چمٹ کر انہیں خواہ مخواہ نکلنے پر کیوں مجبور کرتے ہیں؟ ان میں اکثر غیر تربیت یافتہ اور ان پڑھ لوگوں سے کیوں تقاریر کرائی جاتی ہیں؟ یا پھر ان کے تعلیم یافتہ لوگ بات بات پر اتنی لمبی چوڑی تقریریں کیوں کرتے ہیں؟ کیا ان میں کوئی رکنیت ہے؟ کہ کسی کو یہ احساس رہے کہ واقعی میں تو اس جماعت کا ممبر یا رکن

ہوں ؟ وغیرہ وغیرہ سب ایسے سوالات تھے کہ گو وقتی طور پر تو میں ان حضرات کی تسلی کے خاطر ان کو گول مول جواب دیدیتا تھا۔ مگر درحقیقت مجھے بھی اس بات کا احساس ہوتا گیا کہ واقعی تبلیغی جماعت میں یہ کمزوریاں اور خامیاں تو موجود ہیں کہ وہ غیر تربیت یافتہ لوگوں کو گشت کے لئے ساتھ لے جاتے ہیں اور پھر جس کسی کو امیر کی مرضی ہو بات کرنے کا حکم دے دیتا ہے چنانچہ ان میں اکثر ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو بات کرنے کا سلیقہ نہیں جانتے اور وہ اکثر غلط طریقہ پر لوگوں سے کلمہ پڑھنے کو کہہ دیتے ہیں جس سے وہ برہم ہو جاتے ہیں اور پھر یہ بھی درست ہے کہ تقریر کرنے میں بھی اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا ہے کہ فلاں شخص تقریر کرنا جانتا بھی ہے یا نہیں اور فلاں شخص اگر عالم ہے اور اپنی علمیت دکھانے کی خاطر لمبی چوڑی تقریر کر رہا ہے تو اسے اس بات سے روک لینا چاہیئے تاکہ لوگوں پر اس کی تقریر بوجھ نہ ہو اور پھر مذاکرات میں میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جب مقرر اپنی تقریر ختم کر لیتا ہے تو پھر مذاکرات میں ہر شخص اپنے اپنے دائرے میں پھر ایک نئی تقریر شروع کر دیتا ہے اور اسطرح ان لوگوں کو اتنا پریشان کیا جاتا ہے کہ وہ بیچارے اپنے آپ کو قید میں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر جب ان سے چمٹ چمٹ کر انہیں خواہ مخواہ نکلنے پر مجبور کرتے ہیں تو وہ اتنے تنگ ہو جاتے ہیں کہ پھر ان اجتماعات میں شامل ہونے سے ہی ڈرتے ہیں کہ مبادا پھر یہ لوگ نکلنے کو مجبور نہ کریں۔

۳۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تبلیغی جماعت میں کوئی محلہ وار نظام نہیں اور نہ ہی ان میں کوئی رکنیت یا ممبر شپ ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص بھی اپنے آپ کو جماعت کا ممبر یا ذمہ دار رکن نہیں سمجھتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ تبلیغی جماعت میں ایک وقت تو سینکڑوں اور ہزاروں لوگ

جمع ہو جاتے ہیں مگر دوسرے وقت ان میں چار پانچ افراد بھی جمع نہیں ہو سکتے اور بالآخر یہ دے کہ وہی چند مخصوص لوگ رہ جاتے ہیں۔ جن پر جماعت کا...... ظاہراً دارومدار ہوتا ہے یا جو جماعت کے اصل چلانے والے ہوتے ہیں۔

اور چونکہ یہ جماعت سیاست سے قطعی طور پر کنارہ کش رہتی ہے۔ اگر کسی صاحب نے غلطی سے اپنی تقریر میں کوئی سیاسی بات کہہ دی تو ان لوگوں پر قیامت آجاتی ہے اور سب کے سب استغفار کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کشمیر کے متعلق بھی کسی مقرر نے کچھ کہہ دیا تو یہ لوگ اسے منع کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس جماعت کا مرکز بھارت میں ہے اور بھارت میں ان کی جماعت کام کرتی ہے اگر یہ سیاسیات میں حصہ لیں گے تو پھر ان کو بھارت میں ٹھہرنا یا بھارت میں کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔

لہٰذا ان سے یہ توقع رکھنا کہ یہ جماعت ان ملی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے یا ان کے لئے کام کر سکے گی۔ اپنے آپ کو دھوکہ میں رکھنا ہے۔

۴۔ جماعت اسلامی :- اور چوتھی جماعت میرے سامنے ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی "جماعت اسلامی" ہے۔ اس وقت پاکستان میں حکومت الٰہیہ کو قائم کرنے سے متعلق جماعت اسلامی ہی سب سے بڑی، فعال اور منظم جماعت تصور کی جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی نے چند سالوں سے عظیم الشان اسلامی خدمات انجام دی ہیں۔ اس نے مسلمان قوم کے سامنے ایک وسیع پیمانے پر

نہایت ہی سادہ انداز میں ایسا اعلیٰ لٹریچر پیش کر دیا ہے جس کے باعث ہماری قوم کا تعلیمیافتہ طبقہ "جو ذہنی طور پر دہریت کا بُری طرح سے شکار ہو چلا تھا" اس سے ہٹ کر اسلام کی طرف راغب ہو گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جماعت اسلامی نے اپنے اس بے بہا لٹریچر کے ذریعے نہ صرف آنے والے عالمگیر اسلامی انقلاب کے لئے ذہنی طور پر زمین ہموار کر دی ہے بلکہ اپنی تحریک کے عملی جدوجہد کے ذریعے مملکت پاکستان کی عمارت (جو "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کے نام پر کھڑی کی گئی تھی) کو بھی "دہریت" اور "ڈکٹیٹرشپ" کے طوفانوں سے بچایا ہے۔

لیکن ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس تحریک میں چند ایک ایسی خامیاں بھی موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تحریک ایک عظیم الشان، مذہبی، روحانی، معاشی اور سیاسی انقلاب برپا کرنے اور کامل، مکمل، بلکہ اکمل طور پر تجدید و احیاء اسلام کے لئے کافی نہیں۔ مثلاً

۱۔ وحدت اسلامی: اکمل تجدید و احیاء اسلام کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ دنیائے عالم کے مسلمانوں کے سامنے قرآن و سنت اور تاریخی شواہد کی روشنی میں ایک ایسا ٹھوس لائحہ عمل رکھ دیا جائے جس پر تمام سیاسی و غیر سیاسی جماعتوں، مختلف العقائد فرقوں اور گروہوں کو جمع کیا جا سکے تاکہ تمام علیحدہ علیحدہ طور طریقوں پر گامزن اور علیحدہ علیحدہ نام اختیار کئے ہوئے اسلامی فرقے ایک ہی صراط المستقیم پر آ کر ایک عظیم الشان اسلامی بلاک بنا سکیں۔ لیکن جماعت اسلامی نے تاحال دنیائے اسلام کے مسلمانوں کو مذہبی،

روحانی اور سیاسی طور پر ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور وحدت اسلامی کو
پیدا کرنے کے لئے کوئی ٹھوس لائحہ عمل پیش نہیں کیا ہے۔ اور نہ ہی اس کے کوئی
عملی قدم اٹھایا ہے۔ البتہ گذشتہ دنوں اسلامی دستور کے معاملے میں پاکستان
کی تمام مذہبی اور اسلامی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں جماعت
اسلامی کی خدمات قابل داد ہیں۔ لیکن یہ جو کچھ ہوا ہنگامی طور پر ہوا۔ جو محض
دستور کو قرآن و سنت کے مطابق بنانے کے متعلق تھا۔ عقائد کی بناء پر تمام
فرقوں اور گروہوں کے اختلافات آج تک برقرار ہیں۔ چنانچہ آج بھی جبکہ
حکومت پاکستان قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی قانون کی تشکیل میں مصروف
ہے۔ بعض لوگ فقہی مسائل کی جزوی اور فروعی اختلافات کی بناء پر اپنے
لئے علیحدہ حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اخبار انجام کراچی میں سید اسرار حسین
ایڈووکیٹ سیکرٹری ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ صوبہ کراچی و سندھ
"پاکستان کے دستور کے متعلق شیعہ علماء کا متفقہ فیصلہ" کے عنوان سے
اطلاع دیتے ہیں کہ شیعہ علماء نے ایک اجتماع میں پاکستان کے دستور اسلامی
کے متعلق یہ متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ شیعان پاکستان کو ایسا کوئی دستور قابل
قبول نہ ہوگا جس میں مندرجہ ذیل تحفظات منصوص درج نہ ہوں:۔

(الف) قرآن و سنت کی وہ تعبیر جو کسی ایک فرقہ اسلامی کے نزدیک مسلمہ
ہو کسی دوسرے فرقے پر پابند نہ ہوگی

(ب) تمام مسلم فرقوں کو اپنے عقائد کی تبلیغ و اشاعت اور رسوم مذہبی
کی ادائیگی کی مکمل آزادی حاصل ہوگی

(ج) ہر مسلمہ فرقہ اسلامی کے لوگوں کے شرعی نزاعات اور معاملات مثلاً نکاح طلاق۔ میراث وغیرہ کا فیصلہ اسی فرقہ کے فقہ کے مطابق ہوگا۔

(د) ہر مسلمہ فرقہ اسلامی کے طلبا و طالبات کے لئے دینیات کی تعلیم کا انتظام اسی فرقہ کے عقائد کے مطابق کیا جائے گا۔ اور اسی فرقہ کے منتظمین تعلیم دیں گے

(ہ) اگر حکومت کی طرف سے تبلیغ مذہب، اوقاف یا دیگر فرائض مذہبی کے لئے کوئی ادارہ قائم کیا جائے گا۔ تو شیعوں کے لئے جداگانہ ادارہ کا قیام ضروری ہوگا۔ جس کی نگرانی شیعہ ارکان سے متعلق ہوگی۔"

بعینہٖ اسی طرح تمام اسلامی جماعتوں، فرقوں اور گروہوں میں سیاسی مذہبی اور روحانی طور پر جزوی اور فروعی اختلافات بدستور ہیں۔ جس سے یہ ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی اب تک صرف پاکستان کے مسلمانوں میں بھی مکمل اور اکمل طور پر اتفاق و اتحاد پیدا نہ کر سکی ہے۔ لہٰذا اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کامل، مکمل اور اکمل طور پر تجدید الاسلام کرے گی۔ اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک ہی صراط المستقیم پر جمع کر کے عظیم الشان اسلامی بلاک بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ خیال خام ہے۔

۲۔ دعوت و تبلیغ اسلام

جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت سے اتارا تو فرمایا: قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝
(پ البقرہ ع ۴)

ترجمہ: "ہم نے حکم فرمایا نیچے اتر جاؤ اس بہشت سے سب کے سب پھر اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت، سو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا اس پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے اور جو لوگ کفر کریں گے اور تکذیب کریں گے ہمارے احکام کی یہ لوگ ہوں گے دوزخ والے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

یہاں جو غور طلب بات ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کے ساتھ یہ وعدہ فرمایا ہے کہ میری طرف سے تمہارے پاس ہدایات آویں گی "فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى" سو جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آوے تو جو شخص میری ہدایات کی پیروی کرے گا اس کے لئے کوئی خوف و خطرہ نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کے مطابق رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قبل ہر قوم اور ہر قبیلے کے لئے ہادی بھیجا اور اس طرح قریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار کم و بیش پیغمبر آئے اور دنیا کے کونے کونے تک اللہ تعالیٰ کے ہدایات و احکامات پہنچاتے رہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَانَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِیْۤ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا الخ (۲۰/۹ القصص ع۶)

"اور آپ کا رب بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتا جب تک کہ ان کے صدر مقام میں کسی احکام پہنچانے والے (پیغمبر) کو نہ بھیج دے کہ وہ ان کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنا دے) اور اسی لئے ارشاد ہے کہ "فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۸/۶ الاعراف ع۱)

"پھر ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے اور ہم پیغمبروں سے بھی ضرور پوچھیں گے۔"

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل تو اللہ تعالیٰ نے ہر قوم ہر ملک، ہر شہر اور ہر بستی میں اپنے احکامات پہنچانے کے لئے پیغمبروں کا سلسلہ جاری رکھا تھا لیکن جب رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:- قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ۝ اے وہ لوگو! جو اپنے آپ کو انسان کے نام سے موسوم کرتے ہو۔ تحقیق میں تم سب کے لئے اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں یعنی جو کام پہلے تمام پیغمبروں کے ذمے تھا اب سارے کا سارا رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کندھوں پر ڈالا گیا چنانچہ اب اللہ تعالیٰ نے اپنا وہ "فاما یاتینکم منی ھدی" کا وعدہ[1] پھر یاد دلاتے ہوئے فرمایا:- هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝ وہ (اللہ) تو وہی ہے کہ اس نے اپنا رسول ساتھ ہدایت کے (بالھدیٰ) اور دین حق کے محض اس لئے بھیجا ہے کہ وہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے چاہے مشرک لوگ اس بات کو کتنا ہی برا کیوں نہ مانیں۔" اور پھر رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ارشاد ہے: يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ الخ (پ المائدہ ۹)

[1] جس نے وعدہ فرمایا تھا کہ میں اپنی ہدایات تمہارے پاس بھیجوں گا۔

"اے رسول جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ سب پہنچا دیجئے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا ایک پیغام بھی نہیں پہنچایا۔"

اسی لئے تو رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا: "وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ" "اور میرے پاس اس قرآن کی وحی آئی ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ تم کو ہوشیار کر دوں اور جن کو پہنچے (وہ دوسروں کو ہوشیار کر دے) چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کا خطبہ فرما رہے تھے۔ تو اس وقت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تمام صحابہؓ کو مخاطب کر کے تین دفعہ فرمایا۔ ھل بلغت، ھل بلغت، ھل بلغت کیا میں نے خداوند تعالیٰ کے احکام تم تک پہنچا دیئے؟ کیا میں نے خداوندی احکام تم تک پہنچا دیئے؟ کیا میں نے خداوندی احکامات تم تک پہنچا دیئے؟ اور جب تمام صحابہؓ نے اس بات کا اقرار کیا کہ ہاں آپ نے تمام احکام پورے پورے پہنچا دیئے تب آپ نے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور خدا کو گواہ ٹھہرایا بعد ازاں فرمایا "فَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ" "پس تم میں کا ہر حاضر ان احکامات کو غائب تک (یعنی غیر حاضر لوگوں تک) پہنچا دے۔

چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے اس اہم فریضہ کو ادا کرنے میں جان و مال کی بازی لگا دی تھی۔ آج اگر ہم کو ہندوستان، پاکستان، ترکی، ایران، افغانستان، سپین، کاشغر اور دور دور کے علاقوں تک صحابہؓ کی زیارتیں نظر آتی ہیں تو اس کی اصل وجہ

یہی ہے کہ یہ حضرات دعوت و تبلیغ اسلام کی خاطر اپنے گھر بار کو چھوڑ کر دور دور
تک اسلامی دعوت کو پہنچانے گئے تھے۔ بلکہ آج اگر ہم کو ان علاقوں میں اولیاء اللہ
کی زیارتیں نظر آ رہی ہیں تو ان کی بھی وجہ یہی ہے کہ یہ حضرات دعوت و تبلیغ اسلام
کے لئے اپنے وطن کو ترک کر کے ان مختلف ممالک میں پھیل گئے تھے۔ حضرت داتا
گنج بخش ہجویری رحمۃ اللہ علیہ غزنی کے ایک گاؤں ہجویر کے رہنے والے ہیں
مگر آج ان کی زیارت لاہور میں ہے اسی طرح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ
علیہ نظام الدین اولیاء، بختیار کاکی، حضرت باقی باللہ، اور پاک پتن
شریف، سہروردی شریف، گولڑہ شریف اور ملتان کی زیارتیں جن سے آج تک
فیض پھیل رہا ہے۔ اگر ان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ وہی حضرات
ہیں جو دعوت و تبلیغ اسلام کی غرض سے اپنے گھر بار کو چھوڑ کر یہاں آئے تھے
مگر افسوس ہے کہ آج امریکہ، انگلستان اور روس والے ہمارے پاس اپنے مشن
کی تبلیغ کے لئے آتے ہیں اور ہم اپنے اس فریضے سے محروم ہیں۔
سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کے روز اگر یہ امریکہ، انگلستان، جاپان
اور روس والے اللہ تعالیٰ سے استدعا کریں کہ اے اللہ تعالیٰ آپ نے تو کلام
فرمایا تھا کہ میری طرف سے تمہارے پاس ہدایات آئیں گی۔ آپ نے یہ تو کہا
تھا کہ عرب جا کر ہدایت حاصل کرنا۔ لیکن یہ تیرے مسلمان بندے تو ہمارے
پاس اسلام کی دعوت لے کر نہیں آئے ہیں۔ آخر ہم کن لوگوں سے ہدایت حاصل
کرتے؟ اور پھر اللہ تعالیٰ ہمارے موجودہ مسلمانوں کی طرف متوجہ ہو جائے۔
خصوصاً جماعت اسلامی کی طرف جو کہ وہ پھر اسلام کا مدعی ہے کہ بتلاؤ تم نے اس

قرآن کو ان تک پہنچا دیا تھا ؟ تو ہم کیا جواب دیں گے ؟ اور کلی و ہمہ گیر اسلام برپا کرنے کا دعویٰ رکھنے والی جماعتیں کیا جواب دیں گی ؟

پس جو تحریک تجدید و احیاء اسلام کا بیڑا اپنے کندھوں پر اٹھالے یا وہ مکمل اسلام کو برپا کرنے کی مدعی ہو تو اس پہ لازم ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں اس فریضہ کو پورا کرلے۔ لیکن جماعت اسلامی نے اس اہم فریضہ کو ادا کرنے کے لئے تا حال کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ جماعت اسلامی نے کچھ لٹریچر مختلف زبانوں میں ترجمہ کرکے بعض ممالک میں بھیج دیا ہوگا۔ وہ بھی دعوت و تبلیغ اسلام سے متعلق نہیں بلکہ جماعت اسلامی کا وہ لٹریچر جس کو اس نے پاکستان کے لئے شائع کیا تھا۔ جس کا زیادہ تر تعلق پاکستان کے داخلی مسائل سے ہوگا نہ کہ بین الاقوامی مسائل سے۔

لیکن سوال تو یہ ہے کہ کیا جماعت اسلامی نے دعوت و تبلیغ اسلام کے لئے کوئی ایسی تربیت گاہ کھول رکھی ہے جہاں "دعاۃ" (واعظین و مبلغین) تیار کئے جاتے ہوں اور پھر انہیں غیر اسلامی ممالک مثلاً امریکہ، روس، چین، جاپان اور دیگر غیر اسلامی ممالک میں وفود کی صورت میں بھیجے جاتے ہوں جو وہاں جا کر ان کی زبان میں انہیں دین اسلام کی دعوت دیں۔ کیا جماعت اسلامی نے کبھی کوشش کی ہے کہ بعض ایسے لوگوں کو تیار کیا جائے جو دعوت و تبلیغ اسلام کی خاطر ہمیشہ کے لئے کسی غیر اسلامی ملک کی طرف ہجرت کر جائیں اور پھر وہاں سکونت اختیار کرکے ان کو اسلام کی عملی زندگی سے روشناس کرائیں ؟ اور اگر وہ اس اٹھارہ سال کی مدت تک اس قابل نہیں ہو سکی کہ وہ

دعوت و تبلیغ اسلام کے لئے کوئی عملی قدم اٹھاتی یا اس کے لئے کم از کم ایک تربیت گاہ ہی کھول لیتی۔ تو میرے خیال میں اس کا کلی و ہمہ گیر اسلام کو برپا کرنے کا دعویٰ بھی بے سود ہے۔

۱۷۔ جہاد فی سبیل اللہ: جو تحریک مکمل تجدید و احیائے اسلام کا بیڑا اپنے کندھوں پر اٹھا لے اس کے لئے یہ امر بھی لازم ہے کہ وہ قرآن کے ہر حکم کی اسی طرح تعمیل کرے جس طرح رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام تعمیل فرماتے تھے یا کم از کم قرآن کے ہر اس امر کو پورا کرنے کی سعی کرے جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا مومنین کو حکم دیا گیا ہو۔ مثلاً قرآن میں رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ارشاد ہے:۔

"یا ایھا النبی حرض المومنین علی القتال" (۵/۱۰ الانفال) اے نبیؐ مومنین کو قتال (جنگ) کے لئے تیار کیجئے۔

پس ہر وہ تحریک جو منہاج نبوت پر برپا کی جائے یا وہ مکمل تجدید اسلام کا دعویٰ کرتی ہو اس بات کی مکلف ہے کہ وہ اتباع رسولؐ میں اس آیت کی تعمیل کرے۔ اور اپنی جماعت میں عسکری نظام پیدا کرکے مومنین کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار کرتی رہے۔ ورنہ وہ قرآن کے اس حکم کے بموجب کہ "ولو ارادوا الخروج لاعدوا لہ عدۃ" (اگر یہ لوگ نکلنے کا ارادہ رکھتے (یعنی جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ رکھتے) تو (کم از کم) اس کے لئے کچھ تیاری تو کرتے منہاج نبوت سے گر جائے گی۔ کیونکہ منہاج النبوۃ پر تو ہم صرف اسی تحریک کو سمجھ سکتے ہیں جس میں قرون اولی کے مسلمانوں کے تمام اعمال موجود ہوں یا وہ کم از کم ان کے نقش قدم پر چلنے کی سعی تو کر رہے ہوں مگر جماعت اسلامی

یہاں نہ عسکری نظام موجود ہے اور نہ کبھی اس نے اس کے لئے کوئی عملی جدوجہد کی ہے۔

۴۔ رابطۂ عوام:- جو تحریک منہاج النبوۃ پر چلائی جائے اس کے لئے بنیادی اور سب سے اہم کام رابطۂ عوام کا پیدا کرنا ہے۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی تحریک کی ابتداء سب سے پہلے عوام سے کی، اور ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ایک ایک فرد کو جمع کر کے فرمایا "یا ایہا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا" اے لوگو! لا الٰہ الا اللہ پڑھو فلاح پاؤ گے۔

عہد نبوت کی ۲۳ سالہ زندگی میں پورے تیرہ سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عوام الناس کی اصلاح اور انہیں عملی نمونہ پیش کرنے میں صرف کئے اور نبوت کے پورے بیس سال یعنی ہجرت کے ۶ھ میں آپ نے سب سے پہلا پیغام حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے ہاتھ شاہ حبش (نجاشی) کے نام بھیجا حالانکہ مسلمان مہاجرین حبشہ یعنی بعثت نبوت کے پانچ سال بعد سے حبشہ میں آباد تھے اور نجاشی (شاہ حبش) نے مسلمانوں پر بڑے بڑے احسانات کئے تھے جس کا اعتراف حضرت عمرو نے نجاشی کے سامنے اپنے خطاب میں بھی کیا ہے وہ فرماتے ہیں۔ "بادشاہ! ہمارے ذمہ حق کی تبلیغ ہے اور آپ کے ذمہ حق کی سماعت۔ کوئی شبہ نہیں کہ گذشتہ دنوں سے ہم پر آپ کی شفقت و محبت کا یہ حال ہے کہ گویا آپ ..... اور ہم ایک ہی ہیں۔ اور ہم کو بھی آپ پر اس قدر اعتبار ہے کہ ہم آپ کو کسی طرح اپنی جماعت سے علیحدہ نہیں سمجھتے

ہم نے جس بھلائی کی امید آپ سے کی کامیاب ہوئے اور جس خطرہ کا بھی اندیشہ کیا ہمیشہ اس سے بے خوف و مامون رہے .... بادشاہ! اگر آپ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نہ کیا تو اس نبی امیؐ کا انکار آپ کے لئے اسی طرح باعث وبال ثابت ہوگا جس طرح یہود کے حق میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار ثابت ہوا۔ میری طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بعض دیگر اشخاص مختلف بادشاہوں کے نام دعوتِ اسلام کے لئے قاصد بن کر گئے ہیں۔ مگر نیرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو امید آپ کی ذات سے وابستہ ہے۔ دوسروں سے ایسی امید نہیں ہے۔ اور جس بات کا ان سے اندیشہ ہے۔ آپ سے اس کے بارہ میں پورا اطمینان ہے کہ آپ اپنے اور اپنے خدا کے درمیان گذشتہ طاعات اور آئندہ کے اجر و ثواب کا خیال رکھیں گے"۔ اور اسی طرح آپؐ نے ۷ھ مطابق ۶۲۹ء میں ہرقل قیصر روم اور ضغاطر حاکم رومیہ کے نام حضرت دحیہ کلبیؓ کے ہاتھ دعوتِ اسلام کے لئے نامہ مبارک دے کر بھیجا (مکاتیب سید المرسلین از محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی)

یعنی پورے بیس سال تک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ساری توجہ عوام ہی کی طرف رکھی اور عوام ہی سے ربط پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہے۔ چنانچہ قیصرِ روم نے بھی جب ابو سفیانؓ سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] قیصر کو جب نامہ مبارک ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص اگر یہاں مقیم ہو تو اس کو لاؤ۔ صلح حدیبیہ کا زمانہ تھا قریش اور مسلمانوں کی مصالحت کی وجہ سے شام کی تجارت کی راہیں پر امن تھیں اس لئے بیت المقدس کے قریب ہی "غزہ" میں قریش کے تاجروں کا ایک قافلہ تجارت

(باقی حاشیہ صفحہ ۵۰۳ پر)

کی نبوت کے متعلق چند سوالات کئے تو اس میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ " قیصر اس (نبی) کے پیرو ذی وجاہت ہیں یا غریب عوام " ؟ ابو سفیان نے غریب لوگ ! اور انہی غریبوں سے ربط رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کا خطبہ دینے لگے تو ایک لاکھ چالیس ہزار جانثاران اسلام میدان عرفات میں جمع تھے۔ جو کفر سے اسلام کو قبول کر چکے تھے مگر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اٹھارہ سال کی جان توڑ کوششوں کے باوجود دس کروڑ مسلمانوں میں سے گیارہ بارہ سو سے زیادہ ممبر نہ بنا سکے دیگر ممالک کو اسلام کی دعوت دینا تو میرے خیال میں "جماعت اسلامی" کے پروگرام میں ہی نہ تھا کیونکہ اگر ان کے پروگرام میں امریکہ، روس، چین، جاپان اور دیگر غیر اسلامی ممالک کو دعوت اسلام دینی ہوتا تو وہ کم از کم اس کا اظہار تو کرتے یا اس کے لئے کوئی عملی جدوجہد تو شروع کرتے یا اس کے لئے کوئی تیاری ہی کرتے مگر مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کی تمام توجہ حکومت کی طرف رہی ہے اور ان کی تمام جدوجہد کا محور اقتدار تک ہی محدود رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ "جماعت اسلامی" عوام الناس کو اسلامی قوانین عملاً جاری ہونے پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کر سکی ہے جس کا خود مودودی صاحب کو اعتراف ہے چنانچہ آپ ماہ مئی ۱۹۵۶ء کے "ترجمان القرآن" کے اشارات میں فرماتے ہیں۔ "اگر آپ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۲ سے آگے) کے سلسلہ میں مقیم تھا امیر قافلہ ابوسفیان تھے، جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، قیصر کے قاصد غزہ پہنچے اور قافلہ والوں کو جا کر لے آئے۔

تجدید الاسلام ۵۰۲

صدا لگائیں کہ کون یہاں اسلامی نظام چاہتا ہے تو ایک منتشر قلیل کو چھوڑ کر
کر ساری قوم پکار اٹھے گی کہ ہم ہیں اس کے طالب ہیں۔ لیکن اگر آپ پوچھیں کہ
کون اس کے لیے عملاً کچھ کرنے پر آمادہ ہے تو ساری بھیڑ چھٹ جائے گی اور مشکل سے
سو میں سے پانچ دس آدمی آگے بڑھ کر اس کی حامی بھر سکیں گے۔ پھر ان دعوے
کرنے والوں کا بھی اگر آپ استعداد کے لحاظ سے جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ بیشتر
لوگ ان کم سے کم بنیادی اوصاف سے بھی خالی ہیں جن کا ہونا اس کام کے لیے
ناگزیر ہے"

اگر ایک فعال، منظم اور صالح ترین اور ایک ہمہ گیر اسلامی انقلاب
برپا کرنے کا دعویٰ رکھنے والی جماعت کے ہوتے ہوئے ایک اسلامی مملکت کے
عوام الناس کی یہ حالت ہو کہ اگر ان سے پوچھا جائے کہ "کیا آپ لوگ اسلامی
نظام کو رائج کرنے کے لیے عملاً کچھ کرنے پر آمادہ ہیں؟ تو ساری بھیڑ چھٹ
جائے اور مشکل سو میں سے پانچ دس آدمی آگے بڑھ کر اس کی حامی بھریں"
تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس جماعت نے عوام الناس کی اخلاقی اصلاح کے
لیے عملاً کوئی کام نہیں کیا۔ اور وہ عوام سے کسی قسم کا رابطہ قائم کرنے میں ناکام
رہی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ "جماعت اسلامی" ایک خالص اسلامی جماعت ہونے
کے باوجود تا حال ناکام ہے۔ اور نہ صرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ ہی اس تحریک
کے خلاف ہے۔ بلکہ اکثر پیران عظام اور علمائے کرام بھی اس جماعت کے خلاف ہیں
اور جو لوگ اس کے ساتھ منسلک ہیں ان کے متعلق محمد سرور صاحب نے اپنی
کتاب "مولانا مودودی کی تحریک اسلامی" میں خوب لکھا ہے۔ وہ لکھتے

ہیں کہ "جماعت اسلامی کی تشکیل میں ایک تو کانگریس کی سیکولر پالیسی سے ناراض
اور مایوس ہو کر اس کو چھوڑنے والا یہ عنصر موثر ہوا۔ دوسرے اس میں
علماء اور مولویوں کا وہ عنصر بھی پیش پیش ہے جو خلوص دل سے اسلام کا احیاء
چاہتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ نظام اسلامی کے متعلق مولانا مودودی کے جو
روحانی تصورات ہیں وہی مسلمانوں اور دنیا کی نجات انہی میں ہے۔
مولویوں کا یہ طبقہ اپنے معتقدات میں بڑا مخلص ہے اور مولانا
مودودی کو صحیح معنوں میں اپنا امام سمجھتا ہے۔ تیسرا عنصر جس کی تعداد کچھ کم
نہیں ایسے حضرات کا ہے جو زیادہ مذہبی تو نہیں لیکن طبیعت کے نیک
اور اخلاقیات کو ذرا ذرا سی بات میں احتیاط کرنے والے ہیں۔۔۔۔۔۔
اس عنصر میں زیادہ تعداد تاجروں، سرکاری ملازموں اور نوجوان طالب علموں کی
ہے۔ اور چوتھا عنصر کا نام سیاستدانوں اور معزول شدہ سیاسی اقتدار کا ہے۔
جماعت "سیاسی مینجمنٹ" میں یا تو اپنے ٹوٹے ہوئے دلوں کو تسلی دیتے یا کسی نہ کسی طرح
اپنی سیاسی مرادیں برلانے کے لیے وقتاً فوقتاً جماعت اسلامی کا سہارا ڈھونڈتا
ہے اور اس کے لیے وہ اس سے زبانی ہمدردی کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ ناظم الدین وزارت
کی برطرفی کے بعد ان کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی۔ جماعت اسلامی کے حامیوں کی سب
سے بڑی تعداد عوام کی ہے جو جلسوں اور امیر جماعت اسلامی کے استقبالیہ جلوس میں
ہزاروں کی تعداد میں شامل ہوتی ہے۔ ان عوام کی یہ چیز مروجہ رونق سے خوش نہیں
اور اپنی ہر تکلیف کا ذمہ دار حکومت کو سمجھتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہر چیز
کو اگرچہ مساجد میں دیانت، امانت، راست گفتاری اور راست کرداری الغرض

اسلامی اخلاق پر خطبے اور وعظ سنتی ہے اور "نیک" بننے اور حکومت کو "نیک" بنانے کے جذبات رکھتی ہے"!

میرے نزدیک ان مخلص اور نیک لوگوں کا جماعت اسلامی سے منسلک رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے سامنے جماعت اسلامی کے سوا کوئی اور صالح تر ین اور فعال جماعت موجود نہیں ۔ ورنہ یہ بھی اسے نصیب نہ ہوتے ۔ لہٰذا میرے نزدیک "جماعت اسلامی" ایک جزوی تحریک ہے جو نہ تو کلی و ہمہ گیر انقلاب برپا کر سکتی ہے اور نہ ہی منہاج النبوۃ کے مطابق قرون اولیٰ کا اسلام عملی طور پر پیش کر سکتی ہے ۔

جمعیت تجدید الاسلام

غرض جب میں تمام جماعتوں سے مایوس ہوا اور مجھے کوئی بھی ایسی تحریک نظر نہ آئی جو کلی و ہمہ گیر اسلامی انقلاب برپا کرنے اور کامل، مکمل بلکہ اکمل طور پر تجدید اسلام کر کے قرون اولیٰ کا اسلام پورا کا پورا پھر پیش کرنے کی صلاحیت و اہلیت رکھتی ہو یا جو کم از کم کلی و جزوی طور پر اس طرف کو گامزن ہو۔ تو میں نہایت ہی عاجزی اور انکساری کے ساتھ اللہ رب العالمین کی طرف متوجہ ہوا اور استدعا کی کہ اے اللہ تعالیٰ تیری تعریفوں میں سے ایک صفت الصمد بھی ہے جس کا مطلب ہے بے نیاز جو کسی کا محتاج نہیں ۔ بس تو تو کسی علامہ کے علم کا محتاج نہیں ! کسی لیڈر کی لیڈری کا محتاج نہیں، کسی دولت مند کی دولت کا محتاج نہیں ۔ کسی نواب، سردار کی قومیت کا محتاج نہیں ! اگر تو آذر کے بیٹے کو ابراہیم خلیل اللہ بنا کر اعلاء کلمۃ الحق کا کام لے سکتا ہے تو کیا

نذر محمد[1] کے بیٹے کو وہ صلاحیتیں ودیعت نہیں کر سکتا جو احیائے اسلام کے لئے ضروری ہیں۔
تو نے ہی تو فرمایا ہے۔ قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء و تعز من تشاء و تذل من تشاء ط بیدک الخیر ط انک علی کل شیء قدیر ہ

"کہہ دیجئے کہ اے اللہ تعالیٰ مالک تمام ملک کے آپ، ملک جس کو چاہیں دے دیتے ہیں۔ جس سے چاہیں ملک لے لیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں غالب کر دیتے ہیں۔ اور جس کو آپ چاہیں پست کر دیتے ہیں آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔"

تو کیا تو مجھے اس قابل نہیں بنا سکتا، کہ میں خود ہی مومنین الصالحین کی ایک ایسی جماعت بنا لوں۔ جو اپنے اعمال حقہ سے لوگوں کے قلوب ...... میں انقلاب برپا کر کے ان کی زندگیوں کو بدل دے وہ پہلے اپنے اندر کلی ذہنی انقلاب پیدا کر لے اور پھر اس زندگی کی طرف دوسروں کو دعوت دے کر صحیح معنوں میں تجدید اسلام کر کے قرون اولیٰ کا عملی اور شعوری اسلام پھر دنیا کے سامنے پیش کر دے

چنانچہ انہی خیالات کے تحت میں نے دوستوں سے کہنا بھی شروع کر دیا کہ میں ایک ایسی بین الاقوامی تحریک پیش کر رہا ہوں۔ جو تمام جماعتوں، فرقوں اور گروہوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر اتحاد اسلامی کا ایک عظیم الشان عملی

---

[1] مصنف کے والد صاحب کا نام نذر محمد ہے۔

صورت قائم کردے گی۔ کوئی شیعہ، سنی، وہابی، وغیرہ نہ رہے گا۔ تمام مسلمان ذرقے قرون اولیٰ کے اسلام میں مدغم ہو جائیں گے۔ اس وقت میں بلوچستان ایڈمنسٹریشن کی طرف سے ٹرائیبل پیٹی آرگنائزیشن پشاور میں بحیثیت ریسرچ اسسٹنٹ کے ملازم تھا۔ دفتر میں تمام اہل کار میرے ارد گرد جمع رہتے تھے اور مجھ سے میری تحریک کے متعلق سوالات کرتے رہتے۔ بعض لوگ میرا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اور بعض لوگ میری باتیں سن کر یہ خیال کرتے کہ شاید اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ایک ریسرچ اسسٹنٹ دیکھو اور اتنی عظیم الشان بین الاقوامی تحریک کا پیش کرنا دیکھو۔ پھر جب میں ان کو کچھ بشارتیں سناتا جو مجھ کو رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے ملتی تو پھر یہ لوگ خاموش ہو جاتے۔ کچھ عرصہ کے بعد بلوچستان گورنمنٹ نے مجھے واپس کوئٹہ بلا لیا۔

چنانچہ ۲۴ اگست ۱۹۵۳ء کو میں پشاور سے کوئٹہ روانہ ہوا اور یہاں آ کر ایک دو ماہ کے بعد ملازمت بھی ختم ہو گئی۔ پھر میں نے کتابوں کی چھوٹی سی دکان کھولی جو سرمایہ کی کمی کے باعث آخر چھوڑنی پڑی۔ اور اسی اقتصادی بدحالی کے باعث تحریک کے شروع کرنے کے قابل بھی نہ رہ سکا۔ مگر کچھ خوابوں کی بشارتوں کے باعث اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے ارادوں میں استقامت عطا کی اور اسی خیال پر قائم رکھا کہ تحریک خواہ مخواہ پیش کرنی ہے البتہ اب میرا یہ خیال پختہ ہو گیا کہ جب تک تحریک کے تمام اغراض و مقاصد مبسوط مضامین کی صورت میں کتابی شکل میں دنیا کے سامنے پیش نہ کر دوں تب تک تحریک شروع نہ کروں۔ اور اس طرح ایک طرف تو اللہ

تعالیٰ نے مجھے یہ فرض ادا کرنے تک پہنچا دیا۔ جو مسلمانوں کے حق میں فتح و ظفر کا سال ہے تاکہ اس تحریک کے ذریعے اسلام کا آفتاب بلند ہو کر دنیا کے ظلمت کدہ کو ایک دفعہ پھر اپنے نور سے منور کرے۔ اور دوسری طرف مجھے اس قابل بنا دیا کہ تمام اغراض و مقاصد کو مکمل کر سکوں جنہیں اس تحریری طور پر مقاصد اور حق و باطل میں تمیز کرنے والے انصاف پسند لوگوں کو حق کی طرف بلا سکوں۔ یعنی چونتیس چار سال کی شب و روز کی محنت و کاوش کے بعد میں نے مکمل تجدید اسلام اور کلی و ہمہ گیر اسلامی انقلاب برپا کرنے کے اغراض و مقاصد ایک مبسوط کتاب کی شکل میں تیار کر لئے ہیں جو "جمعیت تجدید الاسلام کا منشور" کے نام سے چھپ کر عنقریب آپ حضرات کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

تحریک کا نام، نصب العین اور اغراض و مقاصد کی اجمالی صورت

(ا) تحریک کا نام :- جمعیت تجدید الاسلام

(ب) نصب العین :- اتحاد و ترقی عالم، یعنی روئے زمین کے انسانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنا اور انسانیت کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہنا۔

(ج) اغراض و مقاصد :-

۱۔ اتحاد اسلامی :- مسلمانان عالم کو مذہبی اور سیاسی لحاظ سے ایک

پلیٹ فارم پر جمع کر کے عظیم الشان اسلامی بلاک کا قائم کرنا۔
۲۔ دعوت و تبلیغ اسلام :۔ غیر اسلامی ادیان پر اظہار دینِ حق کرنا اور اسلام کی دعوت کو غیر مسلموں تک پہنچانا۔
۳۔ ذہنی انقلاب :۔ شرکِ جلی اور شرکِ خفی کی حقیقت کو آشکارا کر کے مسلمانوں کو "موحد" بنانے کی جدوجہد کرنا۔
۴۔ روحانی انقلاب :۔ بے سند پیری مریدی کو ختم کر کے حقانی پیروں کو دعوت و تبلیغ اسلام اور اصلاح عالم کے عظیم کام پر لگانا۔
۵۔ علم اور اُس کا معیار :۔ موجودہ تعلیمی نظام کو بدل کر علمِ فطرت اور علم شریعت کے اصولوں پر علم کا صحیح معیار قائم کرنا۔
۶۔ احسان و خدمتِ خلق :۔ احسان و خدمت خلق کے اصولوں کے تحت تسخیر کائنات میں کوشاں رہنا۔
۷۔ آنے والی نسلوں کا لائحہ عمل :۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کو اسلامی اصولوں کے مطابق اپنا فرض سمجھنا۔
۸۔ عورت کی آزادی اور اصلاح :۔ عورت کو شریعتِ اسلامی کے مطابق حقوق نسواں دلا کر درکِ اسفل کے قید خانے سے آزادی دلانا اور حد سے بڑھی ہوئی عورتوں کی اصلاح کے لئے جدوجہد کرنا۔
۹۔ بلند اخلاق :۔ بچوں، عورتوں اور مردوں میں اخلاقِ حمیدہ پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہنا۔
۱۰۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر :۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے

بین الاقوامی اصولوں کے تحت گونداں رہنا۔

۱۱۔ اتباعِ رسولؐ :۔ اتباعِ رسولؐ اور اسوۂ رسولؐ کو قرآن و سنت کے مطابق عملی جامہ پہنانا۔

۱۲۔ قرآن کو عملی طور پر پڑھانا :۔ قرآن پر عمل کرنے اور قرآن کو عملی طور پر پڑھانے کے لئے ہر ممکن ذرائع اختیار کرنا۔

۱۳۔ اقامتِ دین :۔ اسلامی شریعت کے مطابق نظامِ حیات کا مرتب کرنا

۱۴۔ جہاد فی سبیل اللہ :۔
جہاد فی سبیل اللہ کے لئے مسلمانوں کو تیار کرنا۔ جہاد کا ولولہ ہر مسلمان کے دل میں پیدا کرنا اور جہاد کے جذبہ کے تحت ہر وہ ممکن جدوجہد کرنا جو کسی مجاہد کو کرنا چاہیئے۔

۱۵۔ اسلامی معاشی انقلاب :۔
کمیونزم اور سرمایہ داری کو ختم کرنے کی خاطر اسلامی معاشی انقلاب کو اسلامی اصولوں کے تحت برپا کرنا۔

منافقت کا خاتمہ :۔
۱۶۔ مسلمانوں کے دلوں سے منافقت کو مٹانے کی خاطر ان کو ہر اُس عمل سے باز رکھنے کی کوشش کرنا جس سے نفاق پھیلنے کا خطرہ ہو۔

اطاعتِ امیر :۔
۱۷۔ مسلمانوں میں اطاعتِ امیر کا جذبہ پیدا کرنا۔

۱۸۔ اسلامی جمہوریت کا قیام :۔
مغربی جمہوریت کے ان تمام اصولوں کو ختم کرنا جن کی قرآن و سنت میں کوئی دلیل نہ ہو اور ان کی جگہ اسلامی شورائی اور اسلامی اصولوں کے مطابق ایسے جمہوری اصول مرتب کرنا جن کے ذریعے اسلامی جمہوریت کا قیام عمل میں آ سکے۔

۱۹۔ حکومتِ الٰہیہ کا قیام :۔
خلافت اور امامت کے تمام جھگڑوں کو ختم کر کے ظاہری و باطنی طور پر

خلافت راشدہ اور امامت علی کو تسلیم کرنا۔

۲۰۔ سلطنت کی نفی
تمام شیطانی طاقتوں کے خلاف علم جہاد بلند کر کے عالم انسانیت کو شیطان کی ساحری سے نجات دلانا۔

نوٹ:۔ مزید تجدید کے اغراض و مقاصد پر مفصل بحث اس کتاب کے حصہ دوم یعنی "جمعیت تجدید الاسلام کا منشور" میں کی گئی ہے جو عنقریب آپ حضرات کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔ بے صبری سے انتظار فرمائیے۔ اور دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں راہ ہدایت پر رکھے اور ہر لغزش سے اپنی رحمت کی آغوش میں محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت، ہدایت اور نصرت ہمارے ساتھ ہو۔ آمین۔

دین محمد افغانی، قائم جمعیت تجدید الاسلام

کوئٹہ بلوچستان (مغربی پاکستان)

۷۔ ۱
مطل
۸۔ عورت
نسوا
ہو
۹۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی
الا باللہ۔ لا الٰہ الا ھو علیہ توکلت والیہ انیب

تجدید الاسلام

(مصنّفہ)

دین محمد افغانی
ناظم جمعیت تجدید الاسلام

۱۹۵۶ء مطابق ۱۳۷۵-۷۶ھ

قیمت [illegible]　　　　بار اول　　　　۱۰۰۰